سِوکس

بارہویں جماعت کے لیے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

بارہویں جماعت کے لیے
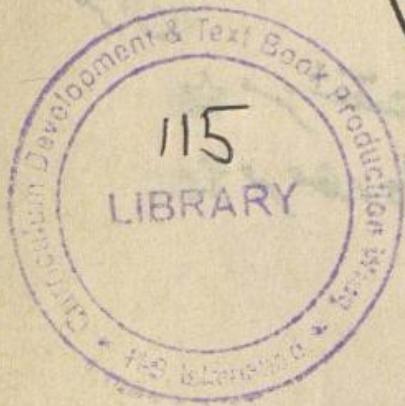
ناشر : زرقا بک ڈپو' اردو بازار' لاہور

برائے : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

تیار کردہ۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

منظور کردہ وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان۔ اسلام آباد

مصنّفین

☆ پروفیسر محمد فاروق ملک

☆ پروفیسر غزالہ بشیر

ایڈیٹرز

☆ مسز شفقت افتخار

☆ مہر صفدر ولید صفدر

نگران

☆ مسز شفقت افتخار

☆ مہر صفدر ولید صفدر

فنی معاونت و پراسیسنگ : پرفیکٹا کمپیوٹر کمپوزنگ سروس، لاہور

ناشر: زرقا بک ڈپو، اردو بازار، لاہور

مطبع: اشرف پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

باب اول

تحریک پاکستان

(Pakistan Movement)

سر سید احمد خاں (Sir Syed Ahmad Khan) : تاریخ پر بعض شخصیات اتنے گہرے نقوش چھوڑتی ہیں کہ آنے والی نسلیں ان کے کارناموں کو نظرانداز نہیں کر سکتیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت سر سید احمد خاں بھی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو روشنی کی کرن دکھائی اور اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے قابل بنایا۔

سر سید احمد خان 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد سید محمد تقی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ملازمت کرنے کی بجائے خاموشی سے گزارا۔ آپ کے دادا خاندان مغلیہ کے دور میں ملازمت کرتے تھے جبکہ نانا ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرتے تھے اپنے والد کی وفات کے بعد آپ نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کر لی۔ آپ 1839ء میں کمشنر کے دفتر میں بطور نائب منشی تعینات کیے گئے۔ دو سال تک آگرہ میں رہے۔ اپنی قابلیت کی وجہ سے 1846ء میں دہلی میں ماتحت جج مقرر ہوئے اور ملازمت کے سلسلے میں بجنور، مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں مقیم رہے۔ آپ نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور علم کو فروغ دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ 1857ء میں جب جنگ آزادی شروع ہوئی تو سر سید احمد خاں بجنور میں تھے۔ آپ نے انگریز عورتوں، بچوں اور مردوں کی جانیں محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بچائیں۔ جنگ آزادی کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے سر سید احمد خاں کو انعام کی پیشکش کی لیکن آپ نے صاف انکار کر دیا کیونکہ آپ مسلمانوں سے چھینی گئی جائیداد نہیں لینا چاہتے تھے۔ آپ نے واضح کر دیا کہ انعام کی خاطر انہوں نے انگریزوں کی مدد نہیں کی تھی۔ سر سید احمد خاں نے اپنی ساری زندگی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، مذہبی حقوق کے تحفظ کے لیے وقف کر دی اور 27 مارچ 1898ء کو انتقال فرما گئے۔

انگریزوں نے جنگ آزادی کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی تھی۔ اس لیے

انہوں نے مسلمانوں کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ترغیب دی۔ آپ دونوں قوموں کے درمیان نفرت کی دیوار مسمار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی تاکہ وہ اپنی زندگیوں کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھال سکیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔ بعض مسلمانوں نے سر سید احمد خاں کو انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا لیکن بعد میں حالات نے ان کی مخلصی ثابت کر دی۔ سر سید احمد خاں نے ایک طرف مسلمانوں کو انگریزوں سے دوستی کی ترغیب دی اور دوسری طرف انگریزوں کے ذہن سے غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے آپ نے 1858ء میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا جس میں آپ نے واضح کیا کہ یہ جنگ نہ تو جہاد تھی اور نہ ہی دہلی میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش تھی بلکہ یہ تو ناانصافیوں کا نتیجہ تھی کیونکہ حکومت اپنے رویے کی وجہ سے عوام کا اعتماد کھو چکی تھی حکومت نے 1837ء میں قحط کے دوران یتیم بچوں کو عیسائی اداروں میں بھیج دیا۔ جس سے لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ انہیں عیسائی بنانے کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ دوسری طرف غیر مذہبی قوانین نافذ کیے گئے۔ حکومت کا عوام کے ساتھ رابطہ نہیں تھا اس وجہ سے حکومت عوام کی ضروریات اور مسائل سے بے خبر تھی اور نہ ہی عوام کو حکومت کی پالیسیوں کا علم تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں کو کمتر سمجھا جاتا تھا اور ہندوستان میں فوجیوں کے مذہبی احساسات کا خیال نہیں رکھا گیا۔ برطانوی حکومت نے ان وجوہات کا جائزہ لیا اور ان کو دور کرنے کی کوشش کی اور ہندوستانیوں کو قانونی کونسل میں 1861ء میں نمائندگی دے دی گئی۔

سر سید احمد خاں نے 1859ء میں مراد آباد اور 1862ء میں غازی پور میں سکول کھولے تاکہ مسلمان بچے تعلیم حاصل کر سکیں۔ غازی پور میں 1863ء میں انہوں نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی بھی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ برصغیر کے رہنے والے انگریزی علوم کو سمجھ سکیں۔ اس کے بعد سر سید احمد خاں علی گڑھ منتقل ہو گئے اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز ان کے انتقال تک علی گڑھ ہی رہا۔

تحریک علی گڑھ (Aligarh Movement)

تحریک علی گڑھ دراصل سر سید احمد خاں کی سعی مسلسل اور جدوجہد کا نام ہے جو انہوں نے مسلمانوں کو متحرک کرنے کے لیے کی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے لیے تعلیمی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی اور علمی و ادبی خدمات سرانجام دیں۔ اس طرح سر سید احمد خاں اور

تحریک علی گڑھ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

تعلیمی خدمات: سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارے کھولے تاکہ مسلمانوں کے لیے ترقی کے نئے راستے کھل سکیں۔ مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے فارسی کی جگہ انگریزی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ ہندوؤں نے تو تعلیم حاصل کر کے نوکریاں حاصل کر لیں لیکن مسلمان خوف کی وجہ سے پیچھے رہ گئے۔ سر سید احمد خاں نے کہا یہ سمجھنا کہ انگریزی تعلیم ہمیں مذہب سے بے بہرہ کر دے گی بالکل غلط ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں انگریزی زبان اور مغربی علوم سیکھنے سے منع نہیں کرتا لہٰذا انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی حرج نہیں جہاں انہوں نے انگریزی زبان سیکھنے پر زور دیا وہاں اردو زبان کو بھی نظرانداز نہیں کیا بلکہ اس پر بھی بھرپور توجہ دی۔ آپ نے سائنٹیفک سوسائٹی کو بھی علی گڑھ منتقل کر لیا۔ سر سید احمد خاں نے "کمیٹی خواستگار ترقی مسلمانان" قائم کی جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ سرکاری کالجوں اور سکولوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد کم کیوں ہے اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے میں وہ کیوں پیچھے رہ گئے ہیں تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کا اپنا تعلیمی ادارہ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے محمڈن کالج فنڈ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مئی 1875ء میں علی گڑھ میں "محمڈن اینگلو اورینٹل" ہائی سکول قائم کر دیا گیا دو سال بعد سکول کا درجہ بڑھا کر کالج بنا دیا گیا تھوڑے ہی عرصہ میں یہ [illegible] مسلمانوں کی اہم درس گاہ بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں پر جدید اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کی رہائش کا بھی انتظام تھا۔ سر سید احمد خاں کی خواہش تھی کہ اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا جائے لیکن ان کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا آپ کی وفات کے بائیس سال بعد 1920ء میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ اسی یونیورسٹی نے "تحریک پاکستان میں بڑا اہم کردار ادا کیا مسلمانان ہند کی تقریباً" تمام نامور شخصیات کا تعلق اسی یونیورسٹی سے تھا۔ سر سید احمد خاں نے یہ محسوس کیا کہ اگر علی گڑھ کالج یونیورسٹی بن جائے تو بھی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیے جس کے ذریعے علی گڑھ کا پیغام ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ جائے۔ اس کے لیے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی اس کے اجلاس ہر سال مختلف شہروں میں منعقد کیے جاتے اور ان میں مسلمانوں کے تعلیمی اور دیگر مسائل پر بحث کر کے ان کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

معاشرتی خدمات: سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کرنے کے لیے متعدد کتابیں اور رسائل لکھے۔ آپ نے 1870ء میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، جس میں مسلمانوں کو متحرک اور فعال بنانے کے لیے آداب اور اصول بتائے۔ آپ نے مراد آباد میں یتیم خانہ بھی قائم کیا۔ سر سید احمد خاں مسلمانوں کو معاشرتی طور پر بھی انگریزوں کے قریب کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو رہنے سہنے کے نئے انداز سکھائے۔ کوٹ، پتلون، جدید طرز کے مکانات اور کھانے میں چھری کانٹے کا رواج قائم کیا۔ یہ سب کچھ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان فاصلے کو کم کرنے کے لیے کیا گیا۔ سر سید احمد خاں نے "لائل محمڈن آف انڈیا" کے نام سے پمفلٹ شائع کیے ان میں ذکر کیا گیا کہ مسلمانوں نے انگریزوں کی جانیں بچانے کے لیے کیا کچھ کیا۔ اس لیے انگریزوں کو مسلمانوں کے اس پہلو کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے اور مسلم دشمنی ترک کر دینی چاہیے۔

مذہبی خدمات: علی گڑھ کی تحریک نے مذہب کو نظرانداز نہیں کیا بلکہ اس پر بھرپور توجہ دی اور بدعتوں کی نفی کی۔ سر سید احمد خاں نے قرآن پاک کی تفسیر شائع کی۔ جس میں قرآنی آیات کو عقلی اور سائنسی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوشش کی جسے علمائے کرام نے ناپسند کیا۔ سر سید احمد خاں نے بائبل پر "تبیین الکلام" کے نام سے کتاب لکھی اور اس کتاب میں ان باتوں پر زور دیا جو اسلام اور عیسائیت میں مشترک ہیں۔ اس کے علاوہ سر سید احمد خاں نے انگریزوں کے دلوں سے غلط فہمی دور کرنے کے لیے ایک مضمون "تحقیق لفظ نصاریٰ" لکھا۔ انگریز سمجھتے تھے کہ مسلمان حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش نصارتھ کو بگاڑ کر نصاریٰ کہتے ہیں گو کہ یہ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ سر سید احمد خاں نے واضح کیا کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں بلکہ لفظ نصاریٰ عربی زبان کے لفظ ناصر سے لیا گیا ہے جس کے معنی دوست یا مددگار کے ہیں۔ آپ نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام نے عیسائیوں کے ساتھ دوستی اور کھانا پینا منع نہیں کیا بشرطیکہ شراب اور حرام چیزیں شامل نہ ہوں۔ اس کے لیے آپ نے ایک کتابچہ "احکام طعام اہل کتاب" کے نام سے شائع کیا۔ اس کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں اور انگریزوں کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ ان کتابوں اور پمفلٹوں کی اشاعت کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ ہر صورت انگریزوں کا احترام کرتے تھے اور اسلامی اصولوں کو نظرانداز کرنا چاہتے تھے بلکہ آپ تو مذہب کے معاملے میں حق بات پر ڈٹ جاتے تھے۔ ایک انگریز ولیم میور نے ایک کتاب "دی لائف آف محمدؐ" لکھی جس میں رسول پاک صلی

اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات طیبہ کے بارے میں نازیبا کلمات تحریر کیے- سرسید احمد خاں یہ برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے ایک کتاب "خطبات احمدیہ" لکھ کر ان کلمات کو غلط اور بے معنی قرار دیا-

سیاسی خدمات: 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو بغاوت کا اصل مجرم قرار دے کر برطانوی حکومت سزا دینا چاہتی تھی لیکن سرسید احمد خاں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ اس بغاوت کے ہندو مسلم اور انگریز برابر کے ذمہ دار ہیں- دوسری طرف مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ فی الحال سیاست سے پرہیز کریں کیونکہ مسلمان تعلیم میں بھی پیچھے ہیں اور انگریز بھی انہیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں- 1867ء میں بنارس میں ہندوؤں نے اردو زبان کے خلاف تحریک شروع کر دی اور مطالبہ کیا کہ اردو کی جگہ ہندی دفتری زبان ہونی چاہیے- سرسید احمد خاں جو ہندو مسلم دونوں کے لیے کام کر رہے تھے وہ صرف مسلمانوں کے مفاد کے لیے کام کرنے پر مجبور ہو گئے- اس سے پہلے آپ ہندوستان کو دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے- جس میں ایک آنکھ مسلمانوں کی نمائندہ اور دوسری ہندوؤں کی نمائندہ تھی- مگر اب ہندوؤں سے بدظن ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا ساتھ چلنا ممکن نہیں رہا- سرسید احمد خاں نے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے اخبار نکالا اس اخبار کی خوبی یہ تھی کہ اس کا ایک کالم اردو اور دوسرا انگریزی میں ہوتا تھا- اس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانیوں کے خیالات اور مسائل سے آگاہ کرنا تھا اور دوسری طرف ہندوستانیوں کو انگریزوں کے حالات سے واقف کرو تھا- اس گزٹ کی وجہ سے مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا- سرسید احمد خاں کہا کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں ہیں- دونوں کے نظریات اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا مکمل مل کر رہنا ممکن نہیں ہے- سرسید احمد خاں نے یہ بھی واضح کیا کہ برطانوی پارلیمانی نظام ہندوستان میں کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں پر ایک قوم آباد نہیں ہے- اگر جداگانہ طریقہ انتخاب پر عمل کر بھی لیا جائے تو مسلمان خاطر خواہ نمائندگی حاصل نہیں کر سکیں گے- اس طرح ملازمتوں میں مقابلے کے امتحان کے ذریعے مسلمان ملازمت حاصل نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہ تعلیم میں ابھی بہت پیچھے ہیں- لہٰذا مسلمانوں کے لیے ملازمتوں میں کوٹہ مقرر کیا جائے تاکہ مسلمان بھی سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکیں-

علمی و ادبی خدمات: سرسید احمد خاں نے اردو زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے

بہت کام کیا۔ ہندی، اردو جھگڑے نے یہ واضح کر دیا کہ ہندو مسلمانوں کے تہذیبی، تمدنی اور ادبی ورثے کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ سر سید احمد خاں نے اردو ڈیفنس سوسائٹی بھی قائم کی اور اردو زبان کا دفاع کیا۔ علی گڑھ کی کوششوں کی وجہ سے ہندی سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہ کر سکی سرسید احمد خاں نے ایک کتاب "تاریخ سرکشی بجنور" بھی لکھی جس میں جنگ آزادی کے حالات اور واقعات بیان کیے۔ "آثار الصنادید" سر سید کی بڑی مشہور کتاب تھی جس میں پرانی عمارتوں، کھنڈروں اور تاریخی آثار کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔ اس کتاب کی ایک کاپی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں پیش کی جس کی وجہ سے سر سید احمد خاں کو اعزازی فیلو شپ دے دی گئی۔ اس کے علاوہ آپ نے قرآن پاک کی تفسیر، خطبات احمدیہ، تبیین الکلام، رسالہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، احکام طعام اہل کتاب اور بہت سارے مضامین تحریر کیے۔

تحریک علی گڑھ کے اثرات: تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کو موجودہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کا ڈھنگ سکھایا، تحریک نے زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

1- انگریز مسلم مفاہمت: تحریک علی گڑھ کی وجہ سے انگریزوں کے دلوں سے مسلمانوں کے لیے نفرت کے جذبات کم ہونا شروع ہوئے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا شروع کیا۔

2- حقوق کا تحفظ: تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کا شعور اجاگر کیا۔ سر سید احمد خاں نے اپنی ساری زندگی مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالت کو سنوارنے میں گزار دی۔ علی گڑھ کالج مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ اس کے تعلیم یافتہ نوجوان حکومت کے سامنے عوام کے مسائل پیش کرتے اور حکومت ہمدردانہ غور کرتی۔ 1906ء میں شملہ وفد کے ذریعے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا گیا جو منظور کر لیا گیا۔

3- سیاسی قیادت کی فراہمی: تحریک علی گڑھ کے ذریعے مسلمانوں نے تعلیم حاصل کی اور اپنے آپ کو اس قابل بنایا کہ ہندوؤں اور انگریزوں کا مقابلہ کر سکیں۔ مسلم لیگ بھی علی گڑھ کے پڑھے ہوئے طالب علموں نے قائم کی۔ اس کے بعد تحریک خلافت بھی انہوں نے ہی چلائی۔ تحریک پاکستان میں جو تعلیم یافتہ سیاسی قیادت میسر آئی وہ بھی تحریک علی گڑھ

کی مرہون منت تھی۔ عوام میں سیاسی شعور بھی تحریک علی گڑھ نے اجاگر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کی جدوجہد کا آغاز اسی تحریک سے ہوا۔

4- **الگ قوم کا تصور:** تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں ان کا اپنا تابناک ماضی ہے اور واضح کیا کہ ہندو اور مسلمان دو ایسی قومیں ہیں جن کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ہندو، مسلمانوں کے خیرخواہ نہیں۔ اسی دو قومی نظریے کو علامہ اقبال اور قائداعظمؒ نے تحریک پاکستان کی بنیاد بنایا اور اپنا الگ وطن حاصل کیا۔

5- **مغربی تعلیم کا حصول:** مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے اور اس کے بغیر مسلمان ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ تمام جدید اور سائنسی تعلیم کا ذخیرہ انگریزی زبان میں موجود تھا۔ اس لیے انگریزی زبان سیکھنا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کالج میں مغربی علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا اور اس طرح مسلمانوں کی بڑی تعداد تعلیم حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ علی گڑھ تحریک نے دوسرے صاحب ثروت لوگوں سے بھی اپیل کی کہ وہ بھی تعلیمی ادارے کھولیں۔ اس طرح دوسرے مسلمانوں نے بھی تعلیمی ادارے کھولے اور تھوڑے ہی عرصے میں مسلمان انگریزی اور جدید تعلیم کے میدان میں نمایاں نظر آنے لگے۔

6- **معاشی ترقی:** تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی مالی حالت کو بہتر بنا سکیں۔ سرکاری ملازمتوں میں اپنا حصہ حاصل کر کے مسلمان بھی اعلیٰ ملازمتوں پر فائز نظر آنے لگے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی معاشی حالت پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی۔

7- **مسلم اتحاد:** تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس اجاگر کیا کہ مسلم ملت کیا ہے؟ مسلمان چاہے دنیا کے کسی بھی کونے میں آباد ہوں وہ مسلم ملت کے رکن ہیں۔ ترکی کے مسلمانوں کے لیے 1919ء میں تحریک خلافت بھی علی گڑھ کالج کے فارغ التحصیل طلبا نے چلائی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندر ایک ہونے کا احساس پیدا کیا۔ اس طرح مختلف علاقوں کے طلبا میں اخوت، یگانگت اور اتحاد کی فضا قائم ہوئی۔

سرسید احمد خاں اور دو قومی نظریہ: سرسید احمد خاں 1867ء تک ہندوؤں اور

مسلمانوں کے اتحاد کے علمبردار تھے۔ دونوں کو ایک قوم سمجھتے تھے اور اس وقت تک انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ دونوں قوموں کے لیے کیا' لیکن اردو ہندی جھگڑے کی شدت نے سر سید احمد خاں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہندو مسلم اتحاد قائم نہیں ہو سکتا' کیونکہ ہندو مسلمانوں کے خیرخواہ نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک متضاد فلسفہ حیات کے پیروکار تھے اور وہ اردو زبان کی آڑ میں مسلمانوں کے قومی وجود اور انفرادیت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے لیے واضح طور پر قوم کا لفظ استعمال کیا اور کہا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ یہ مسلمان اور ہندو ہیں۔ مسلمان اپنی ذات میں ایک الگ قوم ہیں۔ جنہیں خود کو منظم کرنا ہو گا تاکہ وہ اپنے تشخص کی حفاظت کر سکیں۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے تہذیب و تمدن' ثقافت اور اسلام کی وجہ سے دوسری قوموں سے مختلف ہیں اور ان میں کوئی قدر مشترک نہیں یہی وجہ ہے کہ ہزار سال اکٹھے رہنے کے باوجود وہ دوسری قوموں میں مدغم نہیں ہو سکے۔ اسی نظریے کو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے مزید واضح کر کے پاکستان حاصل کیا۔

تقسیم بنگال اور شملہ وفد کے برصغیر کی مسلم سیاست پر اثرات

The Impact of partition of Bengal (1905) and Shimla Deputation on Subsequent Muslim Politics in the Sub-continent

تقسیم بنگال: صوبہ بنگال ہندوستان میں سب سے وسیع و عریض صوبہ تھا جس کی آبادی تقریباً" آٹھ کروڑ تھی اور رقبہ تقریباً" 283500 مربع کلومیٹر تھا اور اس کا انتظام ایک لیفٹننٹ گورنر چلاتا تھا۔ پورے صوبے کا انتظام وہ احسن طریقے سے نہیں چلا سکتا تھا۔ 1899ء میں لارڈ کرزن وائسرائے بن کر ہندوستان آیا اور مشرقی بنگال کا دورہ کیا۔ اس نے لوگوں کے مطالبے پر غور و خوض کرنے کے بعد ان کے ساتھ اتفاق کیا اور 1905ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک مشرقی بنگال جس میں ڈھاکہ' چٹاگانگ' راجشاہی' کھلنا اور کچھ علاقہ آسام کا تھا' جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور دوسرا مغربی بنگال تھا' جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں نے تقسیم کو ناپسند کیا اور اس کے خلاف احتجاج کرنا

شروع کر دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس جو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی اور جس کی بنیاد خود ایک انگریز اے۔او۔ہیوم (A.O.Hume) نے 1885ء میں رکھی تھی نے باقاعدہ منظم تحریک کا آغاز کر دیا اور پورے ہندوستان میں فسادات اور ہنگامے کروائے۔ یہ سب کچھ اس لیے کر رہے تھے کہ مسلمان خوشحال نہ ہو سکیں اور وہ ہندوؤں کے غلام بن کر رہیں، جبکہ مسلمان تقسیم سے بہت خوش تھے اور انہیں ایک نئی زندگی ملی تھی اور انہیں موقع ملا تھا کہ وہ صدیوں سے غصب شدہ حقوق کو واپس لے سکیں۔ تقسیم بنگال پر ہندوؤں نے جس ردعمل کا مظاہرہ کیا اس کے مسلم سیاست پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ برطانوی حکومت نے 1911ء میں ہندوؤں کے احتجاج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور بنگال کی تقسیم کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔

شملہ وفد: 1905ء میں برطانیہ میں عام انتخابات منعقد ہوئے اور لبرل پارٹی برسراقتدار آئی۔ نئی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ وہ ہندوستان میں آئینی اصلاحات نافذ کرنا چاہتی ہے۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹ کے سیکرٹری نواب محسن الملک نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کا ایک وفد تشکیل دیا جائے تاکہ مسلمانوں کے خدشات اور مطالبات حکومت کے سامنے پیش کیے جائیں۔ نواب محسن الملک نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچ بولڈ کے توسط سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا جس کو وائسرائے لارڈ منٹو نے قبول کیا۔ مسلمانوں نے پینتیس (35) ارکان پر مشتمل وفد تیار کیا جس کی قیادت سر آغا خاں کو سونپی گئی یہ وفد یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ میں وائسرائے سے ملا اور اپنے مطالبات اس کے سامنے پیش کیے جو یہ تھے۔

1- مسلمانوں کی تاریخی، سیاسی اور فوجی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں کو منتخب اداروں میں ان کی آبادی سے زیادہ نمائندگی دی جائے۔
2- مسلمانوں اور ہندوؤں کے انتخابی حلقے جدا جدا کروائے جائیں۔
3- سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے سیٹیں مختص کر دی جائیں۔
4- مسلمانوں کو قابلیت کی بنا پر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں جج مقرر کیا جائے۔
5- میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں بھی مسلمانوں کے لیے سیٹیں مخصوص کی جائیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کے سینٹ اور سنڈیکیٹ میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔
6- مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مسلم یونیورسٹی کے قیام میں مدد دی جائے۔
7- مسلمانوں کو وائسرائے کی انتظامی کونسل میں بھی نمائندگی دی جائے۔

وائسرائے لارڈ منٹو نے مطالبات سننے کے بعد مسلمانوں کو یقین دلایا کہ حکومت ان کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کرے گی۔ جس سے مسلمانوں کو بہت خوشی ہوئی' کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے باضابطہ طور پر حکومت سے علیحدہ انتخاب کا مطالبہ کیا اور سرکاری ملازمتوں میں بھی تحفظ مانگا۔

مسلم سیاست پر اثرات

1- مسلم لیگ کا قیام : دراصل تقسیم بنگال اور شملہ وفد کی کامیابی نے مسلمانوں پر بڑے مثبت اثرات مرتب کیے جن میں چند ایک کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ وفد نے مسلمانوں کے اندر ایک نئی امنگ پیدا کی۔ یہ وہ امنگ تھی جس نے اپنی الگ سیاسی جماعت بنانے کا احساس دلایا اور اس طرح مسلمان سیاست میں حصہ لینے کے قابل ہو گئے اور اپنی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ 30 دسمبر 1906ء میں قائم کر لی۔ تقسیم بنگال کے بارے میں ہندوؤں کے احتجاج نے شملہ وفد منظم کرنے کا حوصلہ دیا اور شملہ وفد کی کامیابی نے سیاسی جماعت کی بنیاد رکھنے میں مدد دی جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا اور الگ وطن حاصل کیا۔

2- دو قومی نظریے کو تقویت : دو قومی نظریہ جو سر سید احمد خاں نے پیش کیا تھا اس کے درست ہونے کا ثبوت ان تمام واقعات نے دے دیا کہ ہندو کبھی بھی مسلمانوں کے دوست اور ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ جو تقسیم بنگال اور شملہ وفد کو برداشت نہیں کر سکے وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے دونوں کی خوشیاں اور مفادات جدا جدا ہیں بلکہ وہ اپنے جداگانہ مذہب و عقائد' تہذیب و تمدن میں ایک دوسرے کے متضاد تھے۔

3- جداگانہ انتخاب کا اصول : تقسیم بنگال کے بعد مسلمان ہندوؤں سے بدظن ہو گئے اور اپنی الگ حیثیت منوانے کی کوشش کرنے لگے۔ شملہ وفد میں مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کر دیا اور برطانوی حکومت نے 1909ء میں اپنی منٹو مارلے اصلاحات کے ذریعے یہ مطالبہ مان کر نافذ کر دیا۔ انگریزوں پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ دونوں قوموں کو ایک نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ ہی کانگریس کو مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے کیونکہ دونوں کے درمیان صرف مذہب کا ہی فرق نہیں بلکہ زندگی کی روایات' تاریخ اور تمام اعتقادات کا بھی فرق ہے۔

4- ہندو مسلم تعلقات : تقسیم بنگال اور شملہ وفد کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بے حد خراب ہو گئے' کیونکہ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی مخالفت کے ساتھ ساتھ جداگانہ انتخاب کے اصول کی بھی مخالفت کی۔ اس طرح پہلی دفعہ مسلمان اور ہندو کھلم کھلا ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ ہندوؤں نے نہ صرف مخالفت کی بلکہ اس قسم کے نعرے بنائے جن سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی تھی جس کے نتیجہ میں 1907ء میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔

5- مسلم اتحاد : جب ہندو مسلم اختلافات شروع ہوئے تو مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ غیر محفوظ ہیں ان میں متحد ہونے کا احساس پیدا ہوا اور وہ اپنے تمام ذاتی اختلافات بھلا کر ایک ہو گئے اور ہندوؤں کا مقابلہ کیا۔

6- انگریز مسلم تعلقات : تقسیم بنگال اور شملہ وفد کی وجہ سے انگریز مسلم تعلقات وقتی طور پر کافی بہتر ہوئے کیونکہ انگریزوں نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد شملہ وفد کا جداگانہ انتخاب کا مطالبہ مان کر یہ ثبوت دیا کہ وہ مسلمانوں کے مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں' لیکن بعد میں تقسیم بنگال کی منسوخی سے مسلمان انگریزوں سے بدظن ہو گئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی وجوہات

Factors responsible for the formation of All India Muslim League

30 دسمبر 1906ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نواب وقارالملک کی صدارت میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ جس میں نواب سلیم اللہ خاں کی تجویز پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت تشکیل دی جائے۔ جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا جائے اور اس طرح مسلمانوں کی سیاسی جماعت قائم ہو گئی۔ جس کے اغراض مقاصد یہ بتائے۔

1- مسلم مفادات کا تحفظ : ہندو مسلمانوں کو خوشحال نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے وہ

تقسیم بنگال کی مخالفت کر رہے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ انہیں اپنے مفادات کی حفاظت خود کرنا ہے اور اس کے لیے سیاسی جماعت کا ہونا بہت ضروری تھا اس لیے مسلم لیگ قائم کی گئی۔

2- **سیاسی تنظیم کی ضرورت :** مفادات کے حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان منظم ہوں اور مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے سیاسی جماعت کا ہونا ضروری تھا۔ جبکہ ہندوؤں نے اپنی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس 1885ء میں بنا لی تھی۔ اسی لیے وہ تقسیم بنگال کے خلاف منظم تحریک چلا رہے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں نے بھی اپنی سیاسی تنظیم کی ضرورت محسوس کی۔

3- **تقسیم بنگال پر ردعمل :** بنگال کے رقبے اور آبادی کے پیش نظر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا' لیکن ہندوؤں کی سخت مخالفت اور ہنگامہ آرائی کی وجہ سے یہ نظر آنے لگا کہ شاید برطانوی حکومت اپنا فیصلہ بدل دے ہندوؤں کی حقیقت کھلنے پر مسلمانوں نے الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

4- **شملہ وفد کی کامیابی :** اکتوبر 1906ء میں جب مسلمانوں کا وفد برطانوی حکومت سے ملاقات کر کے آیا تو مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے کیونکہ انگریزوں نے مسلمانوں کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کا یقین دلایا جس سے مسلمانوں کے رہنماؤں نے سوچا کہ ان کی اپنی سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔

5- **انتہا پسندانہ ہندو تحریکیں :** انیسویں صدی کے آخر میں حقیقی ہندو ازم کے احیاء کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں جن کا مقصد مسلمانوں کو ختم کرنا تھا یہ تحریکیں مسلمانوں کے حقوق کے لیے بہت بڑا خطرہ تھیں اس لیے مسلمانوں کو احساس ہونے لگا کہ انہیں اپنی سیاسی جماعت بنانا پڑے گی تاکہ ہندو اور کانگریس ان کے حقوق پامال نہ کر سکیں۔

6- **مذہب کا تحفظ :** مسلمانوں کے مذہب کو بھی ہندوؤں سے خطرہ لاحق تھا۔ عبادت کے وقت تنگ کیا جاتا۔ گائے کا گوشت کھانے پر اعتراض کیا جاتا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا اور اپنی سیاسی جماعت بنا لی۔

7- **مسلم اتحاد :** مسلمانوں کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کے لیے

مسلمانوں کا متحد ہونا بڑا ضروری تھا۔ تاکہ وہ ایک جھنڈے تلے اکٹھے ہو کر ہندوؤں سے ٹکر لیتے اور اپنا نصب العین طے کرتے چنانچہ مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے ایک باقاعدہ سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالنا بہت ضروری ہو گیا۔

مسلم لیگ کے مقاصد: مسلم لیگ مسلمانوں کی پہلی نمائندہ سیاسی جماعت تھی اس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

(i) مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا اور انہیں حکومت کے سامنے پیش کرنا۔

(ii) مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان شکوک و شبہات دور کر کے دوستانہ فضا ہموار کرنا۔

(iii) مندرجہ بالا دونوں مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر دوسری قوموں کے ساتھ تعاون کرنا۔

مسلم لیگ کے قیام سے مسلمانوں کو سیاسی قیادت مل گئی جس کی رہنمائی میں آگے چل کر انہوں نے آزادی کی تحریک چلائی۔ مسلم لیگ قیام پاکستان کی خاطر سرگرم عمل رہی۔ اور ہر موقع پر ہندوؤں اور انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایسے اقدامات کی مخالفت کرتی رہی جو مسلمانوں کے حق میں نہیں تھے اور بالاخر قرارداد پاکستان پاس کرکے ہندوؤں اور انگریزوں پر واضح کر دیا کہ وہ ایک الگ ریاست حاصل کرکے رہیں گے اور بعد میں آنے والے حالات نے ثابت کر دیا کہ ایک الگ ریاست مسلمانوں کا مقصد تھی۔

کانگریس - لیگ تعاون اور لکھنؤ پیکٹ 1916ء

Congress League Reapproachment and Lucknow Pact (1916ء)

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تقسیم بنگال اور شملہ وفد کی وجہ سے تعلقات کافی کشیدہ تھے۔ حالانکہ تقسیم بنگال تو محض انتظامی خرابیوں کو دور کرنے کی وجہ سے کی گئی تھی جس سے اتفاقی طور پر مسلمانوں کو فائدہ پہنچا تھا لیکن ہندوؤں کو مسلمانوں کا فائدہ ایک آنکھ نہ بھایا اور کانگریس نے اس کے خلاف زبردست مہم چلائی بالاخر حکومت کو ہندو دباؤ کے سامنے جھکنا پڑا اور اسے اپنے ہی فیصلے کو ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ مسلم لیگ کو حکومت

کے اس فیصلے سے سخت صدمہ پہنچا دوسری طرف کانگریس جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کی منظوری کی وجہ سے مسلم لیگ سے خوش نہیں تھی اور اس پر تنقید کی جا رہی تھی کہ سیاست نے ایسا رخ بدلا کہ مسلم لیگ اور کانگریس قریب آگئیں- برطانوی حکومت نے مسلم یونیورسٹی کے قیام سے انکار کر دیا اور خاص کر لفظ ''مسلم'' پر اعتراض کیا اور وعدہ کیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی بنانے پر غور کیا جائے گا- 1911ء میں ترکی اور اٹلی میں جنگ شروع ہو گئی اس کے علاوہ روس نے ایران کے کچھ علاقوں پر بمباری کی اور 1912ء میں بلقان کی جنگیں شروع ہو گئیں- مسلمانوں اور انگریزوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو چکی تھی کہ مسجد کانپور کا واقعہ پیش آگیا- اگرچہ یہ جھگڑا طے ہو گیا لیکن اس واقعہ سے پیدا شدہ تلخی برقرار رہی- مسلم لیگ نے سوچا کہ اب ہمیں اپنی پالیسی بدلنی چاہیے اور ایسا لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے جس پر چل کر وہ حقوق کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کو اپنی حیثیت، وقار اور مفادات کا احساس دلوائیں- 1913ء میں قائداعظم مسلم لیگ کے ممبر بن گئے- 1914ء میں پہلی جنگ عظیم بھی شروع ہو گئی- اب ہندو اور مسلم قائدین میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر وہ انگریزوں سے مزید سہولتیں لینا چاہتے ہیں تو انہیں مل کر مطالبات پیش کرنے چاہییں- اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک تاریخ پر اور ایک ہی مقام پر اپنے اجلاس طلب کرنے چاہئیں لہٰذا دسمبر 1915ء کو دونوں جماعتوں نے اپنے اجلاس بمبئی میں طلب کر لیے اور دونوں نے اپنی اپنی قراردادوں میں خود مختار نظام حکومت قائم کرنے کے لیے نظام حکومت میں ضروری تبدیلیوں کا مطالبہ کیا- اس کے لیے دونوں جماعتوں میں صلاح مشورے جاری رہے اور انہوں نے ہندوستان میں دستوری اصلاحات کا ایک منصوبہ تیار کیا- 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے اور دونوں جماعتوں کے درمیان معاہدہ طے پایا جس کو میثاق لکھنؤ یا لکھنؤ پیکٹ کہتے ہیں- اس کے اہم نکات یہ تھے-

1- جداگانہ انتخابات کا اصول مان لیا گیا یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ کانگریس نے باقاعدہ مسلم لیگ کے اس مطالبے کو تسلیم کیا-

2- مرکزی قانون ساز ادارے میں ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہونی چاہئیں-

3- کوئی ایسا بل پاس نہ کیا جائے جس کی متعلقہ قوم کے تین چوتھائی ارکان اس کے خلاف ہوں-

4- کم از کم نصف محکموں میں ہندوستانی وزرا کا تقرر کیا جائے۔

5- ایسے صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں انہیں ان کی آبادی سے دوگنی نمائندگی دی جائے۔

6- مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجالس میں منتخب ارکان 4/5 اور نامزد 1/5 ہونے چاہئیں۔ یہ معاہدہ مسلم لیگ کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے ہندوؤں سے یہ بات منوائی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں لیکن ہندو ایسے کسی کام کو پسند نہیں کر سکتے تھے جس سے مسلمانوں کا فائدہ ہو۔ اس طرح بہت جلد ہی کانگریس کے اندر اس کی مخالفت شروع ہو گئی اور ہندو مسلم اتحاد کی یہ فضا ایک طویل عرصہ کے لیے قائم نہ رہ سکی۔

تحریک خلافت اور اس کی ناکامی کے ہندو مسلم تعلقات پر اثرات

Khilafat Movement and the effects of its failure on Hindu - Muslim relations

عہدہ خلافت کی ابتداء حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بعد ہوئی۔ خلفائے راشدین کے بعد خلافت، بنو امیہ اور بنو عباس سے ہوتی ہوئی ترکی کے عثمانیہ خاندان میں پہنچی۔ ترکی کی اسلامی سلطنت کی سرحدیں بہت وسیع ہو چکی تھیں۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی کی خلافت کو بڑی عقیدت سے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اسلام کا مضبوط قلعہ تھی۔ جنگ عظیم اول کے آغاز کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ برطانیہ ترکی کا حریف تھا جبکہ مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں۔ مسلمانوں نے واضح کر دیا تھا کہ مسلمان اپنے مقدس مقامات کی بے حرمتی برداشت نہیں کریں گے اور ترکی کی خلافت کو نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔ حکومت نے وعدہ کیا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی اور ترکی کی خلافت کو برقرار رکھا جائے گا، لیکن جب اتحادیوں کا پلڑا بھاری ہو گیا تو مسلمان مقدس مقامات کے بارے میں فکر مند ہو گئے اور سیاسی بے چینی پھیلنے لگی۔ 1916ء کے آخر میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ دسمبر 1919ء

تک جیل میں رہے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو سلطنت عثمانیہ کا زیادہ تر حصہ اتحادیوں کے قبضے میں آگیا اور جب صلح نامہ کی شرائط کے لیے بات چیت شروع ہوئی تو خلافت کو محدود کر دیا گیا۔ مسلمانان ہند کو جب پتہ چلا تو انہوں نے شدید غم و غصہ کا اظہار کیا۔ جولائی 1919ء کو بمبئی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی تو جیل میں تھے، جبکہ مولانا عبدالباری، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر ایم اے انصاری، سیٹھ چھٹانی، ممتاز حسین اور ظفرالملک خلافت کی بقاء کے لیے کام کر رہے تھے۔ ہندوؤں نے بھی اس تحریک میں غیر مشروط تعاون کی پیشکش کی۔ ہندوؤں نے 23 مارچ 1919ء میں رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر احتجاج شروع کر رکھا تھا کہ 13 اپریل 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں منعقد جلسے پر جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا حکم دیا جس سے بہت زیادہ ہندوستانی مارے گئے۔ خلافت کمیٹی کے تحت خلافت کانفرنس 23 نومبر 1919ء کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ ہندوؤں کو بھی بلایا گیا، ہندوؤں نے کانفرس میں شرکت کی اور کہا کہ کانفرنس جو بھی فیصلہ کرے گی ہندو اس کی حمایت کریں گے۔ مہاتما گاندھی نے کانفرنس میں شرکت کر کے کانگریس کو مسلمانوں کے قریب کر دیا۔ کانگریس نے خلافت کمیٹی کو اپنی حمایت کا یقین دلایا 3 دسمبر 1919ء کو مولانا شوکت اور مولانا محمد علی جوہر بھی جیل سے رہا ہو گئے اور جیل سے باہر آکر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وفد کی صورت میں برطانوی حکومت کے ساتھ بات چیت کی جائے اور اپنے مطالبات دہرائے جائیں۔ مطالبات مندرجہ ذیل تھے۔

i- ترکی میں خلافت کو برقرار رکھا جائے۔

ii- مقامات مقدسہ کی حفاظت کی جائے۔

iii- ترکی کی حدود وہی رہنے دی جائیں جو جنگ سے پہلے تھیں۔

وفد نے پہلے 19 جنوری 1920ء کو وائسرائے سے بات چیت کی، لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا جس کی وجہ سے 20 مارچ 1920ء کو وفد برطانیہ روانہ ہو گیا۔ لیکن وہاں پر بھی وفد کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مئی 1920ء کو اتحادیوں نے ترکی کی خلافت بحال کرنے کی بجائے ترکی کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیے جس کی وجہ سے خلافت کمیٹی نے تحریک عدم تعاون چلانے کا اعلان کیا۔ مسلمانوں نے اپنے خطابات واپس کر دیے۔ حکومت کے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا۔ پولیس اور فوج سے علیحدگی اور ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ علی گڑھ کالج کے طالب علموں نے بھی بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا اور اپنے اخراجات میں کمی کر کے چندہ اکٹھا کیا۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل نے حکومت کی

گرانٹ کا بائیکاٹ کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے نام سے تعلیمی ادارہ شروع کر دیا۔ حکومت نے اسے خلاف قانون قرار دے کر گرفتاریاں شروع کر دیں۔ گاندھی بھی بھرپور ساتھ دے رہے تھے انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک بھی چلائی۔ علمائے کرام نے فتویٰ دے دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے لہٰذا ہندوستان سے ہجرت کی جائے جس پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان ہجرت کی۔ افغانستان کی حکومت نے مسلمانوں کو اپنے ملک کے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کا کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ اگست 1921ء میں ساحل مالا بار پر موپلا نسل کے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی اور تحریک کا ساتھ دیا، لیکن حکومت نے سختی سے اس بغاوت کو کچل دیا۔ 5 فروری 1922ء میں ایک گاؤں چورا چوری میں ایک تھانے کو احتجاجاً" آگ لگا دی گئی جس میں تقریباً" 21 سپاہی مارے گئے۔ اس واقعہ کو بہانہ بنا کر گاندھی نے تحریک سے علیحدگی کا اعلان کردیا۔ اب ہندوستان میں تحریک کا زور ٹوٹ گیا۔ دوسری طرف مصطفیٰ کمال پاشا کو ترکی کا صدر بنا دیا گیا اور انہوں نے بہت سارے علاقے دشمنوں سے خالی کروا لیے اور 3 مارچ 1924ء کو خلافت ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اب ہندوستان میں تحریک خلافت ختم ہو گئی یہ تحریک گو کہ ناکام ہو گئی لیکن اس سے ہندو مسلم تعلقات جو تحریک خلافت میں اپنے عروج پر تھے، گاندھی کی اچانک علیحدگی کی وجہ سے چکنا چور ہو گئے اور اس کے ساتھ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ متعصب ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کر دیں جس سے ہندو مسلم اتحاد ختم ہو گیا اور اس کے بعد کبھی بھی متحد نہ ہو سکے۔ دراصل یہ اتحاد بھی ظاہری اتحاد تھا۔ دونوں دو مختلف مقاصد کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں مدد دی کیونکہ وسیع پیمانے پر یہ پہلا احتجاج تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو اس سے عملی تجربہ حاصل ہوا۔ اس تحریک کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمان، عوام اور قائدین کے درمیان براہ راست رابطہ قائم ہو گیا، کیونکہ تحریک کی خاطر مسلمانوں کو ملک کے کونے کونے میں جانا پڑا۔ اس تحریک کی وجہ سے مسلم اتحاد قائم ہو گیا اور انہوں نے اپنے داخلی اختلافات بھلا دیے۔ طالب علموں کو بھی سیاست میں شرکت کا موقع ملا جو آگے چل کر تحریک پاکستان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔

1935ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی خودمختاری

(Provincial Autonomy under the Act of 1935)

1919ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات جاری کرتے وقت حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ دس سال بعد مزید اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔ اس غرض کے لیے 1927ء میں حکومت نے مسٹر سائمن کی زیر قیادت ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ دونوں جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنی سفارشات مرتب کیں جو کہ ایک دوسرے کے متضاد تھیں۔ قائداعظمؒ نے 1927ء میں دہلی تجاویز کی صورت میں مصالحتی فارمولا کانگریس کے سامنے رکھا جسے ہندوؤں نے رد کر دیا اور 1928ء میں نہرو رپورٹ پیش کی جس نے مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے بعد قائداعظمؒ نے کہا کہ اب ہمارے راستے جدا جدا ہیں اور 1929ء میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے۔ سائمن کمیشن دونوں کے متضاد مطالبات کی وجہ سے کسی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام ہو گیا۔ ہندوستان کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے برطانوی حکومت نے تین گول میز کانفرنس بلائیں یہ کانفرنسیں 1930ء سے 1932ء تک جاری رہیں اور ناکام رہیں۔ ہندوستان کے مسائل کو حل کرنے کے لیے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے 29 دسمبر 1930ء میں اپنا مشہور خطبہ الہ آباد پیش کیا۔

برطانوی حکومت نے 4 اگست 1932ء میں کمیونل ایوارڈ کے نام سے چند تجاویز پیش کیں جس میں مسلمانوں کے چند مطالبات تسلیم کر لیے گئے جن میں جداگانہ انتخابات کا مطالبہ بھی تھا۔ اس وجہ سے مسلمانوں نے اس ایوارڈ کو منظور کر لیا۔ دوسری طرف کانگریس نے اچھوتوں کو بھی علیحدہ انتخاب کا حق دینے پر اعتراض کیا اور پونا کے مقام پر اچھوتوں کے ساتھ معاہدہ کرکے ان کو اس حق سے دستبردار کروالیا۔

1934ء میں برطانوی حکومت نے قرطاس ابیض شائع کیا اور اس کی سفارشات کی روشنی میں 1935ء کا ایکٹ اگست 1935ء میں پاس ہو گیا اور اس کے تحت ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت نافذ کیا۔ دو ایوانی مقننہ قائم کی۔ مقننہ کے اختیارات کو محدود رکھا گیا۔ صوبائی حکومتوں کو ایک حد تک مرکزی حکومت کے اثر سے آزاد رکھنے کی کوشش کی گئی۔ صوبائی حکومتوں کا سربراہ گورنر تھا جس کا تقرر تاج کے نام سے ایک کمیشن کرتا تھا۔ گورنر اپنی مرضی سے خاص اختیارات استعمال کر سکتا تھا۔ وزرا سے مشورہ لینا ضروری نہیں تھا۔

اس کو وزیراعلیٰ اور اس کی وزارت ختم کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اقلیتوں کا خیال رکھنا بھی اس کے اختیارات میں شامل تھا۔ صوبائی مقننہ کو اس کی فہرست میں شامل تمام امور کے بارے میں قانون سازی کا اختیار حاصل تھا' جس میں امن عامہ' عدالتوں کا نظام' پولیس' جیل خانے' صوبائی سرکاری ملازمتیں' صحت و صفائی وغیرہ کے امور شامل تھے۔ مقننہ کی منظوری کے بعد گورنر کی منظوری لازمی تھی۔ اگرچہ کافی حد تک صوبوں کو خودمختاری دی گئی' لیکن ساتھ پابندیاں لگا کر اس کو محدود کردیا گیا۔ اگر گورنر اور وزیراعلیٰ میں اختلاف نہ ہو تو ٹھیک کام ہو سکتا تھا' لیکن اگر اختلاف ہو تو وزیراعلیٰ اپنی مرضی سے حکومت نہیں چلا سکتا تھا اور گورنر اس کی حکومت ختم کر کے انتظام خود سنبھال سکتا تھا۔

کانگریسی وزارتیں 1937ء تا 1939ء اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ

Congress Ministeries 1937-39, Treatment meted out to Muslims

1935ء کے ایکٹ کا مرکزی حکومت کے حصہ کا نفاذ نہیں کیا گیا جبکہ صوبائی حصہ کے نفاذ کے بعد 1937ء میں صوبوں میں انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ کو ناکامی ہوئی۔ پنجاب' بنگال' سندھ اور سرحد میں بھی دوسری مسلم جماعتوں کو کامیابی ہوئی۔ کانگریس نے چھ صوبوں یو۔ پی' سی۔ پی' بہار' اڑیسہ' بمبئی اور مدراس میں مکمل اکثریت حاصل کر لی۔ کانگریس کو مسلمان حلقوں میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس نے وہاں دوسری مسلم سیاسی جماعتوں کے ساتھ تعاون کیا' لیکن خود مسلمانوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے پارٹی چھوڑ دینے کی شرط رکھ دی اس کا مقصد مسلم لیگ کو ان صوبوں سے بالکل ختم کرنا تھا۔ کانگریس نے 1937ء میں عوامی رابطہ مہم چلائی جس کا مقصد مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنا اور مسلم قائدین کو کمزور کرنا تھا' مسلمانوں کو یہ معلوم تھا کہ ہندو مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کانگریس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے جلد ہی کانگریس نے مسلمانوں کے حقوق' مفادات اور تہذیب و ثقافت کو کچلنا شروع کر دیا اور مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھا دیا۔ ہندو اگرچہ خود بھی اردو زبان بولتے تھے

لیکن اس کے باوجود اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھ کر مخالفت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی کوشش کی اور مشترکہ قومی زبان کا نعرہ لگایا جس میں آسان اردو اور ہندی شامل ہو گی اور رسم الخط فارسی اور دیوناگری ہو گا' لیکن بعد میں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط جاری کیا اور اردو زبان کو نظر انداز کر دیا۔ مسلمان ملازمین جو سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔ ان کو نوکریوں سے فارغ کر دیا۔ نئی ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیے گئے۔ اس سے مسلمان مالی طور پر کمزور ہو گئے۔ مسلمان مسجدوں میں عبادت نہیں کر سکتے تھے۔ نماز کے وقت مساجد کے باہر باجے بجائے جاتے۔ محرم اور عید کے موقع پر مذہبی اجتماعات کو روکنے کی کوشش کی جاتی۔ عیدالاضحیٰ پر گائے کی قربانی پر پابندی لگا دی جاتی۔

کانگریس نے تعلیمی پالیسی بھی تیار کی جس کا نام واردھا سکیم رکھا اس کی تیاری میں ایک مسلمان ذاکر حسین بھی شامل تھے جو بعد میں ہندوستان کے نائب صدر اور صدر رہے۔ اس میں ہندو قومیت کا پرچار کیا گیا۔ ہندوؤں کے تاریخی ہیروز کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ موسیقی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جو کہ اسلام میں منع تھی۔ دراصل وہ اسلامی تعلیم بچوں کے ذہنوں سے نکالنا چاہتے تھے تاکہ وہ ان کو ہندو قوم میں شامل کر سکیں۔ واردھا سکیم کی طرح ودیا مندر سکیم کے ذریعے ہندو تہذیب و ثقافت اور تعلیم دینے کی کوشش کی۔ یہ بھی تعلیمی پالیسی تھی جو سی۔پی کے صوبے میں تیار کی گئی جس کے تحت پرائمری تعلیم مندر میں دینے کا منصوبہ بنایا کیونکہ چھوٹے بچوں کے سامنے مورتی کی پوجا اور بھجن جب روزگائے جائیں گے وہ تو لاشعوری طور پر ہندو ازم کی طرف مائل ہوں گے اور پکے مسلمان نہیں بن سکیں گے۔ سی۔پی میں گاندھی کے یوم ولادت کے موقع پر مسلمان بچوں سے بھی مورتی کی پوجا کروائی گئی۔ کانگریسی وزارتوں کے دوران کانگریس نے ملک میں سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں پر برطانوی پرچم کے ساتھ ساتھ کانگریس کا جھنڈا بھی لہرانا شروع کر دیا جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ملک میں دو طاقتیں ہیں ایک انگریز اور دوسری ہندو۔ بندے ماترم کو قومی ترانے کے طور پر گانا شروع کر دیا جس میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا سروے کیا اور مختلف رپورٹیں تیار کیں جن میں 1938ء میں پیرپور رپورٹ اور 1939ء میں شریف رپورٹ بڑی اہم ہیں۔ یہ رپورٹیں کانگریس کے مسلمانوں پر کیے گئے ظلم و ستم کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ ان میں یہ بتایا گیا کہ کانگریس اسلام کو ختم کر کے ہندو ازم کو فروغ دینا چاہتی تھی۔

چونکہ ہندوؤں کو اقتدار ملا تھا اس لیے وہ پورے ملک میں ہندو مذہب کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی اور انہیں احساس ہو گیا کہ کانگریس کے دور حکومت میں ان کا مستقبل تاریک ہے لہٰذا اپنے مستقبل کو بچانے کے لیے جدوجہد کرنا بہت ضروری ہے۔ قائداعظمؒ نے مسلمان صوبوں کے وزرا اعلیٰ، پنجاب کے سر سکندر حیات، بنگال کے مولوی فضل الحق اور آسام کے سر سعداللہ کے ساتھ ملاقات کر کے انہیں مسلم لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی جوانہوں نے قبول کر لی۔ اس سے مسلم لیگ مضبوط ہو گئی۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کو ازسر نو منظم کرنا شروع کر دیا۔ انہیں بھی یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہندو مسلم کبھی بھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ ابھی کانگریس کے مظالم جاری تھے کہ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ وائسرائے نے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے تعاون کی اپیل کی۔ کانگریس نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا جبکہ مسلمان جو ہندوؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ حکومت سے کانگریسی وزارتوں سے حق اور انصاف دلوانے کی شرط رکھی اور ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی مرضی معلوم کیے بغیر ہندوستان کا دستور نہ بنایا جائے۔ برطانوی حکومت نے کانگریس کے مطالبے کو مسترد کر دیا۔ جس کی وجہ سے کانگریس نے احتجاجاً" استعفیٰ دے دیا اور اس طرح 1939ء میں یہ ظالمانہ دور اختتام پذیر ہوا اور مسلمانوں نے قائداعظمؒ کی اپیل پر 22 دسمبر 1939ء کو یوم نجات منایا اور سکھ کا سانس لیا۔

قرارداد لاہور 1940ء

Lahore Resolution 1940ء

دوسری جنگ عظم کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان میں دونوں قوموں نے آزادی کے بارے میں سوچا مسلمانوں کو تو کانگریسی وزارتوں کے خوفناک تجربے نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ان کی اپنی الگ ریاست ہونی چاہیے۔ علامہ اقبالؒ نے تو 1930ء کو اپنے خطبہ الہ آباد میں، فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ سلطنت برطانیہ کے ماتحت یا آزادی دے کر خودمختار طرز حکومت قائم کی جائے۔ شمال مغربی ریاست کا قیام مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی علاقوں کا نوشتہ تقدیر ہے۔ علامہ اقبالؒ کو یقین تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں بلکہ ایک ایسی قوم جس کا ایک

مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہندوؤں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ ان کے منافی بھی ہے۔

ایک مسلمان طالب علم چوہدری رحمت علی نے 1933ء میں ایک رسالہ "اب یا کبھی نہیں" (Now or Never) میں علامہ اقبالؒ کی تصوراتی ریاست کا نام بھی تجویز کر دیا اور وہ نام تھا "پاکستان"۔ بہت سارے مسلمانوں نے ہندوستان کو تقسیم کرنے کی مختلف سکیمیں پیش کیں۔ جو اس بات کا آئینہ دار تھیں کہ مسلمان اپنی الگ ریاست چاہتے ہیں۔ جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ مسلم لیگ نے ان تمام سکیموں کا جائزہ لیا اور پھر مسلم لیگ کا سہ روزہ اجلاس 22، 23 اور 24 مارچ 1940ء میں بلایا۔ جس میں پورے ہندوستان سے نمائندوں نے شرکت کی۔ قائداعظمؒ نے اپنی صدارتی تقریر میں الگ ریاست کا مطالبہ کر دیا اور فرمایا کہ لفظ قوم کی تعریف کسی بھی نقطہ نظر سے کی جائے مسلمان ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہیں۔ برطانوی حکومت اگر برصغیر میں امن و سکون دیکھنا چاہتی ہے تو اسے ہندوستان کو تقسیم کرنا ہوگا۔ اجلاس کے دوسرے دن یعنی 23 مارچ کو مولوی فضل الحق نے قرارداد پیش کی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

i- جغرافیائی لحاظ سے باہم متصل علاقوں کی خطوں کی صورت میں حد بندی کر دی جائے یہ خطے حسب ضرورت رد و بدل کرکے اس طرح قائم کیے جائیں کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی آزاد و خودمختار ریاستیں قائم کر دی جائیں۔ (مثلاً شمال مشرقی اور شمال مغربی حصوں کو اکٹھا کر دیا جائے) جن کے اندر شامل ہونے والی اکائیاں خودمختار اور مقتدر ہوں گی۔

ii- نئی ریاستوں کے آئین میں اقلیتوں کو مذہبی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی حقوق کا تحفظ دیا جائے تاکہ ان علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے حقوق بھی محفوظ ہو جائیں۔

اس قرارداد میں کہیں بھی لفظ پاکستان کے نام کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن اس کے باوجود ہندوؤں نے اس کو طنزاً" قرارداد پاکستان کہنا شروع کر دیا۔ جس کو بعد میں ایک قرارداد دہلی 1946ء کے ذریعے حقیقت کا روپ دے دیا گیا۔ یعنی آزاد ریاست کا نام "پاکستان" تجویز کیا گیا۔ قرارداد کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو تاثر ملتا ہے کہ شاید دو ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا اسی لیے بعد میں ترمیم کے ذریعے آزاد ریاستوں کا لفظ حذف کر کے، آزاد ریاست کا لفظ استعمال کیا گیا۔ قرارداد کی تائید چوہدری خلیق الزماں، مولانا ظفر علی خاں، سردار اورنگ زیب، سر عبداللہ ہارون، نواب اسماعیل، قاضی عیسیٰ اور

بیگم مولانا محمد علی جوہر نے کی۔ ہندوؤں نے قرارداد کی مخالفت شروع کر دی اور کہنا شروع کر دیا کہ تقسیم کا مطلب ہندوؤں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ اس فیصلہ کو مسلمان خود ہی مسترد کر دیں گے۔ برطانوی پریس نے قرارداد کے بارے میں مثبت رویہ نہ اپنایا۔ قرارداد لاہور نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کر دیا اور وہ اپنی الگ ریاست کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

کابینہ مشن پلان

Cabinet Mission Plan

جب دوسری جنگ عظیم جاری تھی تو برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں کے تعاون کی ضرورت پڑی جس کے لیے اس نے ہندوستانیوں کے سامنے مختلف تجاویز پیش کیں۔ جن میں سب سے پہلے 8 اگست 1940ء میں اگست پیش کش کے نام سے تجاویز تھیں۔ جن کو کانگریس اور مسلم لیگ نے رد کر دیا اس کے بعد مارچ 1942ء میں سر سٹیفرڈ کرپس کو تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا جس کو کرپس مشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ڈومنین کا درجہ دے دیا جائے گا اور ہندوستانیوں کو اپنا آئین خود بنانے کا اختیار بھی دے دیا جائے گا۔ جو صوبہ ڈومنین میں شامل نہ ہونا چاہے حکومت اسے الگ ڈومنین قرار دے کر اس کا الگ آئین بنوائے گی۔ ان تجاویز کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دفعہ پھر مسترد کر دیا۔ کانگریس نے 7 اگست' 1942ء میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلائی جس کی وجہ سے برصغیر کے حالات کافی خراب ہو گئے۔ حکومت نے قائدین کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ جس سے حالات قابو میں آ گئے' لیکن ان واقعات سے ہندوؤں کو احساس ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ اتحاد بہت ضروری ہے' چنانچہ انہوں نے قائداعظم سے رابطہ کر کے انہیں گاندھی کے ساتھ بات چیت پر آمادہ کر لیا' لیکن گاندھی جناح مذاکرات جو 1944ء میں ہوئے ناکام ہو گئے' کیونکہ گاندھی دو قومی نظریہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور قائداعظم اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ گاندھی آزادی پہلے اور تقسیم بعد میں چاہتے تھے جبکہ قائداعظمؒ نے اس سے بھی اختلاف کیا اور فرمایا کہ پہلے تقسیم اور پھر آزادی' گو کہ دونوں کے خیالات متضاد تھے۔ اس کے بعد لارڈ ویول جو کہ ہندوستان کی فوج ۔ کے کمانڈر

انچیف رہ چکے تھے نے 14 جون 1945ء میں "ویول پلان" پیش کیا اور ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کے لیے 25 جون 1945ء میں "شملہ کانفرنس" طلب کی، لیکن کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ماننے کے لیے تیار نہ ہوئی جس کی وجہ سے کانفرنس ناکام ہو گئی۔ اس ناکامی نے پاکستان کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ برطانوی حکومت اور کانگریس کو پتہ چل گیا کہ مسلم لیگ الگ ریاست چاہتی ہے اور وہ کسی صورت بھی اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوگی۔ برطانیہ میں انتخابات ہوئے اور لیبر پارٹی برسراقتدار آئی اور جنگ بھی ختم ہو گئی تو لارڈ ویول نے برصغیر میں انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔ مسلم لیگ نے انتخابات کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ دسمبر میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص 30 سیٹیں جیت لیں۔ صوبائی اسمبلی کے انتخابات فروری میں کروائے گئے جس میں صوبہ سرحد کے علاوہ تمام مسلم اکثریت والے صوبوں میں واضح کامیابی حاصل کرلی۔ مسلمانوں کی شاندار کامیابی سے کانگریس کو احساس ہو گیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ انتخابات کے دوران برطانوی حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ عنقریب کابینہ کے ارکان پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا جائے گا جو ہندوستانی نمائندوں، سیاسی جماعتوں، رائے عامہ کے اہم طبقوں اور حکومت ہند سے بات چیت کے بعد تجاویز تیار کر کے ہندوستان کے آئین کا مسئلہ حل کرے گا۔ چنانچہ 24 مارچ 1946ء میں وفد دہلی پہنچا۔ وفد تین ارکان لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفرڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر پر مشتمل تھا۔ وفد نے اعلان کیا کہ وہ حالات کو جانچنے کے لیے تمام لیڈروں سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ جب بات چیت شروع ہوئی تو انگریزوں کو پتہ چلا کہ دونوں کے مطالبات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مسلم لیگ تقسیم کا مطالبہ کر رہی ہے جبکہ باقی تمام جماعتیں بشمول کانگریس اس کی مخالفت کر رہی ہیں اور گاندھی نے واضح طور پر دو قومی نظریے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں یہ دلیل دی کہ یہ لوگ ہندوستانی ہیں، اپنے دین سے پھر گئے ہیں لہٰذا انہیں دو قومیں قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ قائداعظم نے فرمایا ہندوؤں اور مسلمانوں کے طور طریقے انداز فکر اور تہذیب و ثقافت جدا جدا ہیں جو کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے مسلمانوں کو علیحدہ وطن چاہیے۔ ان متضاد نظریات کے بعد برطانوی مشن کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ اس لیے انہوں نے 5 مئی 1946ء میں شملہ میں دوسری کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کے دو سیشن ہوئے لیکن دونوں کا ردعمل متضاد تھا۔ اسی متضاد ردعمل کی وجہ سے کانفرنس ناکام ہو گئی اور کابینہ مشن نے چند تجاویز پیش کیں۔

-1 ہندوستان میں وفاقی حکومت قائم کی جائے گی جس میں برطانوی ہند اور ہندوستان کی شاہی ریاستیں شامل ہوں گی۔ انہیں امور خارجہ' دفاع اور مواصلات پر کنٹرول حاصل ہوگا۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ ٹیکس بھی لگا سکیں گی۔

-2 باقی ماندہ اختیارات صوبوں اور شاہی ریاستوں کو حاصل ہوں گے۔

-3 مجلس قانون ساز میں قانون اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا جب تک دونوں بڑے فرقوں کی اکثریت موجود نہ ہو۔

-4 صوبوں کو اپنے گروپ بنانے کی اجازت ہوگی۔ ہر گروپ کی اپنی مقننہ اور انتظامیہ ہوگی۔

-5 وفاق اور صوبائی گروپوں کے آئین میں یہ شق ہوگی کہ کوئی صوبہ اپنی اسمبلی کی اکثریت سے دس سال بعد یا ہر سال مطالبہ کر سکتا ہے کہ دستور کی شرائط کو از سر نو مرتب کیا جائے۔

-6 صوبوں اور شاہی ریاستوں کے نمائندے دہلی جمع ہوں گے اور چیئرمین کے انتخاب کے بعد یہ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ گروپ اس طرح ہوں گے۔

(الف) مدارس' بمبئی' یو۔پی' سی۔پی' بہار اور اڑیسہ۔

(ب) پنجاب' سندھ اور سرحد۔

(ج) بنگال اور آسام۔

-7 تینوں گروپ فیصلہ کریں گے کہ وہ آئین بنانا چاہتے ہیں یا نہیں' اگر بنانا چاہتے ہیں تو اختیارات کی تقسیم' گروپ اور صوبوں کے درمیان کس طرح کرنی ہے۔

-8 نمائندے مل کر ہندوستان کے وفاق کے لیے آئین بنائیں گے۔

-9 جب تک آئین تیار نہیں ہوتا اس وقت تک ایک عبوری حکومت قائم کی جائے گی جس میں تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو شریک کیا جائے گا۔ تمام شعبے ہندوستانیوں کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

کابینہ مشن نے تجاویز پیش کرنے کے ساتھ ہی اعلان کیا کہ جو سیاسی جماعت ان تجاویز کو قبول کرے گی اس کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ ان تجاویز میں تقسیم کا ذکر نہیں تھا بلکہ علیحدگی کا تصور بھی دس سال بعد تھا۔ مسلم لیگ نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور ساتھ واضح کیا کہ مسلمان پاکستان چاہتے ہیں اور ایک کی بجائے دو دستور ساز

اسمبلیاں بنانے کے خواہاں ہیں اور اس کے ساتھ ہی تجاویز کو قبول کر لیا۔ برطانوی وزراء نے مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت نہ دی کیونکہ کانگریس نے ان تجاویز کو رد کر دیا۔ اس طرح 29 جون 1946ء کو کابینہ مشن ناکام ہو کر واپس انگلستان روانہ ہو گیا۔ اصولی طور پر مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت ملنی چاہیے تھی۔ مسلمانوں نے انگریزوں کی وعدہ خلافی کی وجہ سے راست اقدام کا سوچا اور مسلم لیگ کی اپیل پر 16 اگست 1946ء کو راست اقدام منایا گیا۔ ہڑتال ہوئی، جلسے منعقد کیے گئے اور جلوس بھی نکالے گئے اور تجاویز کو نامنظور کر دیا۔ جونہی مسلمانوں نے یہ اعلان کیا کانگریس نے ان تجاویز کو قبول کر لیا اور برطانوی حکومت نے کانگریس کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے دی اور اس طرح کانگریس نے حکومت قائم کر لی، لیکن ہندوستان کے حالات بدستور خراب تھے۔ جس کی وجہ سے وائسرائے لارڈ ویول کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ بھی حکومت میں شامل ہو جائے۔ اس لیے اس نے قائداعظم، نہرو اور گاندھی سے ملاقات کر کے قائداعظم کو حکومت میں شرکت پر رضامند کر لیا اور اس طرح مسلم لیگ نے اپنے پانچ نمائندے نامزد کر دیے۔ لیاقت علی خاں خزانہ، ابراہیم اسماعیل چندریگر تجارت، سردار عبدالرب نشتر ڈاک اور فضائیہ، راجہ غضنفر علی خاں صحت اور جوگندر ناتھ منڈل کو قانون کی وزارت سونپی گئی۔ دونوں جماعتیں مل کر حکومت چلا رہیں تھیں لیکن اتحاد نہ تھا۔ دونوں ہر معاملے میں الگ الگ مشورہ کرتیں کیونکہ دونوں کے مقاصد متضاد تھے۔ اس وجہ سے ان کے اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ کانگریس چاہتی تھی کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس جلد از جلد بلوایا جائے جبکہ مسلم لیگ چاہتی تھی فی الحال اجلاس نہ بلایا جائے، لیکن وائسرائے نے 9 دسمبر 1946ء کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ مسلم لیگ نے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا، کیونکہ مسلم لیگ پہلے ہی دو دستور ساز اسمبلیوں کا مطالبہ کر چکی تھی جبکہ انگریز اور ہندو اس کے حق میں نہیں تھے جس کی وجہ سے ہندوستان کے حالات خانہ جنگی کی سی حیثیت اختیار کر گئے۔

ماؤنٹ بیٹن پلان اور پاکستان کا قیام

Mount-batten Plan and the Foundation of Pakistan

فروری 1947ء میں حالات چونکہ بہت خراب ہو چکے تھے اس لیے وزیراعظم ایٹلی نے

دارالعوام میں کہا کہ حکومت برطانیہ یہ چاہتی ہے کہ جون 1948ء تک ہندوستان کو مکمل آزادی دے دی جائے گی۔ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن کو وائسرائے ہند مقرر کیا جائے گا۔ لارڈ مونٹ بیٹن 22 مارچ 1947ء کو ہندوستان پہنچا۔ اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد محسوس کہ تقسیم اب ناگزیر ہو گئی ہے۔ لہٰذا اس نے ہندوستان کی تقسیم کی سکیم تیار کی اور مئی میں یہ سکیم لے کر لندن روزانہ ہو گیا اور برطانوی حکومت کی منظوری کے بعد یہ سکیم ہندوستان کے سات اہم لیڈروں کے سامنے رکھی جن میں قائداعظم محمد علی جناحؒ، لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر، نہرو، سردار پٹیل، کریلانی اور سردار بلایو سنگھ شامل تھے۔ 3 جون 1947ء کو وائسرائے نے تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کو دیا جس کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے۔

1- برطانوی حکومت اب ہندوستان میں کوئی دستور نافذ نہیں کرے گی، بلکہ یہ کام ہندوستانی خود کریں گے۔ دستور ملک کے ان حصوں پر نافذ کیا جائے گا جہاں کے عوام اسے قبول کریں گے۔

2- پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک حصے میں مسلم اکثریت والے علاقے جب کہ دوسرے حصے میں باقی ماندہ علاقوں کے نمائندہ ہوں گے۔ دونوں حصے الگ الگ فیصلہ کریں گے کہ آیا صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے یا نہیں، اگر کسی حصے نے معمولی اکثریت سے بھی تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا تو صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے گا اور اگر تقسیم کے خلاف فیصلہ ہوا تو بھی مشترکہ اجلاس میں فیصلہ ہو گا کہ کون سی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

3- سندھ کی دستور ساز اسمبلی یہ فیصلہ کرے گی کہ ان کا آئین موجودہ دستور ساز اسمبلی بنائے گی یا نئی دستور ساز اسمبلی۔

4- صوبہ سرحد کے مستقبل کا فیصلہ عوام رائے شماری کے ذریعے کریں گے۔

5- صوبہ بلوچستان موزوں طریقے سے یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ تقسیم کے حق میں ہے یا نہیں۔

6- ہندوستان کی شاہی ریاستیں اپنے حالات اور جغرافیائی پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی بھی ریاست کے ساتھ الحاق کر سکتی ہیں۔

7- پنجاب اور بنگال نے اگر تقسیم کے حق میں فیصلہ دے دیا تو سرحدوں کے تعین کے لیے حد بندی کمیشن مقرر کیے جائیں گے۔ بنگال کی تقسیم کی صورت میں سلہٹ

میں بھی رائے شماری ہو گی۔

8۔ برطانوی حکومت اس سال ایک یا دو جانشین ریاستوں کو اقتدار منتقل کر دے گی۔

3 جون 1947ء کا منصوبہ مسلم لیگ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ 15 جون کو کانگریس نے بھی اس منصوبے کو تسلیم کر لیا۔ پنجاب اور بنگال نے تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا جس کے مطابق مغربی پنجاب اور مشرقی بنگال کا علاقہ پاکستان کے حصے میں آیا۔ صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا چنانچہ جولائی 1947ء میں برطانوی حکومت نے 3 جون 1947ء کے منصوبے کی بنیاد پر قانون آزادی ہند جو 18 جولائی 1947ء کو قانون بنا، کو منظور کر لیا جس میں یہ طے کیا گیا کہ 15 اگست 1947ء کو ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار ختم ہو جائے گا اور ہندوستان دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جب تک دونوں ریاستیں اپنے اپنے دستور تیار نہیں کرتیں اس وقت تک 1935ء کے ایکٹ میں ترمیم کر کے اس کو نافذ کر سکیں گی۔ دونوں ریاستوں کے قانون ساز اداروں کو اپنے اپنے ممالک میں مکمل قانون سازی کا اختیار حاصل ہو گا برطانیہ کے شہنشاہ کو یہ حق حاصل نہیں ہو گا کہ وہ دونوں ریاستوں کے بنائے ہوئے قوانین کو نامنظور کرے بلکہ ان ریاستوں کے گورنر جنرلوں کو قوانین منظور یا رد کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔ برطانیہ میں سیکرٹری آف سٹیٹ کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت اور شاہی ریاستوں کے درمیان معاہدات کریں گی۔ اس قانون آزادی ہند کے تحت 14 اگست 1947ء کو پاکستان کو اقتدار منتقل کر دیا گیا اور پاکستان دنیا کے نقشے پر وجود میں آ گیا۔ مونٹ بیٹن مشترکہ گورنر جنرل بننا چاہتا تھا لیکن مسلم لیگ نے اسے قبول نہ کیا اور اس طرح قائداعظمؒ نے 14 اگست 1947ء کو پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ 3 جون 1947ء کے منصوبے کے مطابق پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی صورت میں حد بندی کمیشن قائم کیے جانے تھے لہٰذا ریڈ کلف کو دونوں کمیشن کا مشترکہ سربراہ بنایا گیا اس نے عین وقت پر حدبندی میں رد و بدل کر کے پاکستان کے لیے بہت ساری مشکلات پیدا کر دیں اور ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ پنجاب میں مسلم اکثریت والے علاقے فیروز پور، جالندھر اور گرداسپور کو ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا۔ گرداسپور کی وجہ سے ہندوستان کو کشمیر پہنچنے کا راستہ مل گیا اور اس طرح مسئلہ کشمیر شروع ہو گیا جو آج تک حل نہیں ہو سکا۔ مسلم لیگ نے احتجاج کیا کہ پاکستان کے ساتھ سراسر زیادتی کی جا رہی ہے چونکہ دونوں حکومتوں نے کمیشن کے فیصلہ کو منظور کرنے کا وعدہ

کیا تھا جس کی وجہ سے یہ قبول کرنا پڑا۔

پاکستان کو شروع میں بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے زیادہ تر ہندوؤں اور انگریزوں کے پیدا کردہ تھے جن میں مہاجرین کا مسئلہ بھی بڑا اہم تھا' لاکھوں مہاجرین بے سرو سامان پاکستان آئے تھے ان کو آباد کرنا خاصا مشکل تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ مسئلہ جلد حل ہو گیا۔ دفاع کا مسئلہ بھی تھا' کیونکہ پاکستان کے پاس اسلحے اور فوج کی کمی تھی۔ ہندوستان نے پاکستان کو جو اسلحہ دیا وہ ناکارہ تھا جو گاڑیوں دیں وہ خراب تھیں لیکن اس کے باوجود فوج کو از سر نو منظم کر کے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا۔ معاشی مسئلہ بھی درپیش تھا کیونکہ پاکستان میں سرمائے کی کمی تھی ہندوستان نے ہمارے حصے کا پورا پیسہ بھی نہیں دیا تھا اور مسلمان عوام کی مالی حالت بھی تسلی بخش نہ تھی۔ مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے صاحب ثروت لوگوں کو سرمایہ کاری کی طرف راغب کیا گیا۔ ملک میں یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کیا گیا۔ نہری پانی کا مسئلہ بھی 1960ء میں سندھ طاس معاہدے کے تحت حل کر لیا گیا اور بہت سارے انتظامی اور سیاسی مسائل تھے جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حل کر لیے گئے۔

سوالات

1- سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی حالت کو سنوارنے کے لیے جو خدمات سرانجام دیں ان کا جائزہ لیجیے۔
2- تحریک علی گڑھ سے کیا مراد ہے؟ اس کی کارکردگی تفصیل سے بیان کیجیے۔
3- تقسیم بنگال اور شملہ وفد نے برصغیر کی مسلم سیاست پر جو اثرات مرتب کیے ان کا جائزہ لیجیے۔
4- آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی وجوہات اور مقاصد تحریر کیجیے۔
5- لکھنؤ پیکٹ 1916ء کے حوالے سے کانگریس اور مسلم لیگ میں تعاون پر روشنی ڈالیے۔
6- تحریک خلافت سے کیا مراد ہے نیز اس کی ناکامی سے ہندو مسلم تعلقات پر جو اثرات پڑے' ان کو بیان کیجیے۔
7- 1935ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی خودمختاری کا جائزہ لیجیے۔
8- کانگریسی وزارتوں (1937ء تا 1939ء) نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس

کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

9- قرارداد لاہور 1940ء کے نکات اور اہمیت بیان کیجیے۔

10- کابینہ مشن پلان پر تفصیلی بحث کیجیے۔

11- 3 جون 1947ء کے منصوبے کی تفصیل بیان کیجیے۔

12- قیام پاکستان کے بعد درپیش ابتدائی مشکلات کا جائزہ لیجیے۔

باب دوم

پاکستان کی سرزمین اور لوگ

The Land and People of Pakistan

پاکستان براعظم ایشیا کے جنوب میں واقع ہے- جغرافیائی اصطلاح میں پاکستان 23.30 سے 36.45 ڈگری شمالی عرض بلد اور 61 سے 75.31 ڈگری مشرقی طول بلد کے درمیان پھیلا ہوا ہے-

پاکستان پانچ دریاؤں، بلند و بالا پہاڑوں، حسین وادیوں اور سرسبز میدانوں کی سرزمین ہے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ملک کو بے شمار نعمتیں عطا کیں ہیں- پاکستان میں کئی قومیں آباد ہیں لیکن اسلام نے ان سب کو ملت واحدہ میں پرو دیا ہے اور سب تسبیح کے دانوں کی طرح متحد ہیں اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں-

جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان دنیا کے انتہائی اہم خطے میں واقع ہے پاکستان کا محل وقوع بین الاقوامی تجارت، عالم اسلام اور عالمی طاقتوں کے مفادات کے لیے بڑا اہم ہے- پاکستان کا رقبہ 796096 مربع کلومیٹر ہے اور آبادی قریباً ساڑھے تیرہ کروڑ ہے پاکستان کے مشرق میں بھارت، مغرب میں افغانستان اور ایران، شمال میں کوہ قراقرم اور ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ اور ساتھ ہی چین کی سرحد ہے- شمال مغرب میں افغانستان کے قصبے واخان کی پٹی روس اور پاکستان کی سرحد کو جدا کرتی ہے- جنوب میں بحیرہ عرب ہے جس کا پانی شدید سردی میں منجمد نہیں ہوتا اور سارا سال سمندر کے راستے تجارت جاری رہتی ہے-

پاکستان کی زمین بڑی زرخیز ہے- یہ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور زراعت کو پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے لیکن ملک کا سارا رقبہ زیر کاشت نہیں ہے کیونکہ بہت سی زمین بنجر پڑی ہے-

پاکستان میں دو طرح کی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں ایک فصل ربیع جو برسات کے بعد اکتوبر نومبر یعنی سردیوں کے آغاز میں بوئی جاتی ہیں اور اپریل مئی تک ان کی کٹائی ہوتی ہے اس میں گندم، جو، تمباکو اور سبزیوں کی فصلیں شامل ہیں اور دوسری فصل خریف ہے جو

اپریل سے جون تک بوئی جاتی ہے اور اکتوبر نومبر میں کاٹ لی جاتی ہے اس میں کپاس، چاول، گنا اور مکئی شامل ہیں۔ آبی وسائل کے لحاظ سے پاکستان خوش قسمت ملک ہے۔ پنجاب کا نہری نظام بہت اچھا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں اعلیٰ قسم کی لکڑی اور پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ تھل اور سطح مرتفع پوٹھوہار کے علاقے میں چنے اور گندم کی فصلیں کاشت ہوتی ہیں۔ دریاؤں کا پانی آبپاشی کے کام آتا ہے اور ساتھ ہی ان پر بند باندھ کر بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ جنگلات جو کسی ملک کے ایک چوتھائی رقبے پر ہونے چاہییں، ہمارے ہاں بہت کم قریباً" 4 فیصد رقبے پر ہیں۔ پاکستان میں معدنیات کی کمی نہیں لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ حکومت نے معدنیات کی تلاش کے لیے غیر ملکی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کیں ہیں اور تحقیقاتی ادارے بھی قائم کیے ہیں۔ جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں کوئلہ، نمک، تیل، گیس، لوہا، کرومائیٹ، جپسم، گندھک، تانبا اور چونے کے پتھر کے ذخائر موجود ہیں، گو کہ پاکستان ان ذخائر میں خود کفیل نہیں ہے۔ لیکن پاکستان میں کوئلہ کے ذخائر پنجاب میں ڈنڈوٹ، مکڑوال، بلوچستان میں ڈیگاری، شارک، ہرنائی، شیریں آب، بولان اور مچھ، سندھ میں ٹھٹھہ، مینارا اور لاکھڑا میں ہیں اس کے علاوہ اب تھرپارکر میں بھی کوئلے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ پاکستان میں ابھی عمدہ قسم کا کوئلہ دریافت نہیں ہوا جسے انجنوں میں استعمال کیا جا سکے۔ نمک کے ذخائر وسیع مقدار میں موجود ہیں۔ پاکستان نمک میں نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ اس کو برآمد بھی کرتا ہے۔ دنیا میں نمک کی دوسری بڑی کان کھیوڑہ میں ہے۔ پاکستان میں تیل کی پیداوار بہت کم ہے، تیل کی زیادہ مقدار درآمد کرنا پڑتی ہے۔ پاکستان میں قدرتی گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں جو کہ تیل اور کوئلے کی کمی کو بھی کسی حد تک پورا کرتے ہیں۔ لوہا درآمد کرنا پڑتا ہے۔ حکومت پاکستان معدنی وسائل کی طرف بھرپور توجہ دے رہی ہے۔

پاکستان کی آب و ہوا گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا ساحلی علاقہ بہت کم ہے اس کا وسیع علاقہ ان سمندری ہواؤں کے اثر سے باہر ہے جو درجہ حرارت میں اعتدال پیدا کرتی ہے۔

پاکستان کے لوگوں کی خصوصیات

Characteristics of the people of Pakistan

ہمارے ملک کی آبادی تیرہ کروڑ سے بڑھ چکی ہے اور 3 فیصد سالانہ کے حساب سے مزید بڑھ رہی ہے۔ پاکستان کے چار صوبے پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان ہیں گو کہ جغرافیائی لحاظ سے ان صوبوں کی ثقافت میں تھوڑا بہت فرق ہے لیکن اسلام کی گہری چھاپ ہونے کی وجہ سے ان سب میں یگانگت پائی جاتی ہے۔ پاکستان کے لوگوں کی درج ذیل خصوصیات ہیں۔

1- مذہب سے لگاؤ: پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ چونکہ اس نے آزادی بھی مذہب کی بنیاد پر حاصل کی تھی اس لیے ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ پاکستان کے عوام اپنے مذہب سے گہری عقیدت رکھتے ہیں' اسلام کو مکمل ضابطہ حیات تصور کرتے ہیں اور اسلام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں اور مذہب کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ مذہبی تہوار جن میں یکم شوال کو عید الفطر' 10 ذوالحج کو عید الاضحیٰ' 10 محرم کو یوم عاشور اور 12 ربیع الاول کو عید میلادالنبی شامل ہیں' جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ 27 رجب کو شب معراج اور 15 شعبان کو شب برات کی راتوں میں عبادت کرتے ہیں۔ رمضان میں روزے رکھتے ہیں اور رمضان کی آخری راتوں میں محافل شبینہ کا انتظام کیا جاتا ہے اور ساری رات اللہ تعالیٰ کا ذکر و قیام کیا جاتا ہے۔

2- سادہ معاشرتی زندگی: پاکستانی لوگوں میں اسلام سے وابستگی کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی میں سادگی پائی جاتی ہے۔ خوراک اور لباس بھی سادہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ شلوار قمیض اور شیروانی ہمارا قومی لباس ہے۔ سارے ملک میں زیادہ تر شلوار قمیض ہی پہننے کا رواج ہے۔ دیہاتی علاقوں' خاص طور پر پنجاب میں قمیض دھوتی کے ساتھ پگڑی باندھی جاتی ہے۔ سندھ اور بلوچستان میں شلوار قمیض کے ساتھ ٹوپی پہننے کا رواج ہے۔ خوراک میں زیادہ تر گندم کی روٹی کا استعمال ہوتا ہے' گوشت کے ساتھ سبزیاں اور دالیں بھی استعمال ہوتی ہیں' دیہاتی علاقوں میں مکئی اور جو کی روٹی بھی عام کھائی جاتی ہے' چاول بھی پاکستانیوں کی پسندیدہ غذا ہے۔ شادی اور بیاہ کے موقع پر بینڈ باجے بجائے جاتے ہیں' پیدائش کے موقع پر بچے کے کان میں اذان دی جاتی اور رسم عقیقہ ادا کی جاتی ہے۔

اموات کے موقع پر تجہیز و تکفین کے لیے دوست احباب اکٹھے ہوتے ہیں اور نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختلف مواقع یعنی بزرگان دین کے عرس پر میلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پاکستانی کھیلوں کے بھی دلدادہ ہیں' کرکٹ اور ہاکی میں دلچسپی لیتے ہیں ہاکی ہمارا قومی کھیل ہے' اب سکوائش' فٹ بال اور سنوکر میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ پتنگ بازی' کبڈی' کشتی رانی' تاش' شطرنج' مرغبازی' بٹیر بازی' کبوتر بازی' نیزہ بازی' گالف' گھوڑ دوڑ اور گلی ڈنڈا کو بھی بہت پسند کیا جاتا ہے۔

3۔ بہادر اور جفاکش: پاکستانی بہت بہادر اور جفاکش ہیں اور اپنی بہادری اور جرات مندی کی بنیاد پر دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ پاکستانی مشکل سے مشکل کام کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتے وہ ملک کے دفاع کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اگر ان کو مناسب سہولتیں اور رہنمائی ملے تو یہ پتھروں سے بھی ٹکرا جائیں۔

4۔ مخلوط ثقافت: پاکستان کا علاقہ دنیا کی مختلف تہذیبوں کے زیر اثر رہا ہے مثلاً آریا تہذیب' مسلم حکمرانوں کا دور' انگریزوں کا دور وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ثقافت پر اسلامی چھاپ کے ساتھ ساتھ دوسری ثقافتوں کے اثرات بھی ہیں اس کے علاوہ ہمارے چاروں صوبوں کی ثقافت میں بھی جغرافیائی لحاظ سے تھوڑا بہت فرق ہے لیکن یہ فرق اسلام کی وجہ سے نمایاں نہیں ہو سکا البتہ ہندو اور برطانوی ثقافت کے اثرات ہماری ثقافت کا حصہ بن چکے ہیں۔

5۔ سادہ زبان: پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے جو کہ بہت آسان اور عام فہم ہے اسی وجہ سے سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے پشتو' پنجابی سندھی بلوچی' کشمیری اور براہوی علاقائی زبانیں ہیں لیکن اردو زبان کو اتحاد کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ گو کہ انگریزوں کی حکمرانی کی وجہ سے انگریزی زبان کی سرکاری حیثیت کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکا۔ لیکن عوام کی اکثریت اس زبان کو سمجھ اور بول نہیں سکتی بلکہ اردو زبان سب کو بہت آسان اور سادہ لگتی ہے۔ اس لیے کہ یہ ہماری قومی زبان ہے۔

6۔ ناخواندگی: پاکستان کی اکثریت تعلیم یافتہ نہیں ہے' غیر سرکاری اندازے کے مطابق قریباً" 34 فیصد عوام پڑھے لکھے ہیں' آبادی کی اکثریت دیہاتوں میں رہتی ہے جہاں تعلیم کا

خاطر خواہ انتظام نہیں ہے جس پر حکومت اپنی بھرپور توجہ دے رہی ہیں تاکہ خواندگی کے تناسب میں اضافہ کیا جا سکے۔

7- مشترکہ خاندان : پاکستان میں مشترکہ خاندان کا رواج عام ہے جس میں سب مل کر رہتے ہیں۔ گو کہ شہروں میں اب علیحدہ رہنے کا تصور عام ہو رہا ہے لیکن دیہاتوں میں سب مل جل کر رہتے ہیں گھر کا نظام چلانا گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ سب اس کی مدد کرتے ہیں اور اسی کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ مرد ہوتا ہے عورت کو بھی گھر میں کام کاج کرنے کی ذمہ داری پوری کرنا پڑتی ہے اس طرح مرد و عورت دونوں مل کر خاندان کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

8- معاشی پسماندگی : پاکستان میں افرادی قوت کی کمی نہیں ہے لیکن روزگار کے مواقع کم ہیں کیونکہ ہماری ملکی معیشت مستحکم نہیں ہے۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اس نے ابھی ترقی کی منازل طے کرنا ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ وسائل کی کمی کے باوجود ہماری موجودہ حکومت صنعت، تجارت اور زراعت پر بھرپور توجہ دے کر معاشی مسائل پر قابو پا لے گی۔ معاشی پسماندگی پاکستان کو وراثت میں ملی تھی کیونکہ انگریزوں نے جان بوجھ کر موجودہ علاقے کو پسماندہ رکھا لیکن اب صورت حال مختلف ہے اور اب پہلے کی نسبت ملک نے اپنی معاشی حیثیت کو بہتر بنا لیا ہے تاہم ابھی بھی ٹھوس اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

پاکستان کی آبادی: تشکیل و تقسیم

Population of Pakistan : Composition and Distribution

کسی ملک کی آبادی کی تقسیم و تشکیل بہت اہمیت کی حامل ہے اس سے آبادی کی دیہی اور شہری، خواندگی و ناخواندگی، صنف، عمر اور پیشے کے تناسب کا پتہ چلتا ہے۔ اسی سے معاشی اور معاشرتی منصوبہ بندی میں مدد ملتی ہے ذیل میں آبادی کی تقسیم کا جائزہ لیا گیا ہے۔

1- دیہاتی اور شہری آبادی : ترقی یافتہ ممالک میں آبادی کی اکثریت شہروں میں رہتی ہے اس کے برعکس ترقی پذیر ممالک یا جن ملکوں کا انحصار زراعت پر ہے ان کی آبادی کی اکثریت دیہاتوں میں رہتی ہے۔ پاکستان جو کہ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اس کی

زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کا شہری تناسب 28.3 فیصد اور دیہی تناسب 71.7 فیصد ہے۔ اگرچہ یہ تناسب صنعت و تجارت کی ترقی کی وجہ سے بڑھ چکا ہے کیونکہ لاکھوں لوگ شہروں میں آ کر آباد ہو چکے ہیں۔ 1991ء میں مردم شماری نہ ہونے کی وجہ سے صحیح تناسب دستیاب نہیں لیکن اب بھی دیہاتی آبادی شہری آبادی سے زیادہ ہے۔ گو کہ دیہاتیوں کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے جن میں سب سے بڑا مسئلہ ناخواندگی ہے۔ دیہاتوں میں سکول بہت کم ہیں شہروں سے اساتذہ بھی دور دراز دیہاتوں میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حکومت نے پرائمری تک تعلیم لازمی قرار دی ہے لیکن اس کے باوجود انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے دیہات میں رہنے والوں کا معیار زندگی بلند نہیں ہے۔ غربت بھی دیہاتیوں کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ جب فصلیں بوئی اور کاٹی جاتی ہیں تو وہ بڑے مصروف ہوتے ہیں باقی دن فارغ بیٹھ کر گزارتے ہیں اور اگر فصل خراب ہو جائے تو پھر وہ مقروض ہو جاتے ہیں۔ مشکل سے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہیں۔ انہیں مرغبانی، ریشم کے کیڑے پالنے اور بھیڑ بکریاں پالنے کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ ان کی معاشی تنگ دستی دور ہو سکے۔ فصلوں کی کاشت کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں، وقت پر کھاد اور پانی استعمال کریں تو پیداوار بھی مناسب ہو اور پیسہ بھی کمایا جا سکے۔ دیہاتی صحت اور صفائی کے اصولوں سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ گھروں کے صحن میں جانور رکھے جاتے ہیں، کھاد کے ڈھیر بھی گھروں میں رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ آئے روز بیمار رہتے ہیں لیکن اپنی بیماری کی بھی پروا نہیں کرتے۔ بیماری بڑھتی رہتی ہے حتیٰ کہ خطرناک سٹیج پر پہنچ جاتی ہے اور پھر شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں طبی سہولتوں کی بھی کمی ہے۔ دیہی آبادی کا اہم مسئلہ ٹرانسپورٹ کا ہے دیہاتوں کی سڑکیں کچی ہوتی ہیں مناسب ٹرانسپورٹ کا انتظام نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ اپنی پیداوار شہروں میں نہیں لا سکتے اور کم قیمت پر دیہاتوں ہی میں فروخت کر دیتے ہیں جس سے انہیں کافی مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

دیہاتیوں کی طرح شہریوں کو بھی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے البتہ ان کے مسائل کی نوعیت مختلف ہے۔ دیہاتیوں کو تو خالص خوراک اور تازہ ہوا میسر ہے جبکہ شہریوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ انہیں تازہ ہوا میسر نہیں آتی کیونکہ شہروں میں ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے ہوا دھوئیں سے آلودہ ہوتی ہے جس سے اکثر لوگ سانس کی بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ دوسرا انہیں کھانے کو ملاوٹ والی خوراک ملتی ہے جس سے صحت پر مزید برا اثر

پڑتا ہے۔ شہروں میں آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے رہائش کا بھی مسئلہ ہے، ٹرانسپورٹ کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے کیونکہ آبادی کی اکثریت ملازمت کرتی ہے، تعلیم حاصل کرنے تعلیمی اداروں میں جاتی ہے جس کی وجہ سے صبح کے وقت اور چھٹی کے وقت ٹرانسپورٹ کی زبردست قلت ہوتی ہے۔ ہسپتال اور ڈسپنسریاں بھی شہریوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر رہیں کیونکہ شہروں کی آبادی زیادہ ہے ویسے تو پرائیویٹ کلینک بے شمار ہیں لیکن ان کی فیس اتنی زیادہ ہے کہ عام آدمی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ گو شہری زندگی پر آسائش ہے لیکن ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانا بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے طرح طرح کے بل ادا کرنا پڑتے ہیں۔ ملازمین کی آدھی تنخواہ تو بلوں میں صرف ہو جاتی ہے باقی آدھی سے وہ بمشکل اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہیں۔ فلموں، ٹی وی، وی سی آر کا استعمال عام ہے۔ ڈش انٹینا سے جہاں معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں نوجوان نسل اخلاقی بے راہ روی کا شکار بھی ہو رہی ہے۔ دیہاتیوں اور شہریوں کو اپنے مسائل خود بھی حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حکومت بھی ان کو حل کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کر رہی ہے۔

2- صنف : پاکستان میں مردوں کی تعداد عورتوں کی نسبت ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ جنوری 1995ء میں عورتوں کی صحت کے حوالے سے لاہور میں منعقد ہونے والی ورکشاپ میں کہا گیا تھا کہ خواتین کا تناسب 48 فیصد سے بڑھ چکا ہے جبکہ 1992ء کی ٹیلی ویژن رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مردوں اور عورتوں کی آبادی کا تناسب کچھ اس طرح تھا کہ 53 فیصد مرد آبادی اور 47 فیصد خواتین کی آبادی تھی۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں 52.46 فیصد مرد تھے اور 47.53 فیصد خواتین تھیں جبکہ 1961ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق مردوں کا تناسب 53.66 فیصد جبکہ خواتین کا تناسب 43.33 فیصد تھا۔

3- تعلیم : ہمارے ملک میں تعلیم کا تناسب بہت کم ہے۔ 22 جنوری 1995ء کی ٹیلی ویژن رپورٹ کے مطابق ہمارے ہاں تعلیم کا تناسب تقریباً 37 فیصد ہے جس میں مردوں کے مقابلے میں خواتین میں خواندگی کا تناسب کم ہے۔ اسی طرح شہری آبادی میں خونداگی کا تناسب دیہی آبادی کی نسبت زیادہ ہے۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں خواندگی کا تناسب تقریباً 36 فیصد تھا، 1961ء کی مردم شماری کے مطابق کل

آبادی کا صرف 13.6 فیصد لوگ پڑھے لکھے تھے ان اعداد و شمار میں ان افراد کو بھی خواندہ لوگوں میں شامل کیا گیا ہے جو صرف دستخط کر سکتے تھے اور پڑھ سکتے تھے۔ لہٰذا اگر غور کیا جائے تو پاکستان میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہیں اور خاص طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد تو کافی حد تک کم ہے' اسی وجہ سے ملک کو تمام شعبوں میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر خواندگی کا تناسب بڑھ گیا تو خود بخود تمام مسائل حل ہونے لگیں گے ترقی یافتہ ممالک میں خواندگی کا تناسب 100 فیصد تک ہے۔

4- **عمر:** پاکستان کی آبادی کی بڑی تعداد بچوں پر مشتمل ہے اور اب بھی قریباً" 45 فیصد آبادی 15 سال سے کم عمر بچوں کی ہے۔ بچوں کی تعداد میں 3 فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے جبکہ نوجوان طبقہ کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے کیونکہ بوڑھے بھی 55 فیصد آبادی میں شامل ہیں۔ 15 سال سے 64 سال کے درمیان عمر والے افراد کا تناسب 50 فیصد اور 64 سال سے زیادہ عمر والے افراد کی آبادی کا تناسب تقریباً" 5 فیصد ہے اور اس طرح تقریباً" آدھی آبادی کام کرنے کے قابل عمر نہیں رکھتی اور جو آدھی آبادی کام کرنے کے قابل ہے اس میں خواتین کی بھی بڑی تعداد ہے جو ملازمت نہیں کرتیں اور اس طرح ہماری معیشت ترقی نہیں کر پا رہی۔

5- **پیشہ:** پاکستان میں زیادہ تر لوگوں کی تعداد زراعت کے پیشے سے منسلک ہے گو کہ صنعتی ترقی کی وجہ سے اس کے تناسب میں خاطر خواہ کمی ہوئی ہے لیکن اب بھی تقریباً" 54 فیصد لوگ زراعت کے پیشے سے وابستہ ہیں 1981ء کی مردم شماری کے مطابق زراعت پیشہ افراد کا تناسب 56 فیصد' صنعت 14 فیصد' بجلی گیس پانی 5 فیصد' تجارت 11 فیصد' ملازمین 10 فیصد' تعمیرات' نقل و حمل 9 فیصد تھا۔ 1961ء کی مردم شماری کے مطابق زراعت پیشہ 74 فیصد تھے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اب زراعت پیشہ لوگوں کی تعداد میں خاصی کمی ہوئی ہے اور لوگ اب صنعت و حرفت اور ملازمت کے پیشوں کو اپنا رہے ہیں جس کی وجہ سے مزدوروں اور ملازمین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔

6- **مذہب:** پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے کیونکہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے قریباً" 97 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے اور انہیں مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل ہیں کیونکہ اسلام نے ذمیوں کے حقوق پر بہت زور دیا ہے۔

آبادی کے رجحانات

Population Trends

پاکستان کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ آبادی کے بڑھنے کا تناسب قریباً" 3 فیصد سالانہ ہے، جو کہ پاکستان کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ پاکستان میں شرح اموات خاصی کم ہو گئی ہے اور شرح پیدائش میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق اگر شرح پیدائش یہی رہی تو آئندہ بیس سال میں آبادی دگنی ہو جائے گی۔ آبادی کی افزائش کا انحصار شرح پیدائش اور اموات پر ہوتا ہے۔ 1961ء میں آبادی میں اضافے کی شرح 2 فیصد سالانہ تھی 1981ء میں 3 فیصد سالانہ اور اب اندازے کے مطابق 3.1 فیصد سالانہ ہے جبکہ شرح اموات میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے اور اب پاکستان کی اوسط عمر مزید بڑھنے کی توقع ہے۔ گو کہ پاکستان کی اوسط عمر دوسرے ممالک سے ابھی بھی کم ہے اور شرح اموات بھی زیادہ ہے لیکن دوسرے ملکوں کی شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں ہی پاکستان سے کم ہیں۔ پاکستان میں شرح پیدائش و اموات کی زیادتی خواندگی کا تناسب کم ہونے کی وجہ سے ہے۔ پاکستان کی اکثریت ان پڑھ اور غریب ہے لہٰذا جہالت کی وجہ سے انہیں آبادی کی زیادتی کا احساس نہیں ہے اور نہ ہی اپنی صحت کا خیال ہے۔ ان کے پاس ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے وسائل کی کمی ہے جس کی وجہ سے اچھی خوراک، لباس اور رہائش حاصل نہیں کر سکتے اور تفریح کے مواقع بھی میسر نہیں جس کی وجہ سے وہ جلد ہی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر علاج کروانے کی بھی سکت نہیں رکھتے کیونکہ ادویات بہت مہنگی ہیں۔ دیہاتوں میں طبی مراکز کی کمی ہے جبکہ ہماری زیادہ آبادی دیہاتوں میں آباد ہے۔ مذہبی طور پر بھی لوگ پیدائش کی شرح میں کمی نہیں کر پا رہے کیونکہ علمائے کرام کے نزدیک خاندانی منصوبہ بندی جائز نہیں ہے اور وہ اس کو مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں گو کہ کچھ علمائے کرام نے اس کو جائز بھی قرار دیا ہے۔ ہمارا معاشرتی رجحان یہ ہے کہ لوگ زیادہ اولاد کی خواہش رکھتے ہیں اور خاص طور پر اولاد نرینہ کو پسند کیا جاتا ہے لہٰذا اولاد نرینہ حاصل کرنے کے چکر میں بچے زیادہ ہو جاتے ہیں اسلام میں چونکہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے اس لیے جو استطاعت رکھتے ہیں وہ ایک سے زیادہ شادیاں کر لیتے ہیں اور اس طرح بھی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور پاکستان افراط آبادی کا شکار ہو رہا ہے۔ افراط آبادی سے مراد ایسی صورت حال ہوتی ہے کہ ملک کے وسائل کم اور

آبادی زیادہ ہوتی ہے۔ پاکستان میں ایسا ہی ہو رہا ہے پاکستان کے وسائل ترقی نہیں کر رہے۔ لوگوں کی فی کس آمدنی کم ہے۔ معیار زندگی پست ہے لیکن آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کے وسائل میں اضافہ کیا جائے اور افزائش آبادی میں کمی کی جائے اس صورتحال کو دو طریقوں سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف اپنی معاشی ترقی کی طرف توجہ دی جائے اور دوسری طرف خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کیا جائے تاکہ ملکی وسائل بڑھ جائیں اور آبادی کم ہو اور ہم دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو مضبوط بنا سکیں۔ ہماری ترقی کا انحصار زیادہ تر زراعت پر ہے کیونکہ زیادہ تر آبادی زراعت کے پیشے سے منسلک ہے اور دوسرا صنعت کی ترقی کا دارومدار بھی زراعت پر ہے۔ صنعتوں میں جو خام مال استعمال کیا جاتا ہے وہ زراعت کے شعبے سے ہی حاصل ہوتا ہے لہٰذا زراعت کے شعبے کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ کاشتکاروں کو تربیت دی جائے۔ جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کروایا جائے' ان کو قرضے اور سہولتیں دی جائیں تاکہ وہ ملکی پیداوار میں اضافہ کر سکیں جس کی وجہ سے صنعت بھی ترقی کرے' صنعتوں میں اضافہ کیا جا سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگ روزگار حاصل کریں تاکہ بے روزگاری ختم ہو اور زیادہ لوگ کام کریں خواتین کو بھی کام کرنے کے مواقع اور سہولتیں دی جائیں تاکہ ملک کی قریباً" آدھی آبادی ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ پاکستان میں معدنیات کی بھی کمی نہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر بھی بھرپور توجہ دی جائے اور زمین میں چھپے ہوئے خزانوں کو نکال کر استعمال میں لایا جائے تاکہ پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

خاندانی منصوبہ بندی

Family Planning

خاندانی منصوبہ بندی سے مراد یہ ہے کہ خاندان اتنے افراد پر مشتمل ہونا چاہیے جن کی ضروریات زندگی کو آسانی سے پورا کیا جا سکے۔ لہٰذا سوچ سمجھ کر اپنے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اولاد پیدا کرنی چاہیے۔ خاندانی منصوبہ بندی پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے بہت ضروری ہے۔ پاکستان کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے جبکہ ملکی وسائل اتنی تیزی سے نہیں بڑھ رہے۔ 1961ء میں پاکستان کی آبادی قریباً" 4 کروڑ تھی' 1981ء میں بڑھ کر 8 کروڑ 37 لاکھ 82 ہزار ہو گئی اور اب 1997ء میں یہ آبادی 13 کروڑ سے بڑھ چکی ہے لیکن

عوام کی اکثریت غربت کا شکار ہے' معیار زندگی پست ہے ملک میں شرح اموات اور شرح پیدائش بہت زیادہ ہے۔ عوام کی اکثریت ان پڑھ ہے' بے روزگاری سے عام لوگوں کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے ان کی صحت بھی اچھی نہیں اور ہر سال لاکھوں انسان بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ عوام کی اوسط عمر بھی دوسرے ممالک کی نسبت کم ہے۔

پاکستان میں معدنیات کی کمی نہیں لیکن معدنیات سے سرمائے کی کمی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ ہمارا ملک افراط آبادی کا شکار ہے۔ افراط آبادی کی وجہ سے لوگوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ خاندان کے ارکان کی تعداد کم ہو' تاکہ ان کی کفالت آسانی سے کی جا سکے۔ دراصل آبادی میں اضافہ اسی وجہ سے زیادہ ہو رہا ہے کہ لوگ عام طور پر زیادہ اولاد کی خواہش رکھتے ہیں زیادہ تر عوام قدامت پسند ہیں اور وہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہیں کرتے بلکہ اس کو مذہب کے منافی سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری آبادی میں 36 لاکھ سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ مغربی ممالک کو چھوڑیں انڈونیشیا' بنگلہ دیش' ہندوستان اور سری لنکا جیسے ترقی پذیر ممالک میں شرح پیدائش خاصی ہے۔ پاکستان میں شرح اموات شرح پیدائش کے مقابلے میں کم ہے جدید طبی سہولتوں کی فراہمی اور تعلیم کے فروغ سے بھی شرح اموات میں کمی واقع ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ پاکستان کی آبادی میں اضافہ 30 لاکھ سے زائد افغان مہاجرین کی آمد سے بھی ہوا ہے۔ آبادی میں اس اضافے کی وجہ سے طرح طرح کے معاشرتی اور معاشی مسائل پیدا ہو رہے ہیں' جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگوں کی غذائی ضروریات پوری نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے وہ غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ رہائشی سہولتوں کی بھی کمی ہو گئی ہے' روزگار بھی میسر نہیں۔ غربت کی وجہ سے لوگ اپنے بچوں کو تعلیم بھی نہیں دلوا سکتے بلکہ ان سے چھوٹی عمر میں ہی مشقت کروانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان تمام مسائل سے نپٹنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی بہت ضروری ہے تاکہ ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کو کنٹرول کیا جا سکے اور ملک کی قریباً" نصف آبادی جو کہ خواتین پر مشتمل ہے ان کی صحت کو بھی بہتر بنایا جا سکے کیونکہ زچگی اور بچے کی دیکھ بھال سے عورت کی صحت متاثر ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے خاندان کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکتی اور جو بچے اس کی گود میں پروان چڑھتے ہیں وہ بھی ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں قریباً" ہر

سال 25000 خواتین زچگی کی پیچیدگیوں کے باعث موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اور اس سے پندرہ گنا موت کے منہ سے تو بچ نکلتی ہیں مگر عمر بھر کے لیے روگی ہو جاتی ہیں اور اپنے خاندان پر بوجھ بن جاتی ہیں- وہ اپنے فرائض ادا نہیں کر پاتیں جس کے بھیانک اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بچے ماں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں- بچوں کی تعداد اس حد تک ہونی چاہیے جتنی وسائل اجازت دیتے ہوں تاکہ بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت ہو سکے اور وہ ملک کے مایہ ناز شہری ثابت ہو سکیں- ایسا تب ہی ہو سکتا ہے جب خاندان اپنے وسائل کے مطابق ہو گا' اس سے ملک کی معیشت پر بھی مثبت اثر پڑے گا- ہمارے ملک کے لیے خاندانی منصوبہ بندی بہت اہمیت کی حامل ہے لیکن اس کے باوجود چند علمائے کرام اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے اسلام کے منافی سمجھتے ہیں حالانکہ جامعہ الازہر مصر کے علمائے کرام نے اس کی مخالفت نہیں کی-

خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں دلائل

1- اقتصادی ترقی: خاندانی منصوبہ بندی کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ جب خاندان کے افراد کی تعداد کو محدود کر دیا جائے گا تو پھر ان کی کفالت آسانی سے کی جا سکے اور بچت میں اضافہ ہو گا یہ بچت ملک میں سرمایہ کاری کے لیے استعمال کی جا سکے گی اور لوگوں کو روزگار کی سہولتیں فراہم کی جا سکیں گی' قومی دولت میں اضافہ ہو گا اور ملک معاشی لحاظ سے ترقی کرے گا اور افراط آبادی کے مسئلے کو حل کیا جا سکے گا-

2- بلند معیار زندگی: اگر خاندان' منصوبے کے تحت بنایا جائے گا تو خاندان کے تمام افراد کو کھانے کے لیے اچھی خوراک' پہننے کے لیے اچھا لباس اور رہنے کے لیے اچھی رہائش ملے گی- اس کے ساتھ زندگی کی دوسری سہولتوں سے بھی استفادہ حاصل ہو سکے گا- لوگ اچھی زندگی گزار سکیں گے اور ان کا معیار زندگی بلند ہو جائے گا-

3- اعلیٰ تربیت: خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے کی وجہ سے بچے کم ہوں گے اور اگر بچے کم ہوں گے تو انہیں زیادہ وقت دیا جا سکے گا اور بچوں کو اچھی تعلیم دی جا سکے گی- بچے زیادہ ہونے کی صورت میں والدین ان پر بھرپور توجہ نہیں دے سکتے- والد کو ہر وقت ان کی ضروریات پوری کرنے کی فکر ہو گی اور وہ اسی تگ و دو میں مصروف رہے گا کہ کس طرح آمدنی میں اضافہ کیا جائے جبکہ ماں ہر وقت ان کے کھانے پینے اور کپڑے دھونے سے

فرصت نہ پا سکے گی اور بچے نظر انداز ہوتے رہیں گے' باہر گلیوں میں آوارہ پھرتے رہیں گے' تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیں گے کیونکہ والدین کے پاس اتنا وقت نہیں ہو گا کہ وہ ان کا دھیان رکھ سکیں' انہیں پڑھنے کے لیے بٹھائیں' انہیں اچھے طور طریقے سکھائیں نتیجہ یہ نکلے گا کہ بچے آوارہ ہو جائیں گے۔ جبکہ خاندان چھوٹا ہونے کی صورت میں ایسا نہیں ہو گا بلکہ والدین بچوں کی تعلیم و تربیت اچھے طریقے سے کر سکیں گے اور ملک کو اچھے شہری میسر آ سکیں گے کیونکہ خاندان کی حیثیت بھی ایک چھوٹی ریاست کی سی ہے۔ بچے خاندان سے ہی بنیادی تربیت حاصل کرتے ہیں جو ان کی ساری زندگی پر اثر رکھتی ہے۔

4- **اچھی صحت :** خاندانی منصوبہ بندی کی وجہ سے شہری صحت مند ہوں گے' ماں بچے کی صحت اچھی ہو گی۔ بچوں کی پیدائش میں مناسب وقفے کی وجہ سے ماں کی صحت بھی اچھی ہو گی اور وہ اپنے بچے پر توجہ دے گی جس کی وجہ سے بچہ بھی صحت مند ہو گا ہمارے معاشرے میں عورت کو بے شمار گھریلو ذمہ داریاں پورا کرنا پڑتیں ہیں گھر کا کام بھی اکثریت کو خود کرنا پڑتا ہے۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے خوراک بھی اچھی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ہماری خواتین بیماریوں میں مبتلا ہیں اور مزید بچے پیدا کرنے کی متحمل نہیں' جبکہ مرد ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے اور زیادہ اولاد حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات خواتین اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہین لہٰذا عورت کی زندگی کو محفوظ بنانے اور بچوں کے صحت مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کو اپنایا جائے تاکہ ریاست کو تندرست شہری میسر آ سکیں اور ریاست ترقی کر سکے۔

5- **معاشی منصوبہ بندی میں آسانی :** خاندانی منصوبہ بندی کی وجہ سے آبادی تیزی سے نہیں بڑھے گی اور حکومت کو معاشی منصوبے بنانے اور ان پر عمل کرنے میں آسانی ہو گی۔ جو ہدف مقرر کیا جائے گا اس کو پورا کیا جا سکے گا ہمارا ملک ترقی پذیر ملک ہے اس کے لیے معاشی منصوبہ بندی بہت ضروری ہے کیونکہ یہ معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے لازمی ہے۔ اس سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں ایسے پروگرام اور پالیساں بنائی جاتیں ہیں جن پر عمل کر کے ایک قوم منظم بنیادوں پر معاشی ترقی اور خوشحالی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

6- **اخلاقی قدروں کی بحالی :** خاندان جب سوچ سمجھ کر بنایا جائے گا تو اس کے ارکان کی تربیت اچھی ہو گی اور وہ معاشرے میں اچھی اخلاقی قدروں کو بحال کر سکیں گے کیونکہ

جب آبادی تھوڑی تھی، سرمایہ بھی اتنا زیادہ نہیں تھا تو لوگ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے مسائل بڑھ گئے، اخلاقی قدریں بگڑ گئیں، لوگ آپس میں لحاظ داری کو بھولنے لگے اور صرف اپنے ذاتی مفاد کے بارے میں سوچنے لگے خودغرضانہ سوچ فروغ پانے لگی۔ یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ بچے زیادہ ہونے کی وجہ سے والدین اپنے بچوں کو وقت نہ دے سکے، ان کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے جس کی وجہ سے وہ غلط راہ پر چل نکلے اور خود اپنی ضروریات ہر جائز اور ناجائز طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کی جس سے اپنے پرائے کا لحاظ ختم ہو گیا، اخلاقی معیار گرنے لگا، لہٰذا اخلاقی قدروں کی بحالی کے لیے بہت ضروری ہے کہ والدین اپنے عمل اور تربیت کے ذریعے ان کو اچھا انسان بنائیں اور اچھا انسان بنانے کے لیے بچوں کی تعداد کم ہونی چاہیے اور ان کی عمر میں مناسب وقفہ ہونا چاہیے۔

7- **ترقی یافتہ ممالک کی مثال:** ترقی یافتہ ممالک میں آبادی کو خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے کنٹرول کر کے اپنے وسائل کو بڑھایا گیا جس سے ترقی یافتہ ممالک اس قابل ہو گئے کہ وہ اپنے شہریوں کو اعلیٰ سہولتیں دے سکیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں عوام کا معیار زندگی بھی بلند ہے۔ لوگوں کو اچھی خوراک، لباس، تعلیم اور دوسری سہولتیں میسر ہیں اور وہ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی آبادی کو کنٹرول نہ کرتے تو شاید وہ اپنے مسائل پر قابو نہ پا سکتے۔ ہمیں بھی ترقی یافتہ ممالک کی طرح اپنے ملک کو معاشی طور پر خوشحال بنانے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنا چاہیے۔ اچھی مثال کی تقلید کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔

8- **بچت:** اگر خاندان کے افراد کی تعداد زیادہ ہو تو بچت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے بلکہ ہر ماہ قرض کی نوبت آ جاتی ہے اور اس طرح خاندان کے افراد کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا اثر ملکی معیشت پر بھی پڑتا ہے۔ اگر عوام بچت کریں گے تو ملکی سرمائے میں اضافہ ہو گا دوسری طرف حکومت کے سرمائے کی بھی بچت ہو گی کیونکہ آبادی کم ہونے کی وجہ سے حکومت کا خرچ بھی کم ہو گا لوگوں کی تعلیم، صحت اور دوسری ضروریات کے لیے عوام کے ساتھ ساتھ حکومت کو بھی سرمایہ لگانا پڑتا ہے لہٰذا خاندان چھوٹا ہونے کی وجہ سے خاندانی بچت کے ساتھ حکومت کی بھی بچت ہو گی حکومت اور عوام اس سرمائے کو ترقیاتی سکیموں پر خرچ کر سکیں گے۔

9- **خواتین میں خود اعتمادی کو فروغ :** ہمارے معاشرے میں خواتین کی اکثریت احساس کمتری کا شکار ہے اور اگر ذہنی طور پر معذور لوگوں کا سروے کیا جاتے تو اس میں خواتین کی اکثریت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان بڑا ہونے کی وجہ سے خواتین کو نظر انداز کیا جاتا ہے ان کو کھانے کے لیے اچھی خوراک نہیں دی جاتی بلکہ دیہاتوں میں تو انہیں بچے کھچے کھانے پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ ان کی صحت کی طرف بھی توجہ نہیں دی جاتی بلکہ وہ خود بھی اپنی پروا نہیں کرتیں اور مردوں کی ضروریات کا خیال رکھتی ہیں۔ لیکن اگر خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل کر کے خاندان چھوٹا ہو گا تو ایک فرد کی حیثیت سے خواتین کو اہمیت دی جائے گی اور ان کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ بڑھے گا جس کو وہ اپنی اولاد کو منتقل کر سکیں گی۔

خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف دلائل

1- **اسلام کے منافی :** خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف سب سے پرزور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہمارے مذہب میں اس کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ آبادی کی افزائش کو مصنوعی طریقوں سے روکنے کو قتل کے مترادف ٹھہرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رازق ہے وہ سب کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے "تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو تمہارا اور ان کا رزق ہمارے ذمہ ہے"۔ اس طرح ہمارے عوام کی اکثریت مصنوعی طریقوں اور ادویات کے استعمال کے حق میں نہیں ہے۔

2- **ملکی دفاع :** آج کل کے دور میں ملکی دفاع بھی بہت ضروری ہے کیونکہ ایٹمی ہتھیاروں کا دور ہے۔ پاکستان کے لیے دفاع کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے کیونکہ اس کو بھارت کی طرف سے ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ پاکستان آبادی کے لحاظ سے بھی ہندستان سے چھوٹا ہے گو کہ ہندوستان کی فوج بھی زیادہ ہے۔ ویسے تو ایٹمی دور ہے ہتھیاروں کو بہت اہمیت حاصل ہے لیکن افراد کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا' ان حالات میں آبادی کو کم کرنا کسی صورت بھی ٹھیک نہیں ہے۔

3- **افرادی قوت میں کمی :** خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے سے آبادی کم ہو جائے گی اور اس ملک کی افرادی قوت کم ہو گی جس سے ملک کی معیشت پر برا اثر پڑے گا۔ اگر

کسی ملک کی افرادی قوت کی مقدار زیادہ ہو اور وہ تربیت یافتہ بھی ہو تو وہ ملک قدرتی وسائل اور ملکی سرمائے کو بروئے کار لا کر معاشی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ افرادی قوت نہ صرف ملک کے اندر معاشی ترقی کے لیے محنت کرتی ہے بلکہ بیرون ملک جا کر بھی محنت کر کے ملک کے لیے بھاری زرمبادلہ حاصل کرتی ہے۔ پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی پر شہروں میں دیہات کی نسبت زیادہ عمل کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسے لوگ جو کہ دولت مند ہیں اور بچوں کی ضروریات آسانی سے پورا کر سکتے ہیں وہ ملک کو تربیت یافتہ افرادی قوت مہیا کر سکتے ہیں۔ بہرحال افرادی قوت میں اضافے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

4- اقتصادی خوشحالی: خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ملک معاشی طور پر خوشحال نہیں رہتا کیونکہ آبادی کم ہو جاتی ہے کام کرنے والے لوگ بھی کم ہو جاتے ہیں اور ملکی وسائل سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ہمارے ملک میں وسائل کی کمی نہیں ہے' ضرورت اس بات کی ہے کہ ان وسائل کو استعمال کیسے کیا جائے لہٰذا خاندان کو محدود کرنے کی بجائے محنت اور لگن سے کام کرنا چاہیے ملک میں غیر آباد زمین کو آباد کرنا چاہیے۔ معدنی وسائل سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔

5- سائنسی ترقی: آبادی میں اضافے کی وجہ سے لوگ مجبور ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے وسائل کو ترقی دینے کے بارے میں سوچتے ہیں تو نئی نئی دریافت ہوتیں ہیں۔ دنیا میں جتنی سائنسی ایجادات اور سائنسی ترقی ہوئی ہے آبادی میں اضافے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ جب آبادی تھوڑی تھی لوگ قریب قریب رہتے تھے ایک دوسرے کے پاس دور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی لیکن آبادی میں وسعت آ جانے کی وجہ سے لوگوں نے سفر کرنا شروع کیا اور جب فاصلے مزید بڑھے تو اس بات پر توجہ دی گئی کہ کس طرح پیدل سفر کا متبادل ڈھونڈا جائے اور آخر کار جب آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی مختلف ممالک وجود میں آ گئے تو فاصلے بڑھنے کی بجائے سمٹنے لگے' ہوائی جہاز' ٹیلی فون' ٹیلی ویژن اور فیکس مشین ایجاد ہو گئیں۔ آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے انسان چاند اور مریخ تک جا پہنچا تاکہ جب زمین پر گنجائش نہ رہے تو پھر کسی سیارے پر' اگر انسانی زندگی کے آثار ہیں تو وہاں رہنے کے بارے میں سوچا جائے غرضیکہ سائنسی ترقی اور ایجادات بھی آبادی میں اضافے کی مرہون

منت ہیں۔

6- **اخلاقی انتشار:** خاندانی منصوبہ بندی کے عام ہونے کی وجہ سے سب کو ان طریقوں کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے اور معاشرے میں جنسی بے راہ روی بڑھ جاتی ہے' دوسرے ممالک کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں پر آبادی کو کنٹرول کر لینا اور مضبوط معیشت قائم کر لینا ہمارے لیے ایک مثال ہے وہاں دوسری طرف اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جنسی بے راہ روی عام ہے۔ غیر شادی شدہ جوڑے زیادہ تر ان طریقوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اخلاقی قدریں تباہ برباد ہو گئی ہیں بلکہ اب یہ جنسی بے راہ روی بچوں میں عام ہونے لگی ہے۔ وہاں پر جنسی تعلیم دی جانے لگی ہے تاکہ اس جنسی بے راہ روی کا مقابلہ کیا جا سکے لیکن یہ سب کچھ ہمارے مذہبی نقطہ نظر سے جائز نہیں ہے۔ اس وجہ سے پاکستان میں اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے' بیشتر عرب ممالک نے بھی اس کر ممنوع قرار دیا ہے۔ اب تو مغربی ممالک جن میں سویڈن اور اٹلی بھی شامل ہیں نے بھی اس پر پابندی عائد کر دی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے دونوں پہلو دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس کے فوائد کے ساتھ ساتھ کچھ تاریک پہلو بھی ہیں لیکن اگر اس کو اچھے طریقے سے اپنایا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہمارے مذہب میں حمل گرانا تو قتل کے مترادف ہے اور بہت بڑا گناہ ہے لیکن پرہیز کرنا منع نہیں ہے۔ اکثر علمائے کرام نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ بھی اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو کنٹرول کرنا چاہیے۔ حکومت نے خاندانی منصوبہ بندی کو عام کرنے کے لیے کئی سیمینار اور ورکشاپیں منعقد کی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے لوگوں کو معلومات فراہم کی جا رہی ہیں' اشتہارات کے ذریعے اس کے فائدے اور نقصانات سے آگاہ کیا جا رہا ہے' خصوصی پروگرام بھی پیش کیے جا رہے ہیں' دیہاتوں اور شہروں میں ایسے سنٹر قائم کیے گئے ہیں جہاں پر مفت معلومات اور ادویات فراہم کی جاتی ہیں اور لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی اشیا کی قیمتیں بہت کم ہیں اور یہ نقصان دہ بھی نہیں ہیں۔ اب فیملی ہیلتھ ورکر خواتین کو بھرتی کیا جا رہا ہے جو گھر گھر جا کر خواتین سے رابطہ قائم کریں گی ایک سروے کے مطابق پچاس فیصد خواتین کو خاندانی منصوبہ بندی کی سہولتیں میسر ہیں۔ اکثر خواتین نے یہ شکایت کی کہ ان کے خاوند تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حکومت کی بھرپور کوشش ہے کہ پاکستانی مردوں کو اس

پر آمادہ کیا جائے۔ ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کی ایک الگ ڈویژن بھی قائم ہے، مرکز میں ایک کونسل اور صوبوں میں خاندانی منصوبہ بندی کے بورڈ قائم کیے گئے ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں حکومت کی کوششیں کافی حد تک بارآور ثابت ہوئیں ہیں۔ یہ پروگرام وسیع ہوتا جا رہا ہے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں اس کے حوصلہ افزا نتائج بر آمد ہوں گے۔

سوالات

1- پاکستان کا محل وقوع اور پاکستانیوں کی خصوصیات بیان کریں۔
2- پاکستان کی آبادی کی تشکیل و تقسیم کا جائزہ لیں۔
3- خاندانی منصوبہ بندی سے کیا مراد ہے اس کی موافقت اور مخالفت میں دلائل دیں۔
4- آبادی کے رجحانات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔
5- پاکستان میں آبادی میں اضافے کی وجوہات بیان کریں۔

باب سوم

آئینی ارتقاء 1947ء تا 1973ء

Costitutional Development (1947ء - 1973ء)

برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست کا ہمیشہ یہ نمایاں پہلو رہا ہے کہ انہوں نے اپنی الگ سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حیثیت کو برقرار رکھا۔ مسلمانوں نے انگریزوں سے قانونی اور دستوری تحفظات کا مطالبہ کیا اور انگریز مسلمانوں کو یہ تحفظات کبھی بھی مہیا نہ کر سکے۔ اس کے برعکس کانگرس پارٹی نے ہندوؤں کی تہذیب اور ثقافت مسلمانوں پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی تو مسلمانوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کر دیا۔ اس طرح قائداعظم محمد علی جناح کی غیرفانی کوششوں کی بدولت براعظم جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کا قیام 14 اگست 1947ء کو عمل میں آیا۔

آئین سازی کی تاریخ 1947ء تا 1956ء

History of Constitution making 1947ء - 56ء

آئین کسی ملک کے سیاسی ڈھانچے کی وضاحت کرتا ہے جس میں قانون سازی، اداروں کی تشکیل، اختیارات و فرائض، عدالتی نظام اور انتظامیہ کے بارے میں اصول اور ضابطے تحریر ہوتے ہیں۔ دستور ہر ملک کو باضابطہ چلانے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ پاکستان کو آزادی حاصل کرنے کے بعد بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے ایک مسئلہ دستور سازی کا تھا جس کو پاکستان نے عارضی طور پر 1935ء کے ایکٹ میں ضروری ترمیم کر کے عبوری آئین بنا کر حل کر لیا۔ چونکہ یہ مستقل حل نہ تھا اس لیے آئین سازی کا کام شروع کرنا پڑا۔ 11 اگست 1947ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی نے قائداعظم کو اسمبلی کا صدر چن لیا۔ اس اسمبلی نے دو کام کرنا تھے، ایک تو نئی قانون ساز اسمبلی کے قیام تک ملک کے لیے قوانین بنانے تھے اور دوسری طرف ملک کے لیے دستور بھی تیار کرنا تھا۔ شروع میں

اس کے ممبران کی تعداد 69 تھی' بعد میں اس کے ارکان کی تعداد میں کچھ ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی وجہ سے اضافہ ہو گیا اور یہ تعداد 79 ہو گئی۔ قائداعظم کی وفات کے بعد مولوی تمیزالدین اس اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے۔ اسمبلی میں حزب اختلاف کا وجود برائے نام تھا جبکہ مسلم لیگ مختلف دھڑوں میں تقسیم ہو گئی جس سے دستور بنانے کا عمل متاثر ہوا اور دستور سازی کا کام شروع سے ہی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ یہ بھی مشکل ہو گیا کہ وفاقی نظام ہونے کی صورت میں اختیارات کی تقسیم کس طرح کرنی چاہیے۔ پارلیمانی طرز حکومت ہونا چاہیے یا صدارتی' الیکشن کا طریقہ براہ راست ہونا چاہیے یا بالواسطہ' اسی طرح قومی زبان کے بارے میں بھی اختلاف پایا گیا۔

قرارداد مقاصد: وزیراعظم لیاقت علی خاں نے ایک قرارداد تیار کر کے 12 مارچ 1949ء کو اسمبلی میں پیش کی جس میں آئین بنانے کے لیے بنیادی اصولوں کا تعین کیا گیا۔ اسے قرارداد مقاصد کہا گیا' اس میں درج ذیل نکات شامل ہیں۔

1- پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اس لیے حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیر حاکم مطلق ہے۔

2- تمام اختیارات کا استعمال پاکستانی عوام کے نمائندے شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے امانت کے طور پر کریں گے۔

3- پاکستان ایک جمہوری ملک ہو گا جس کا دستور اسلامی ہو گا اور قرآن و سنت کو مدنظر رکھ کر بنایا جائے گا۔

4- مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔

5- سب شہریوں کو برابر سمجھا جائے گا۔

6- تمام عوام کو بنیادی حقوق حاصل ہوں گے۔ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ بھی کیا جائے گا اور انہیں اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

7- وہ علاقے جو اب پاکستان میں شامل ہیں یا جو آئندہ پاکستان میں شامل ہوں گے ایک وفاق بنائیں گے جس کے ارکان یعنی صوبے خودمختار ہوں گے لیکن یہاں اتحاد اور مفادات کا خیال رکھا جائے گا۔

8- ملک کے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں گے۔

9- ملک میں آزاد عدلیہ قائم کی جائے گی تاکہ پاکستانی خوشحال زندگی بسر کر سکیں

اقوام عالم میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور ساتھ ہی عالمی دنیا میں قیام امن اور انسانی فلاح و بہبود میں اضافہ کر سکیں۔

یہ قرارداد مغربی اور اسلامی جمہوری اقدار کے امتزاج کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کے ساتھ اقلیتوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا۔ قرارداد مقاصد پاکستان میں ہونے والی دستور سازی میں بنیاد کا کام دیتی رہی۔ قرارداد مقاصد کو تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا، علمائے کرام کو قرارداد میں جمہوریت اور غیر مسلموں کے حقوق کے بارے میں اعتراض تھا دوسری طرف اقلیتوں میں بے چینی پائی جا رہی تھی لیکن لیاقت علی خاں نے کہا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں اس لیے قرارداد کو اسلام کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا بالآخر قرارداد کو اکثریت نے منظور کر لیا۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی : قرارداد کی منظوری کے بعد بنیادی اصولوں کی کمیٹی مقرر کی گئی جس کا مقصد آئین کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ کمیٹی نے اپنی پہلی رپورٹ 28 ستمبر 1950ء کو پیش کی۔ 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خاں کو شہید کر دیا گیا اور خواجہ ناظم الدین نئے وزیراعظم بنے جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا لہٰذا انہوں نے 22 دسمبر 1952ء کو اسمبلی میں دوسری رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ کی اشاعت سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تلخیاں پیدا ہو گئیں، آئین سازی کا کام رک گیا آخر کار گورنر جنرل ملک غلام محمد نے 16 اپریل 1953ء میں خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر کے محمد علی بوگرہ جو اس وقت امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے، کو واپس بلا کر وزیراعظم نامزد کر دیا۔

محمد علی بوگرہ فارمولا : محمد علی بوگرہ نے حالات کو بہتر بنانے کے لیے 1953ء میں ایک فارمولا تیار کیا جس کو محمد علی بوگرہ فارمولا کہا جاتا ہے۔ جس کی رو سے مرکزی پالیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہو گی۔ ایوان زیریں میں کل 300 نشستیں ہوں گی جو آبادی کی بنیاد پر صوبوں میں تقسیم ہوں گی۔ مشرقی پاکستان کو 165 نشستیں اور مغربی پاکستان کی تمام اکائیوں کو 135 نشستیں دی جائیں گی۔ ایوان بالا کے 50 ارکان ہوں گے یعنی ہر صوبے سے دس ارکان لئے جائیں گے۔ سپریم کورٹ کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ کسی بھی پاس کردہ قانون کے بارے میں فیصلہ کر سکے کہ وہ قرآن و سنت کے منافی تو نہیں۔ اہم امور پر قانون سازی دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں ہو گی۔ اگر صدر مشرقی پاکستانی سے ہو تو وزیراعظم مغربی پاکستانی سے ہو گا یا پھر اس کے برعکس ہو گا۔ صدر کو دونوں ایوان اپنے مشترکہ اجلاس میں پانچ سال کے لئے چنیں گے۔ ملک میں اردو اور بنگالی سرکاری زبانیں ہوں گی۔

البتہ پہلے بیس سال کے لئے سرکاری زبان کے طور پر انگریزی کا نفاذ رہے گا۔ یہ فارمولا کامیاب نہ ہو سکا بلکہ پہلے آئین کی تیاری شروع ہو گئی۔25 اکتوبر 1954ء کو آئین نافذ ہونا تھا کہ 24 اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔

وحدت مغربی پاکستان : نئی اسمبلی جولائی 1955ء میں بنی۔ چوہدری محمد علی نے مشرقی پاکستان کے متحدہ محاذ کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت قائم کی۔ حزب اختلاف کا کردار عوامی لیگ نے ادا کیا۔ اسمبلی نے وحدت مغربی پاکستان کا بل منظور کر کے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ایک صوبے میں مدغم کر کے ایک صوبہ اور مشرقی پاکستان کو دوسرا صوبہ بنا دیا۔ اس طرح 14 اکتوبر 1955ء میں مغربی پاکستان ون یونٹ کی صورت میں ایک صوبہ بن گیا اب اسمبلی کے لیے اہم کام آئین بنانا تھا جو اس نے تیزی سے کرنا شروع کر دیا اور پہلے سے بنے ہوئے آئین سے بھی استفادہ حاصل کیا اور بحث مباحثے کے بعد 29 فروری 1956ء کو آئین منظور کر لیا گیا اور گورنر جنرل سکندر مرزا سے 2 مارچ 1956ء کو منظوری لے کر 23 مارچ 1956ء میں ملک کا پہلا آئین نافذ کر دیا گیا۔

1956ء کے آئین کی خصوصیات

Salient features of the Constitution 1956

1- تحریری آئین : 1956ء کا آئین تحریری آئین تھا یہ 234 دفعات پر مشتمل تھا۔ اس میں قرارداد مقاصد اور چھ گوشوارے بھی تھے۔ یہ طویل آئین نہیں تھا۔

2- لچک دار آئین : یہ آئین لچک دار تھا اس میں آسانی کے ساتھ ترمیم کی جا سکتی تھی پارلیمنٹ کے کل ارکان کی دو تہائی اکثریت اس میں ترمیم کر سکتی تھی جس کی توثیق صدر کرتا تھا یہ حالات کے ساتھ ڈھلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

3- وفاقی آئین : 1956ء کا آئین وفاقی آئین تھا۔ وفاق کے دو صوبے تھے ایک مغربی پاکستان اور دوسرا مشرقی پاکستان۔ دونوں کی حیثیت مساوی تھی، مرکز اور دونوں صوبوں کے درمیان اختیارات کو تین فہرستوں میں تقسیم کیا گیا ایک فہرست میں مرکزی حکومت کے اختیارات، دوسری فہرست میں صوبوں کے اختیارات اور تیسری فہرست مشترکہ اختیارات کی

فہرست تھی جس میں شامل امور پر دونوں حکومتوں کو قانون بنانے کا اختیار حاصل تھا لیکن اگر کسی معاملے پر دونوں حکومتیں قانون بنا لیں تو مرکزی قانون حاوی ہو گا۔

4- **پارلیمانی نظام حکومت** : اس آئین کے تحت ملک میں پارلیمانی نظام حکومت رائج کیا گیا۔ سربراہ ریاست صدر اور سربراہ حکومت وزیراعظم تھا۔ صدر برائے نام اختیارات کا مالک تھا اصل اختیارات وزیراعظم کو حاصل تھے وزیراعظم اپنی کابینہ کو چننے کا اختیار رکھتا تھا۔ وزیراعظم اور اس کی کابینہ قومی اسمبلی کے سامنے جوابدہ تھی انتظامی امور کے سلسلے میں صدر کو باخبر رکھنا بھی وزیراعظم کی ذمہ داری تھی صدر کو قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں مل کر منتخب کرتیں تھیں۔ صدر پانچ سال تک اپنے عہدے پر کام کر سکتا تھا صدر کو قومی اسمبلی دو تہائی اکثریت سے مواخذہ کے ذریعے برطرف کر سکتی تھی۔ اس کے کے لیے لازمی تھا کہ اس پر ایک چوتھائی ارکان قومی اسمبلی کے دستخط ہوں۔ قومی اسمبلی کی اکثریت وزیراعظم اور اس کی کابینہ کے خلاف بھی تحریک عدم اعتماد پاس کر سکتی تھی۔

5- **یک ایوانی مقننہ** : قانون ساز ادارہ ایک ایوان پر مشتمل تھا جس کی مدت 5 سال تھی۔ اس کے ممبران کی تعداد 300 تھی۔ 150 مشرقی پاکستان اور 150 ہی مغربی پاکستان سے تھے عورتوں کے لیے 10 سیٹیں مخصوص تھیں جس میں پانچ خواتین مشرقی پاکستان اور پانچ خواتین مغربی پاکستان سے تھیں۔

6- **اسلامی دفعات** : آئین کی رو سے پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔ صدر کے لیے مسلمان ہونا ضروری تھا۔ آئین کے آغاز میں قرارداد مقاصد کو شامل کیا گیا جس کی رو سے ملک میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہو گی اور اختیارات کو عوامی نمائندے امانت کے طور پر قرآن و سنت کے مطابق استعمال کریں گے۔ پاکستانی عوام کو ایسے مواقع فراہم کیے جائیں گے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں یہ سب اس لیے کرنا ضروری تھا کیونکہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور مسلمانوں نے جان و مال کی قربانیاں دے کر یہ ملک صرف اسی لیے حاصل کیا تھا کہ وہاں پر اپنے مذہب کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔

7- **بنیادی حقوق** : اس آئین کے تحت طے پایا کہ تمام شہریوں کو بہتر زندگی گزارنے کے لیے بنیادی حقوق دیے جائیں گے تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوں گے تمام شہریوں کو معاشرتی، معاشی اور سیاسی حقوق عطا کیے جائیں گے۔ کسی شہری کو بلاجواز گرفتار نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کو گرفتار کر لیا جائے تو اسے اپنی صفائی دینے کے مواقع فراہم کیے

جائیں گے ان حقوق کو عدالتی تحفظ بھی دیا گیا اور عدالتوں کو حقوق کے نفاذ کے لیے اختیارات بھی دیے گے۔ قانون ساز ادارے کے ایسے قوانین کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا تھا جس سے شہریوں کے بنیادی حقوق متاثر ہوتے ہیں۔

8- **آزاد عدلیہ** : 1956ء کے آئین کے تحت عدلیہ کو آزاد رکھا گیا۔ اعلیٰ ترین عدالت سپریم کورٹ ہو گی۔ دونوں حصوں میں دو ہائی کورٹس (High Courts) قائم کی جائیں گی۔ چیف جسٹس اور ججوں کا تقرر صدر مملکت کریں گے ججوں کو ملازمت کا تحفظ دیا گیا۔ ان کو ان کے عہدے سے برطرف نہیں کیا جا سکتا۔ قومی اسمبلی کو کسی جج کے خلاف مواخذہ کی تحریک پاس کرنے کا اختیار دو تہائی اکثریت سے دیا گیا جس کی توثیق صدر مملکت نے کرنا تھی۔

9- **اکہری شہریت**: اس آئین کے تحت تمام شہریوں کو صرف مرکز کی شہریت حاصل ہو گی یعنی تمام شہری صرف پاکستانی کہلائیں گے۔ وفاقی ملکوں میں شہری دو طرح کی شہریت رکھتے ہیں ایک مرکزی حکومت کی شہریت اور دوسری اکائیوں کی حکومت کی شہریت امریکہ میں دوہری شہریت کا اصول کار فرما ہے جبکہ پاکستان میں اکہری اکثریت ہے۔

10- **صوبائی حکومتیں**: اس آئین کے تحت دو صوبائی حکومتیں وجود میں آئیں ایک مشرقی پاکستان اور دوسری مغربی پاکستان کی۔ صوبائی حکومتوں کا نظام بھی پارلیمانی تھا جس میں گورنر صوبے کا سربراہ اور وزیر اعلیٰ صوبائی حکومت کا سربراہ تھا۔ گورنر کا تقرر صدر پاکستان کرتا تھا جبکہ وزیر اعلیٰ کو صوبائی اسمبلی اعتماد کا ووٹ دیتی تھی۔ ہر اسمبلی کے ممبران کی تعداد 300 تھی ان میں دس دس نشستیں خواتین کے لیے مختص تھیں۔ صوبائی اسمبلیاں اپنی فہرست میں شامل امور کے بارے میں قانون سازی کریں گی اور پھر گورنر سے منظوری حاصل کرنا ہو گی اگر گورنر ایک مرتبہ بل کی منظوری نہ دے اسمبلی اس پر نظرثانی کر کے اگر دوبار دو تہائی اکثریت سے پاس کر لے تو گورنر کو لازماً منظوری دینا ہو گی۔ صوبوں میں لوگوں کو عدل و انصاف مہیا کرنے کے لیے ہائی کورٹس قائم ہوں گی لیکن وہ مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گی۔ ہائی کورٹ کے ججوں (Judges) کا تقرر صدر مملکت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور متعلقہ صوبے کے گورنر کے مشورے سے کریں گے۔

11- **آئینی ادارے** : 1956ء کے آئین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے تحت مختلف آئینی ادارے قائم کیے گئے جن میں ادارہ تحقیقات اسلامی اور اسلامی نظریاتی کونسل،

بین الصوبائی کونسل، قومی معاشی کونسل، پبلک سروس کمیشن اور آڈیٹر جنرل وغیرہ شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنی اپنی سطح پر اپنے سپرد کی گئی ذمہ داریوں کو پورا کرنا تھا۔ اسلام نظریاتی کونسل کے ممبران کا تقرر صدر مملکت نے کرنا تھا۔ اس ادارے کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ میں مدد دے۔ ملک میں کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہ بننے دے اور ایسی سفارشات مرتب کرے جس سے موجودہ قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ بین الصوبائی کونسل نے ان موضوعات کی تحقیق کرنا تھی جس میں ایک یا دونوں صوبوں کا مفاد وابستہ ہو۔ قومی معاشی کونسل نے ملک کی مجموعی معاشی حالات کا جائزہ لینا تھا۔ پبلک سروس کمیشن نے نئی بھرتیاں کرنا تھیں۔ آڈیٹر جنرل نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مالیات حساب کتاب سے متعلق ہدایات اور احکامات جاری کرنا تھے۔ گزشتہ سال کے آمدنی و اخراجات سے متعلق گوشواروں کی چھان بین کر کے سالانہ رپورٹ تیار کرنا تھی۔

12- **قومی زبانیں:** 1956ء کے آئین کے تحت اردو اور بنگالی کو قومی زبانیں قرار دیا گیا تاکہ دونوں حصے مطمئن رہیں کیونکہ مشرقی پاکستان والوں کو اعتراض تھا کہ ان کی آبادی زیادہ ہے اور زبان بنگالی ہے اس لیے بنگالی کو قومی زبان ہونا چاہیے البتہ انگریزی زبان کو 25 سال تک دفتری زبان کے طور پر قائم رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

13- **1956ء کے آئین کی تنسیخ اور مارشل لا:** 1956ء کا آئین جو قریباً" ساڑھے آٹھ سال بعد تیار کیا گیا تھا کو زیادہ عرصہ چلنے نہیں دیا گیا جن عوامل کے باعث آئین بننے میں تاخیر ہوئی قریباً" وہی عوامل اسی کی ناکامی کا باعث بنے آئین صرف دو سال کام کر سکا کیونکہ اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ آئین پارلیمانی تھا جبکہ قائدین کے ذہن آمرانہ تھے عوام سیاسی طور پر باشعور نہیں تھے۔ سیاسی جماعتیں نہ خود منظم تھیں اور نہ ہی عوام کو منظم کر سکیں سیاسی جماعتوں کا عوام سے رابطہ نہیں تھا۔ بلکہ سیاستدان کرسی کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ جس نے بے مثال کردار ادا کر کے پاکستان حاصل کیا تھا اب مختلف حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے بعد قیادت میں بھی خلا آ گیا ایسے لوگ اقتدار میں آئے جو ملکی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دے رہے تھے کوئی بھی ایسا لیڈر موجود نہ تھا جسے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ الیکشن بھی منعقد نہ کروائے اگر الیکشن ہوتے تو عوام کی رائے سامنے آتی تو شاید حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے حکومتیں اس طرح سے نہ ٹوٹتیں ایک وزارت تو صرف 54 دن کام کر سکی ملک

میں سیاسی انتشار پیدا ہو گیا- انتخابات کروانے کے مطالبات کیے جانے لگے جبکہ طریقہ انتخاب طے نہیں ہو رہا تھا بہرحال ملک میں انتخاب کروانے کا اعلان کر دیا گیا لیکن صدر سکندر مرزا کو یہ خطرہ تھا کہ اگر انتخابات کے نتائج اس کی مرضی کے خلاف ہوئے تو اسے اقتدار سے محروم ہونا پڑے گا لہٰذا اس نے 8 اکتوبر 1958ء کو ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا- 27 اکتوبر 1958ء کو صدر سکندر مرزا کی صدارت ختم کر کے اسے جلاوطن کر دیا گیا اب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ایوب خاں (مرحوم) نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا- 1956ء کے آئین کو منسوخ کر دیا' پارلیمنٹ اور کابینہ توڑ دی' تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دے دی گئیں-

صدر ایواب خاں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ جمہوریت بحال کریں گے اس لیے انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کیا جس کے تحت 1959ء میں اسی ہزار ممبران کا چناؤ ہوا- جنہوں نے بالواسطہ طریقے سے جنرل ایوب خاں کو پانچ سال کے لیے صدر چن لیا- 17 فروری 1960ء کو صدر ایوب خاں نے ایک آئینی کمیشن قائم کیا جس کے سربراہ جسٹس شہاب الدین تھے- کمیشن کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا لہٰذا اس نے فوری طور پر کام شروع کر دیا- اپریل 1960ء میں آئینی مسائل اور دستور سے متعلقہ ایک سوالنامہ جاری کیا گیا تاکہ عوام کے رجحانات معلوم کیے جا سکیں- کمیشن کے ارکان نے خود بھی ملک کا دورہ اور ان افراد سے ملاقاتیں کیں جو سیاسی طور پر باشعور اور آئینی مسائل کو سمجھتے تھے- اس کے بعد انہوں نے سفارشات مرتب کیں لیکن صدر ایوب خاں نے ان سفارشات کو نظرانداز کر کے اپنی مرضی سے آئین بنا کر یکم مارچ 1962ء کو ملک میں نافذ کر دیا جسے فرد واحد کا بنایا ہوا آئین کہا جاتا ہے-

1962ء کے آئین کی خصوصیات

Salient features of the Costitution 1962

1- تحریری آئین : 1962ء میں بننے والا آئین بھی 1956ء کے آئین کی طرح تحریری آئین تھا- اس کی 250 دفعات اور پانچ گوشوارے تھے- 1956ء کے آئین سے 1962ء کا آئین ذرا طویل تھا- بعد میں ہونے والی ترامیم اور دستور سے قبل جاری ہونے والے صدارتی احکامات کو بھی دستور میں شامل کر لیا گیا-

2- وفاقی آئین : 1962ء کا آئین بھی وفاقی آئین تھا ملک میں ایک مرکزی حکومت اور دو صوبائی حکومتیں تھیں آئین میں دونوں اکائیوں یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان کو مساوی نمائندگی دی گئی- وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں میں اختیارات کی تقسیم ایک فہرست کے ذریعے کی گئی- ایک فہرست مرکزی حکومت کے اختیارات کے بارے میں تھی جبکہ باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو دیے گئے- مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تشریح کا اختیار عدالت کی بجائے صدر اور پارلیمنٹ کو دیا گیا- اس طرح مرکز کو برتری دی گئی- مرکزیت کے اسی رجحان کی وجہ سے مشرقی پاکستان نے صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا جس نے علیحدگی کے رجحان کو جنم دیا اور 1971ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا-

3- نیم استوار آئین : اس آئین کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ یہ 1956ء کے آئین کے مقابلے میں قدرے استوار تھا- اس میں ترمیم کرنا نہ تو اتنا آسان تھا کہ اس کو لچکدار کہا جا سکے اور نہ اس قدر مشکل کہ ترمیم کرنا ہی مشکل ہو جائے اور استوار آئین کہلائے اس آئین کے تحت قومی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت آئین میں ترمیم کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے صدر کی منظوری لازمی ہے- اگر صدر منظوری نہ دے تو قومی اسمبلی کی تین چوتھائی اکثریت کو دوبارہ ترمیم پاس کرنا ہو گی اور اگر ایسا ہو جائے تو صدر دس دن کے اندر منظور کرے اور اگر منظور نہ کرے تو بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار ممبران سے ریفرنڈم کے ذریعے رائے حاصل کرے گا اور اگر رزلٹ ترمیم کے حق میں ہو گا تو ترمیم ہو گی ورنہ نہیں-

4- یک ایوانی مقننہ : وفاقی نظام حکومت میں دو ایوانی مقننہ کام کرتی ہے ایک ایوان میں آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جاتی ہے جبکہ دوسرے ایوان میں وفاقی اکائیوں کو مساوی حیثیت حاصل ہوتی ہے لیکن 1962ء کے آئین میں 1956ء کے آئین کی طرح ایک ایوان پر مشتمل مقننہ قائم کی گئی جسے قومی اسمبلی کا نام دیا گیا جس کو بالواسطہ انتخاب کے ذریعے پانچ سال کے لیے منتخب ہونا تھا-

5- صدارتی طرز حکومت : 1956ء کے آئین کے برعکس اس میں صدارتی طرز حکومت قائم کیا گیا- سربراہ ریاست اور سربراہ حکومت صدر تھا جسے بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار اراکین نے پانچ سال کے لیے منتخب کرنا تھا صدر کسی کے سامنے جوابدہ نہیں تھا- اس کے وزراء اس کے سامنے جوابدہ تھے' وزراء کے لیے قانون ساز ادارے کا رکن نہ تھا

لازمی نہیں تھا لیکن انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ مقننہ کے اجلاس میں شرکت کریں اور قانون سازی کو کنٹرول کریں۔ گو کہ انہیں ووٹ ڈالنے کا حق نہیں دیا گیا اس طرح صدر اپنے وزراء کے ذریعے مقننہ کی کارروائی سے باخبر رہتا۔ اس کے علاوہ اس کو اسمبلی کے قوانین کو رد کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔

6- **آزاد عدلیہ** : 1962ء کے آئین میں بھی عدلیہ کی آزادی کو برقرار رکھا گیا۔ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کا تقرر صدر مملکت کرتا لیکن وہ انہیں برطرف نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے اعلیٰ عدالتی کونسل قائم کی گئی جو ججوں کے خلاف مواخذہ کی تحریک چلا سکتی تھی اور پھر اگر تحریک کامیاب ہو جائے تو صدر نے اس رپورٹ کی بنا پر برطرفی کے احکامات جاری کر سکتا ہے۔

7- **طریقہ انتخاب** : اس آئین میں طریقہ انتخاب طے کر لیا گیا جو کہ بالواسطہ طریقہ تھا۔ صدر قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کا چناؤ عوام نے نہیں بلکہ انتخابی ادارے نے کرنا تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے انتخابی ادارے کے طور پر کام کرنا تھا۔ الیکشن کمیشن قائم کیا گیا جس نے ملک میں پانچ سال بعد انتخابات کروانے تھے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کرنا تھا۔

8- **رہنما اصول** : 1962ء کے آئین میں بھی رہنما اصول بنائے گے جس نے قانون سازی میں حکومت کی رہنمائی کرنا تھی قانون ساز اسمبلیوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ پالیسی بناتے وقت ان اصولوں کو مدنظر رکھیں۔ ان میں واضح کیا گیا کہ کوئی قانون اسلام کے منافی نہیں ہو گا۔ عوام کا معیار زندگی بلند کیا جائے گا۔ پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اسلامی نظریات کی مشاورتی کونسل، قومی اقتصادی کونسل اور قومی مالیاتی کمیشن قائم کیا جائے۔ تمام ملکوں خصوصاً اسلامی ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں گے۔

9- **بنیادی حقوق** : جب آئین بنا تو اس وقت بنیادی حقوق کو نظرانداز کر دیا لیکن عوام کے پرزور مطالبے پر آئین پہلی ترمیم کے ذریعے بنیادی حقوق کو آئین میں شامل کر لیا گیا بلکہ ان کے تحفظ کی ضمانت بھی دی گئی۔ عدلیہ کو ان کے تحفظ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ واضح کر دیا گیا کہ کوئی ادارہ بنیادی حقوق کے منافی کارروائی نہیں کر سکتا تمام شہریوں کو مساوی طور پر معاشرتی، معاشی اور ۔ ی حقوق دیے گئے۔

10- اسلامی دفعات:
1962ء کے آئین میں قرار داد مقاصد کو تمہید میں شامل کیا گیا یہ واضح کر دیا گیا کہ ملک میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہو گی اور عوامی نمائندے اقتدار کو امانت کے طور پر شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے۔ ملک کا نام گو کہ پہلے صرف "جمہوریہ پاکستان" رکھا گیا لیکن عوام کے مطالبے پر آئین میں ترمیم کر کے "اسلامی جمہوریہ پاکستان" رکھا گیا۔ ملک کے سربراہ کے لیے لازمی تھا کہ وہ مسلمان ہو۔ آئین میں یہ بھی درج کیا گیا کہ ملک میں اسلامی تعلیمات کے خلاف قانون سازی نہیں ہو گی اسلامی تعلیمات پر زور دیا جائے گا۔

11- صوبائی نظام حکومت: صوبوں میں گورنر صوبے کا سربراہ تھا صوبوں کے گورنروں کی تقرری صدر کرتا تھا وہی انہیں برطرف کرنے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔ گورنر انتظامی امور میں مدد کے لیے اپنی کابینہ بناتا تھا جس میں وہ صدر کی خوشنودی کا خیال بھی رکھتا تھا۔ دراصل صدارتی نظام حکومت کی وجہ سے انتظامیہ کو مقننہ کی نسبت زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ گورنر صوبائی ادارے کے اجلاس میں شرکت کرنے کا حق حاصل تھا گوکہ وہ رائے شماری کے وقت ووٹ نہیں ڈال سکتے تھے۔

12- قومی زبانیں: 1962ء کے آئین میں بھی دو قومی زبانیں تھیں ایک اردو اور دوسری بنگالی لیکن انگریزی زبان کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ بدستور سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہے گی۔

1962ء کے آئین کی ناکامی

صدر ایوب خاں نے 1958ء میں حکومت سنبھالی اور دس سال تک حکومت کی۔ ملک نے ان دس سالوں میں کافی ترقی کی لیکن ان کی حکومت کو عوام کا اعتماد نہ حاصل ہو سکا عوام کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔

جمہوری دور میں آمریت زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی تھی لہٰذا عوام نے ملک گیر تحریک چلائی۔ لوگ صدر ایوب خاں کے خلاف مظاہرے کرنے لگے ان کی پالیسیوں پر کھلے عام تنقید ہونے لگی اس صورت حال کو قابو میں کرنے کے لیے صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے گول میز کانفرنس بلائی لیکن اس میں

چونکہ تمام نمائندے شریک نہ ہوئے لہٰذا 26 فروری 1969ء کو ہونے والی کانفرنس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ اس کا اگلا اجلاس 10 مارچ کو ہو گا لہٰذا مقررہ تاریخ کو گول میز کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا اور مذاکرات تین دن تک جاری رہے اور طے پایا کہ آئندہ ملک میں صدارتی نظام کی بجائے پارلیمانی نظام رائج کیا جائے گا اور ملک میں براہ راست طریقہ انتخاب کے تحت بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کروائے جائیں گے مگر مجیب الرحمٰن کانفرنس میں اپنے چھ نکات منوانا چاہتے تھے ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ملک بھر میں لاقانونیت پھیل گئی ہڑتالیں اور مار دھاڑ جاری رہی آخر 25 مارچ 1969ء کو صدر ایوب نے اقتدار چھوڑ دیا اور ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ بری فوج کے کمانڈرانچیف جنرل آغا محمد یحیٰی خاں نے حکومت سنبھال لی اور 1962ء کا آئین ختم کر دیا اس کی ناکامی کی وجوہات مندرجہ ذیل تھیں۔

1- **فرد واحد کا بنا ہوا آئین:** اس آئین کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آئین نہ تو پارلیمنٹ نے بنایا تھا اور نہ ہی عوام کی رائے معلوم کی بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ آئین سازی کے لیے جو کمیشن قائم کیا تھا اس کی سفارشات کو بھی نظرانداز کر دیا گیا اور فرد واحد نے اپنی مرضی کو آئین کی صورت میں پوری قوم پر مسلط کر دیا۔ اس لیے حکومت کے خاتمے کے ساتھ آئین بھی ختم ہو گیا۔

2- **صدارتی نظام:** ملک میں صدارتی نظام حکومت کی وجہ سے تمام تر اختیارات صدر کے پاس تھے۔ صدارتی نظام میں مقننہ اور انتظامیہ الگ الگ ہوتیں ہیں لیکن 1962ء کے آئین کے تحت عملی طور پر علیحدگی نہ رکھی گئی وزرا کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کی اجازت تھی وہ بل پیش کروا سکتے تھے' بحث میں حصہ لیتے تھے حکومت کے موقف کی حمایت کی جاتی تھی صرف ووٹ نہیں دے سکتے تھے جبکہ قومی اسمبلی' صدر اور اس کی کابینہ کا احتساب نہیں کر سکتی تھی اس کی وجہ سے حکومت کے دونوں شعبوں پر صدر کو برتری حاصل ہو گئی۔

3- **بالواسطہ انتخاب:** بالواسطہ طریقہ انتخاب بھی آئین کی ناکامی کا سبب بنا۔ آئین کے تحت صدر' قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے نمائندوں کا انتخاب عوام کی بجائے انتخابی ادارے نے کرنا تھا۔ انتخابی ادارے کے اراکین کی تعداد اسی ہزار تھی۔ جس کو عوام منتخب کرتی تھی۔ یہ طریقہ اس لیے اپنایا گیا تاکہ انتخابات کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق ہو کیونکہ

انتخابی ادارے کی تعداد عام ووٹروں کی نسبت بہت کم تھی اس لیے انہیں لالچ دینا یا ان پر دباؤ ڈالنا آسان تھا۔ صدر ایوب کے جیتنے سے یہ بات ثابت ہو گئی اور عوام حکومت سے نفرت کرنے لگے کیونکہ وہ محترمہ فاطمہ جناح کو حکومت میں لانا چاہتے تھے۔ عوام کا خیال تھا کہ صدر ایوب کی حکومت کو ختم کرنے کا احتجاج کے سوا اب کوئی راستہ نہیں تھا۔

4- **"اسلامی نظریہ سے انحراف"** : پاکستان اسلامی نظریاتی ریاست ہے ایوب خاں نے اس چیز کو نظرانداز کرتے ہوئے ملک کا نام "جمہوریہ پاکستان" رکھ دیا اور ساتھ ہی عوام کو بنیادی حقوق عطا نہ کیے حالانکہ اسلام نے حقوق کا تصور سب سے پہلے دیا ہے۔ گو کہ ترامیم کے ذریعے حقوق عوام کو دیے گئے اور ملک کا نام بھی "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کر دیا گیا۔ لیکن عوام پر ان باتوں کا گہرا اثر ہوا اور بعد میں ہونے والے واقعات جس میں عائلی قوانین اور عام قانون سازی شامل تھی۔ عوام اسی تناظر سے دیکھتے رہے کہ حکومت نے اسلام کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی اس وجہ سے عوام حکومت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔

5- **بنیادی جمہوریت کا نظام** : 1962ء کے آئین کے تحت بنیادی جمہوریتوں کا تصور متعارف کروایا گیا۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام اگرچہ جمہوری اقدار کا آئینہ دار تھا لیکن ملک میں صدارتی نظام ہونے کی وجہ سے اس میں آمرانہ رنگ نمایاں رہا۔ اس کے علاوہ بنیادی جمہوریتوں کے جو نمائندے مقرر ہوئے تھے ان انتخابی ادارے کی حیثیت دے دی گئی۔ انہوں نے صدر، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کو چنا اس سے ملک میں بددیانتی اور رشوت خوری عام ہو گئی۔ قومی نمائندے عوام کی بجائے صدر کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

6- **جنگ ستمبر 1965ء اور معاہدہ تاشقند** : 6 ستمبر 1965ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جو جنگ شروع ہوئی وہ پاکستان نے جیت لی۔ پاکستان نے اپنے وسائل کم ہونے کے باوجود بہت سارے ہندوستانی علاقے فتح کر لیے لیکن ہندوستان کے ساتھ تاشقند میں ایک معاہدہ کر لیا گیا جس کے تحت دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیے اور آئندہ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا وعدہ کر لیا جس سے پاکستانی عوام میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے ایوب کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

7- **معاشی عدم استحکام** : صدر ایوب خان کے دور میں نجی صنعت کاری نے بہت ترقی

حاصل کر لی۔ سرمایہ کاروں نے مزدوروں کے ساتھ اچھے رویے کا مظاہرہ نہ کیا جس سے مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان فاصلے بڑھ گئے۔ ملکی سرمایہ صرف بائیس خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گیا جبکہ عوام کی اکثریت غریب تھی۔ دوسرا گندھارا انڈسٹریز میں صدر ایوب کے بیٹوں کی حصہ داری سے لوگوں کو یہ تاثر ملا کہ شاید صدر کا خاندان سرمایہ داروں کی آڑ میں پیسہ اکٹھا کر رہا ہے جس سے عوام حکومت کے خلاف ہو گئے اور بالآخر حکومت کو جھکنا پڑا اور آئین ناکام ہو گیا۔

8- **یک ایوانی مقننہ** : 1962ء کے آئین میں بھی مقننہ یک ایوانی تھی جبکہ ملک کا نظام وفاقی تھا۔ وفاقی نظام کو کامیاب بنانے کے لیے دو ایوانی مقننہ کا ہونا لازمی امر ہے جس سے صوبے مطمئن رہتے ہیں کیونکہ ایوان زیریں میں نمائندگی آبادی کے تناسب سے اور ایوان بالا میں مساوی نمائندگی دی جاتی ہے۔ جب 1962ء کے آئین میں مقننہ میں دونوں صوبوں کو مساوی نمائندگی دی گئی جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان والے مطمئن نہ تھے ان کا کہنا تھا ہماری آبادی زیادہ ہے اس لیے ہماری حق تلفی ہو رہی ہے۔

9- **صوبائی نظام** : 1962ء کے آئین کے تحت اگرچہ وفاقی نظام حکومت تھا لیکن صوبوں کو صوبائی خود مختاری حاصل نہیں تھی صدارتی نظام کی وجہ سے وفاق کی حیثیت بھی وحدانی جیسی ہو گئی صدر صوبائی گورنروں اور ان کی کابینہ کا تقرر کرتا۔ جب تک وہ صدر کو خوش رکھتے اپنے عہدے پر کام کرتے رہتے ورنہ برطرف کر دیے جاتے۔ اس طرح صوبوں میں بھی صدر کی مرضی کے مطابق قانون سازی ہوتی جو وفاقی نظام کے خلاف تھا۔ اس سے صوبوں میں بے چینی پیدا ہو گئی جو آئین کی ناکامی کا سبب بنی۔

1970ء کے الیکشن اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی

The Elections 1970 and separation of East Pakistan

1969ء میں یحییٰ خاں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اعلان کیا کہ موجودہ حالات کو بہتر بنانے کے لیے ملک میں عام انتخابات کروائے جائیں اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا انتخابات پہلے اکتوبر 1970ء میں ہونا قرار پائے لیکن مشرقی پاکستان میں سیلابوں کی وجہ سے تاریخ بڑھا کر 7 دسمبر کر دی گئی۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 20 دسمبر کو کروانے کا فیصلہ کیا گیا مقررہ تاریخوں پر ملک میں انتخابات کرا دیے گئے۔ عوام نے

پرانے لیڈروں کی جگہ نئے ابھرنے والے لیڈروں کے حق میں فیصلہ دیا یعنی مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے زبردست کامیابی حاصل کی اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ عوامی لیگ نے 169 سیٹوں میں سے 160 سیٹیں جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی نے 144 سیٹوں میں سے 88 سیٹیں حاصل کیں۔ جنرل یحییٰ خاں نے دونوں جماعتوں کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو کہ انتخابی مہم کے دوران قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین سے حلف لے چکے تھے کہ وہ صوبائی خودمختاری کے لیے پارٹی کے منشور سے وفاداری کریں گے۔ اب اپنے چھ نکات کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ کرنے لگے جبکہ ملکی سالمیت کے لیے چھ نکات کو عملی جامہ پہنانے کی گنجائش نہ تھی۔ چھ نکات میں پہلا مطالبہ ملک میں پارلیمانی نظام کے قیام کا تھا دوسرے مطالبے میں یہ کہا گیا کہ مرکزی حکومت کے پاس صرف دفاع اور امور خارجہ کا محکمہ ہونا چاہیے باقی تمام اختیارات صوبوں کو دیے جائیں جبکہ تیسرا مطالبہ دونوں حصوں کی مالی پالیسی اور کرنسی الگ الگ کرنے کا تھا بلکہ ساتھ ہی یہ شرط بھی لگائی کہ ایک حصے کے وسائل دوسرے حصے میں منتقل ہونے سے روکا جائے چوتھا مطالبہ یہ تھا کہ مرکز کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں لگائے گا۔ صوبے مرکز کے اخراجات پورے کرنے کے لیے فنڈز دیں گے پانچواں مطالبہ یہ تھا کہ ہر صوبے کو اندرونی و خارجی تجارت اور زرمبادلہ حاصل کرنے کا مکمل اختیار ہونا چاہیے چھٹا اور آخری مطالبہ یہ تھا کہ ہر صوبے کی اپنی الگ فوج ہونی چاہیے تاکہ وہ ملکی دفاع میں موثر کردار ادا کر سکیں۔

مجیب الرحمٰن نے قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں بلانے کا مطالبہ بھی کرنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر افتتاحی اجلاس ڈھاکہ میں ہو گیا تو پھر سپیکر بھی ان کی پارٹی سے ہو گا اور قانون سازی بھی وہ اپنی مرضی سے کروا سکیں گے جبکہ چھ نکات کی وجہ سے پیپلز پارٹی نے اس کی مخالفت کی اور ان کی چالوں کو سمجھتے ہوئے ڈھاکہ اجلاس کی مخالفت کی یہ صورت حال دیکھ کر یحییٰ خاں گھبرا گئے اور انہوں نے دونوں پارٹیوں کے سربراہوں سے ملاقاتیں کیں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجیب الرحمٰن نے فوری اجلاس بلانے کا مطالبہ کر دیا لیکن فوری طور پر اجلاس نہ طلب کیا جا سکا جس کی وجہ سے اس نے عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔ لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنا کاروبار بند کر دیں' ملازمین کام کرنا چھوڑ دیں پولیس عوامی لیگ کے حکم کی تعمیل کرے' ٹیکس ادا نہ کریں' ہائی کورٹ کے جج عدالتوں میں نہ آئیں اور بنک بھی عوامی لیگ کے احکامات پر عمل کریں۔ فوج اگر مداخلت کرے تو اس

کا مقابلہ کیا جائے۔ پورے مشرقی پاکستان میں ہڑتال کروائی گئی اور قتل عام شروع کر دیا گیا۔ خاص طور پر پنجابیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ جنرل یحییٰ نے حالات کو بھانپتے ہوئے جنرل ٹکا خاں کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا لیکن چیف جسٹس نے عوامی لیگ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے حلف نہ لیا اور اس طرح مجیب الرحمٰن نے اپنی متوازی حکومت قائم کر لی۔ صدر یحییٰ خاں نے حالات کو قابو میں کرنے کے لیے قومی اسمبلی کا اجلاس 10 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں طلب کیا لیکن شیخ مجیب جو صرف چھ نکات کی منظوری چاہتا تھا اجلاس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے ہندوستان کی مکمل حمایت حاصل تھی بلکہ عوامی لیگ کے ہندو ارکان تو تباہی پھیلا رہے تھے قائداعظمؒ کی تصویر بھی جلائی گئی' قومی ترانہ بنا لیا گیا جگہ جگہ بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا جانے لگا 15 مارچ کو جنرل یحییٰ خود ڈھاکہ گئے ذوالفقار علی بھٹو کو بلوایا لیکن مجیب کسی طرح بھی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا بلکہ چھ نکات کے ساتھ مزید چار نکات پیش کر دیے جس میں مارشل لا کا خاتمہ' اقتدار کی منتقلی' مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی تحقیقات اور فوجوں کی واپسی شامل تھے اس نے 23 مارچ 1971ء کو اپنے گھر پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا دیا 25 مارچ کو مجیب کو گرفتار کر دیا گیا۔ عالمی سطح پر مسلم ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک نے بھارتی پراپیگنڈے کی وجہ سے مجیب الرحمٰن کا ساتھ دیا۔ ہندوستان مشرقی سرحد سے اپنے ایجنٹوں کو بنگال بھیج رہا تھا جو وہاں فساد پھیلا رہے تھے اور لوگوں کو نقل مکانی کی ترغیب دے رہے تھے۔ اس طرح بہت سارے بنگالی سرحد پار کر کے ہندوستان چلے گئے اور بھارت کھل کر سامنے آ گیا اور مہاجرین کی فوجی تربیت کرنے لگا' ساتھ ہی اپنی سرحدی فوج کو سفید لباس پہنا کر مشرقی پاکستان بھیج دیا۔ خانہ جنگی اپنے عروج کو پہنچ گئی تو بھارت نے مظلوموں کی مدد کا بہانہ بنا کر خود جنگ شروع کر دی۔ روس نے بھی بھارت کی بھرپور مدد کی کیونکہ روس نے بھارت کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر رکھا تھا۔ اس طرح روس بھارت نے مل کر پاکستان کے ساتھ جنگ لڑی پاکستان بڑی بہادری سے ان دونوں کا مقابلہ کر رہا تھا کہ انہوں نے مغربی سرحد پر بھی حملہ کر دیا اور ساتھ ہی اپنی پوزیشن کو مضبوط بناتے کے لیے فضائی اور بحری ناکہ بندی کر دی جس کی وجہ سے مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان سے رابطہ کٹ گیا اور کسی قسم کی امداد نہ پہنچائی جا سکی جس کی وجہ سے مجبوراً" ہماری بہادر فوج کو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنا پڑے اور قریباً" 90 ہزار پاکستانی فوجی قیدی بنا لیے گئے مشرقی محاذ پر ہتھیار ڈالنے کے ساتھ ہی مغربی محاذ پر بھی لڑائی ختم ہو گئی بھارت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور مشرقی پاکستان ایک الگ ملک "بنگلہ دیش

کے نام سے دنیا کے نقشے پر وجود میں آ گیا۔ مغربی پاکستان اس وقت اقتصادی اور سیاسی بحران کا شکار تھا۔ جنگ بندی کے وقت ذوالفقار علی بھٹو سلامتی کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے نیویارک میں تھے۔ انہیں وطن واپس بلا کر اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے صدر پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا اور عوام کو یقین دلایا کہ وہ عوامی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دل جان سے پاکستانی عوام کی خدمت کریں گے اور جلد ہی ملک میں جمہوریت بحال کریں گے، معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورتحال کو بہتر بنائیں گے اس کے لیے انہوں نے اپریل 1972ء میں عبوری آئین بنا کر نافذ کر دیا اور پھر باقاعدہ آئین سازی کا کام شروع کر دیا۔ عبوری آئین کے تحت مارشل لا ختم کر کے ذوالفقار علی بھٹو نے صدر پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھا لیا۔ قومی اسمبلی نے آئین تشکیل کے لیے 25 ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جس نے آئین سازی کا کام تیزی سے شروع کر دیا۔ حزب اختلاف کو کچھ اعتراضات تھے جو باہم مل کر طے کر لیے گئے اور 10 اپریل 1973ء کو قومی اسمبلی نے آئین منظور کر دیا اس طرح نیا متفقہ آئین بن گیا جس کو 14 اگست 1973ء کو باقاعدہ نافذ کر دیا گیا۔

سوالات

-1 1947ء سے 1956ء تک پاکستان میں آئینی ارتقاء کا جائزہ لیں۔

-2 1956ء کے آئین کی خصوصیات بیان کریں۔

-3 1962ء کے آئین کے خصوصیات بیان کریں۔

-4 1962ء کا آئین ناکام کیوں ہوا؟ دلائل سے ثابت کریں۔

-5 1958ء سے 1973ء تک کے سیاسی حالات کا جائزہ لیں۔

-6 مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجوہات تفصیل سے بیان کریں۔

-7 مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیں۔

(الف) قرارداد مقاصد
(ب) بنیادی اصولوں کی کمیٹی
(ج) محمد علی بوگرہ فارمولا
(د) وحدت مغربی پاکستان

باب چہارم

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین

1973ء

(The constitution of the Islamic Republic of Pakistan 1973)

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا 1973ء کا آئین عوامی آئین ہے جسے عوام کے نمائندوں نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ 1956ء کا آئین بھی عوامی نمائندوں نے بنایا تھا۔ 1962ء کا آئین فرد واحد کا تخلیق کردہ تھا۔ پہلے دونوں آئین زیادہ عرصہ تک چل نہ سکے جبکہ 1973ء کا آئین باوجود اس کے کہ 1977ء میں نظام مصطفیٰ کے نام پر احتجاجی تحریک چلائی گی اور حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا لیکن آئین ختم نہ کیا جا سکا البتہ اس کو 5 جولائی 1977ء کو معطل کر دیا گیا اور 1985ء میں ترامیم کر کے اس کو بحال کر دیا گیا۔ متذکرہ عرصے میں کیے گئے اقدامات کو آئینی تحفظ دیا گیا۔

آئین کی خصوصیات Salient features

1- **ملک کا نام اور اس کے علاقے :** 1973ء کے آئین میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا پاکستان چونکہ اسلامی نظریے کے تحت حاصل کیا گیا اس لیے اسلام کے نام پر ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا جبکہ جمہوریہ سے مراد ہے کہ ملک کا سربراہ منتخب کردہ ہو گا آئین میں ملک میں شامل علاقوں کی بھی نشاندہی کر دی گئی جس میں صوبہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان، اسلام آباد دارالحکومت، وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے اور ایسے علاقے اور ریاستیں جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوں گے۔

2- **تحریری آئین :** پاکستان کا آئین جامع دستاویز کی صورت میں تحریر کیا گیا۔ یہ آئین پہلے دونوں آئینوں کے مقابلے میں زیادہ جامع ہے۔ 280 دفعات پر مشتمل ہے جبکہ 1956ء کا آئین 234 اور 1962ء کا آئین 250 دفعات پر مشتمل تھا۔

3- **نیم استوار :** پاکستان کا آئین نہ تو اس قدر استوار ہے کہ اس میں تبدیلی نہ لائی جا

سکے اور نہ اس قدر لچکدار کہ جب چاہے تبدیل کیا جا سکے۔ آئین میں ترمیم کا طریقہ کار 1985ء کی آئینی ترمیم سے پہلے نسبتاً" آسان تھا، اس کے تحت قومی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت اور سینٹ کی عام اکثریت آئین میں ترمیم کر سکتی تھی لیکن اب دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت کی منظوری ضروری ہے۔ اگر کسی آئینی ترمیم سے صوبائی حدود متاثر ہوتی ہوں تو متعلقہ صوبوں کی اسمبلیوں کی دو تہائی اکثریت کا رضامند ہونا ضروری ہے۔ 5 جولائی 1977ء سے 10 مارچ 1985ء تک جاری کیے گئے احکامات میں ترمیم کرنے کے لیے صدر کی پیشگی منظوری لازمی تھی۔

4- **سرکاری مذہب :** اس آئین کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا جبکہ 1956ء اور 1962ء کے آئین میں اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت نہیں دی گئی۔ آئین میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ تمام قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے گا اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی۔

5- **پارلیمانی طرز حکومت :** 1973ء کے آئین کے تحت ملک میں پارلیمانی طرز حکومت رائج کیا گیا۔ صدر کو برائے نام اختیارات حاصل تھے۔ اصل اختیارات کا سرچشمہ وزیراعظم تھا۔ آئین کی رو سے قومی اسمبلی کو عوام کے براہ راست ووٹوں سے پانچ سال کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ وزیراعظم کا انتخاب قومی اسمبلی کی اکثریت کرے گی۔ وزیراعظم کو جب تک قومی اسمبلی کے ارکان کا اعتماد حاصل رہے گا وہ اپنے عہدے پر قائم رہے گا۔ وزیراعظم صدر مملکت کو قومی اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے سکتا ہے اگر صدر اس پر عمل نہ کرے تو 48 گھنٹوں کے بعد قومی اسمبلی خود بخود ٹوٹ جائے گی۔

6- **وفاقی نظام حکومت :** 1973ء کے آئین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں وفاقی نظام حکومت قائم کیا گیا جس کے تحت وفاقی حکومت اور چار صوبوں کی حکومتیں ملک کا انتظام چلائیں گی پہلے مشرقی پاکستان کی بھی گنجائش رکھی گئی لیکن بعد میں بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات دو فہرستوں میں تقسیم کیے گئے ایک وفاقی فہرست اور دوسری مشترکہ امور کی فہرست، باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو دیے گئے وفاقی فہرست میں شامل امور کے بارے میں مجلس شوریٰ قانون سازی کرتی ہے جبکہ مشترکہ امور کے بارے میں دونوں حکومتیں قانون سازی کر سکتیں ہیں۔ اگر دونوں حکومتیں بیک وقت قانون بنا لیں تو مجلس شوریٰ کا بنایا ہوا قانون نافذ العمل ہو گا۔ تمام وفاقی اکائیوں

کو مساوی رکھا گیا ہے' اسی لیے سینٹ میں سب صوبوں کو مساوی نمائندگی دی گئی ہے۔

7- **دو ایوانی مقننہ** : 1956ء اور 1962ء کے آئینوں میں یک ایوانی مقننہ تھی جبکہ 1973ء کے آئین کے تحت دو ایوانی مقننہ ہے ایک ایوان زیریں جس کو قومی اسمبلی اور دوسرا ایوان بالا جس کو سینٹ کہا جاتا ہے۔ قانون ساز ادارے کا پہلے نام پارلیمنٹ رکھا گیا جبکہ 1985ء میں ترمیم کر کے اس کا نام مجلس شوریٰ رکھ دیا گیا۔ قومی اسمبلی کے ممبران کی تعداد 237 تھی جس میں 207 مسلم ارکان 10 نشستیں اقلیتوں کی اور 20 نشستیں خواتین کی تھیں جنھیں اب ختم کر دیا گیا ہے لہٰذا اب قومی اسمبلی کے ممبران کی تعداد 217 ہے' جنھیں بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر پانچ سال کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ سینٹ کے ممبران کی تعداد 87 ہے' جس میں 19 ارکان ہر صوبائی اسمبلی واحد قابل انتقال ووٹ کے طریقے سے منتخب کر کے بھیجتی ہے۔ سینٹ ایک مستقل ایوان ہے جس کے ارکان چھ سال تک کام کرتے ہیں جبکہ تین سال بعد آدھے ریٹائرڈ ہو جاتے ہیں۔

8- **آزاد عدلیہ** : 1973ء کے آئین میں عدلیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ ججوں کا تقرر صدر مملکت کرتا ہے۔ جبکہ ان کی برطرفی صرف سپریم جوڈیشل کونسل آف پاکستان کی سفارش پر صدر کر سکتا ہے۔ ججوں کی معقول تنخواہ اور مدت ملازمت نسبتاً" زیادہ ہے عدلیہ انتظامیہ سے الگ کر دیا گیا ہے۔

9- **قانون کی حاکمیت** : آئین کی نظر میں سب لوگ برابر ہیں تمام شہریوں کو حقوق کا تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ کسی شہری کو قانونی جواز کے بغیر نہ گرفتار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی سزا دی جا سکتی ہے۔ سرکاری ملازمین اور تمام شہریوں کے لیے ایک ہی عدالتی نظام ہے۔

10- **بنیادی حقوق** : آئین میں بنیادی حقوق باقاعدہ تحریر کیے گئے ہیں۔ اس بات کی وضاحت بھی آئین میں کر دی گئی ہے کہ اگر کوئی قانون بنیادی حقوق سے تصادم ہو گا تو وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ ملک میں ہر شہری کی جان مال اور عزت محفوظ ہو گی۔ عدلیہ کو بنیادی حقوق کی حفاظت کا اختیار دیا گیا ہے۔ شہریوں کو کسی نسلی' لسانی' مذہبی یا علاقائی امتیاز کے بغیر معاشرتی' معاشی' سیاسی اور مذہبی حقوق حاصل ہوں گے اقلیتوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

11- **براہ راست طریقہ انتخاب** : 1962ء کے آئین کے تحت بالواسط طریقہ انتخاب بنایا

گیا تھا جبکہ 1973ء کے آئین میں براہ راست انتخاب کا طریقہ رائج کر دیا گیا ہے۔ ووٹر کی عمر 21 سال ہو گی اور حلقہ ہائے انتخاب یک رکنی ہے۔ اقلیتوں کی مخصوص نشستوں کا انتخاب بھی براہ راست جداگانہ طریقے سے ہوتا ہے۔ 1985ء کی ترمیم کے ذریعے صدر کو کسی اہم مسئلے پر عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے استصواب رائے کروانے کا حق دیا ہے۔ دسمبر 1984ء کے ریفرنڈم کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا ہے الیکشن کمیشن کو ملک میں آزادانہ انتخابات کروانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

12- **قرارداد مقاصد :** 1973ء کے آئین میں قرارداد مقاصد کو افتتاحیہ کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ پہلے دونوں آئینوں کا آغاز بھی قرارداد مقاصد سے ہوا تھا، جس میں واضح کیا گیا تھا کہ ملک میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہو گی۔ عوام کے نمائندے اپنے اختیارات کا استعمال مقدس امانت کے طور پر شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے کریں گے۔ اس قرارداد کے تحت ملک میں جمہوری نظام قائم کرنے کا عزم کیا گیا۔ بعد میں ایک ترمیم کے ذریعہ اسے آئین کا باقاعدہ حصہ قرار دے دیا گیا۔

13- **اکہری شہریت :** وفاقی ممالک میں عام طور پر دوہری شہریت ہوتی ہے۔ ہر شہری مرکز کے ساتھ ساتھ وفاقی اکائی کی حکومت کا بھی شہری ہوتا ہے۔ اس کو دونوں حکومتوں کی طرف سے حقوق دیے جاتے ہیں جن کے عوض وہ فرائض بھی ادا کرتا ہے جبکہ پاکستان میں ایسا نہیں ہے اس کے شہری صرف مرکزی حکومت کے شہری ہوتے ہیں خواہ وہ کسی بھی صوبے میں رہتے ہوں وہ صرف پاکستانی کہلائیں گے۔

14- **استحصال کا خاتمہ :** آئین میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ملک میں ہر قسم کے استحصال کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کی خاطر پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر کو بھی تحفظ دیا گیا ہے۔ ہر کسی کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا کسی کو ایسا کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جو غیر قانونی ہو اور نہ ہی ایسا کام کرنے سے منع کیا جائے گا جس کی قانون اجازت دیتا ہو۔

15- **سرکاری زبان :** 1973ء کے آئین میں صرف اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تاہم اس وقت تک انگریزی زبان سرکاری دفاتر میں استعمال کی جا سکتی ہے جب تک اس کی جگہ اردو زبان رائج کرنے کے انتظامات نہیں ہو جاتے۔ آئین میں صوبوں کو بھی یہ اختیار دیا ہے کہ ان کی حکومتیں اپنی علاقائی زبانوں کی تعلیم اور ترقی کے لیے کوشش کر سکتی ہے۔

اسلامی دفعات Islamic Provisions

پہلی دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد کی شکل میں آئین کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کر دی تھی- 1973ء کے آئین میں ان باتوں کا اعادہ کیا گیا اور واضح کیا گیا کہ ملک میں موجود تمام قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے گا- نئے آئین میں شامل اسلامی دفعات مندرجہ ذیل ہیں-

1- قرارداد مقاصد کو آئین میں شامل کیا گیا ہے جس میں خدا کی حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) کو تسلیم کیا گیا ہے- یہی وہ بنیاد ہے جو پاکستان کو اسلامی مملکت بناتی ہے-

2- ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان اور سرکاری مذہب اسلام ہو گا-

3- 1973ء کے آئین میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ ہر وہ شخص جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتا' وہ مسلمانوں میں شمار نہیں ہوتا- قادیانیوں اور لاہوری مرزائیوں کو مسلمانوں کی تعریف سے نکال دیا گیا ہے-

4- ملک کے صدر اور وزیراعظم کے لیے مسلمان ہونا لازمی ہے-

5- تمام قوانین کو اسلام کے مطابق بنایا جائے گا' قرآن و سنت کے خلاف قانون نافذ نہیں کیا جائے گا نیز قرآن پاک کی صحیح طباعت و اشاعت کا بندوبست کیا جائے گا-

6- اقلیتوں کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی مکمل آزادی ہو گی-

7- قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم لازمی ہو گی' عربی زبان کی تعلیم کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں گی- زکوٰۃ' عشر اور مساجد کا نظام بہتر بنایا جائے گا-

8- ملک میں مذہبی' نسلی' لسانی اور گروہی تعصبات ختم کیے جائیں گے-

9- اسلامی تعلیمات سے متعلق حکومت کی رہنمائی کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی جائے گی جس کے ممبران کا تقرر صدر مملکت کریں گے-

10- 1985ء کی ترمیم کے مطابق نمائندوں کے لیے اسلامی دفعات کا حامل ہونا ضروری ہے یعنی وہ اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل ہوں متقی اور پرہیزگار ہوں-

صدر مملکت (President)

1973ء کے آئین کے تحت ملک میں پارلیمانی طرز حکومت رائج کیا گیا- ملک کا سربراہ

صدر کہلاتا ہے جس کو 1985ء کی ترمیم سے پہلے رسمی اختیارات حاصل تھے اور وہ تمام کاموں میں وزیراعظم کے مشورے کا پابند تھا لیکن آٹھویں ترمیم کے بعد صدر کی حیثیت اور اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا' صدر کو بعض صوابدیدی اختیارات دے دیے گئے۔ جن کے لیے وہ وزیراعظم کے مشورے کا پابند نہیں تھا جبکہ یکم اپریل 1997ء کو آئین میں تیرہویں ترمیم کے ذریعے صدر کے صوابدیدی اختیارات ختم کر دیے گئے ہیں اور صدر کو دوبارہ بے اختیار یا رسمی سربراہ بنا دیا گیا ہے۔

صدر کی اہلیت

1- صدر کے لیے لازمی ہے کہ وہ مسلمان ہو۔
2- اس کی عمر 45 سال سے کم نہ ہو۔
3- قومی اسمبلی کا ممبر بننے کا اہل ہو۔
4- ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج نہ ہو۔

انتخاب: صدر کا انتخاب بالواسط طریقے سے ہوتا ہے۔ آٹھویں ترمیم سے پہلے صدر کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اپنے مشترکہ اجلاس میں منتخب کرتے تھے لیکن اب صوبائی اسمبلیاں بھی مجلس شوریٰ کے ساتھ صدر کو منتخب کرتی ہیں آئین کے تحت صدر کا انتخاب پہلے صدر کی معیاد عہدہ کے خاتمہ سے زیادہ سے زیادہ ساٹھ دن اور کم از کم تیس دن پہلے ہوگا لیکن اگر عہدہ صدر کی وفات کی وجہ خالی ہو تو پھر صدر کی وفات کے بعد تیس دن کے اندر نئے صدر کو منتخب کر لیا جائے گا۔ صدر کا انتخاب چیف الیکشن کمشنر کی زیر نگرانی ہوتا ہے۔ وہ تاریخ وقت اور جگہ کا تعین کر دیتا ہے پھر مقررہ وقت پر صدر کا انتخاب ہوتا ہے امیدوار اپنے کاغذات نامزدگی جمع کروا دیتے ہیں' کاغذات نامزدگی کی چھان بین کے بعد امیدواروں کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور چیف الیکشن کمشنر سپیکر کو اپنی اسمبلیوں کا اجلاس طلب کرنے کے لیے کہتا ہے۔ رائے دہی کے لیے خفیہ طریقہ اپنایا گیا ہے اور ووٹ کی پرچی پر حروف تہجی کی ترتیب سے امیدواروں کے نام درج ہوتے ہیں۔ پریذائیڈنگ افسر کی زیر نگرانی جب ووٹ ڈال دیے جاتے ہیں تو پھر ان کی گنتی کا مرحلہ آتا ہے قومی اسمبلی اور سینٹ میں تو گنتی سادہ طریقے سے ہوتی ہے جتنے ووٹ امیدوار حاصل کرتا ہے وہ اسی تعداد میں اس کے حصے میں آتے ہیں لیکن صوبائی اسمبلیوں میں طریقہ ذرا فرق ہے کیونکہ چاروں صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی تعداد برابر نہیں ہے۔ بلوچستان اسمبلی کے ارکان کی تعداد

سب سے کم ہے یعنی 43 جبکہ پہلے 45 تھی لیکن خواتین کی نشستوں کے خاتمے کے بعد 43 ہے جبکہ پنجاب کی پہلے 260 نشستیں تھیں جو اب 248 ہیں' سندھ پہلے 114 تھیں اب 109' سرحد کی پہلے 87 اور اب 83 ہیں۔ صوبہ پنجاب' سندھ' سرحد کی اسمبلیوں میں حاصل کردہ ووٹوں کی بلوچستان کی کل نشستوں سے ضرب دے کر متعلقہ حلقہ اسمبلی کی کل نشستوں سے تقسیم کر دیا جاتا ہے مثلاً" پنجاب 43x69/248 = 12 ووٹ' سندھ 43x69/109 = 27 ووٹ' سرحد 43x69/83 = 36 ووٹ' جبکہ بلوچستان اسمبلی میں حاصل کردہ ووٹوں کو ضرب' تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر امیدوار کے مجلس شوریٰ اور صوبائی اسمبلیوں سے حاصل کردہ ووٹوں کو جمع کر کے عام اکثریت کی بنیاد پر نتائج کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اکثریت حاصل کرنے والا کامیاب قرار پاتا ہے۔

عہدے کی میعاد: صدر کے عہدے کی میعاد پانچ سال ہے لیکن وہ مسلسل دو میعادوں سے زیادہ اس عہدے کے لیے امیدوار نہیں بن سکتا۔

عہدے سے علیحدگی: صدر پانچ سال پورے ہونے سے پہلے بھی اپنے عہدہ سے الگ ہو سکتا ہے صدر اپنی مرضی سے استعفیٰ دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے خلاف مواخذہ کی تحریک بھی پارلیمنٹ میں لائی جا سکتی ہے۔ یہ اس وقت پیش کی جا سکتی ہے جب صدر پر آئین کی خلاف ورزی یا شدید بدعنوانی کرنے کا الزام ہو یا پھر صدر ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے فرائض ادا نہ کر سکتا ہو۔ مواخذہ کی تحریک مجلس شوریٰ کے کسی بھی ایوان میں پیش کی جا سکتی ہے۔ کسی بھی ایوان کے نصف ارکان متعلقہ ایوان کے سپیکر یا چیئرمین کو تحریک پیش کرنے کی تحریری اطلاع دے دیتے ہیں۔ اس تحریری اطلاع میں صدر کے خلاف الزامات کی فہرست صدر مملکت تک پہنچ جاتی ہے۔ نوٹس موصول ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ چودہ دن اور کم از کم سات دن کے اندر سپیکر مجلس شوریٰ کا مشترکہ اجلاس طلب کرے گا جس میں صدر کو اپنے الزامات کی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ مجلس شوریٰ ان الزامات کی تحقیق بھی کروائے گی۔ تحقیقات مکمل ہونے اور صدر کی صفائی کے بعد رائے شماری کروائی جاتی ہے۔ اگر دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت قرارداد کے حق میں ووٹ دے تو صدر کو عہدے سے الگ ہونا پڑے گا۔

پابندیاں اور مراعات: آئین کے تحت صدر پاکستان پر یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ کسی صوبائی یا قومی اسمبلی اور سینٹ کا رکن نہ رہ سکے گا۔ اگر وہ پہلے سے کسی بھی قانونی

ادارے کا رکن ہے تو اسے اس کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ صدر کسی بھی نفع بخش عہدے پر کام نہیں کر سکتا۔ چند پابندیوں کے ساتھ ساتھ صدر کو بہت سی مراعات بھی دی جاتی ہیں۔ صدر کو تنخواہ اور الاؤنس بھی دیے جاتے ہیں جن کا تعین پارلیمنٹ کرتی ہے۔ صدر کے خلاف کوئی فوجداراری یا دیوانی مقدمہ نہیں کیا جا سکتا' نہ ہی کوئی قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے اگر ذاتی فعل کی بنیاد پر صدر کو عدالت میں طلب کرنا ضروری ہو تو اس قسم کی کاروائی شروع کرنے سے کم از کم ساٹھ دن پہلے نوٹس دینا پڑتا ہے۔

صدر کا حلف: صدر اپنے عہدے کا حلف سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے سامنے اٹھاتا ہے جس میں وہ عہد کرتا ہے کہ "وہ مسلمان ہے خدا کی وحدت' اس کی بھیجی ہوئی کتابوں اور قرآن پاک (جو آخری کتاب ہے) پر ایمان رکھتا ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی مانتا ہے اور یہ وعدہ کرتا ہے "میں پاکستان کا وفادار رہوں گا اور پوری ایمانداری سے اپنے فرائض آئین کے مطابق ادا کروں گا اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے ذاتی مفادات پر ملکی مفادات کو ترجیح دوں گا اور ہمیشہ سب کے ساتھ مساوی سلوک کروں گا' کسی ڈر' خوف اور لالچ سے متاثر نہیں ہوں گا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سلامتی اور بقاء کا پورا خیال رکھوں گا"۔

قائم مقام صدر: آئین کی دفعہ 49 کے مطابق صدر کا عہدہ اگر صدر کے استعفیٰ برطرفی' بیماری' طویل رخصت یا صدر کے بیرون ملک دورے کے صورت میں خالی ہو تو سینٹ کا چیئرمین قائم مقام صدر کی حیثیت سے کام کرتا ہے اگر وہ بھی کسی وجہ سے صدر کے فرائض سرانجام نہ دے سکے تو پھر قومی اسمبلی کا سپیکر قائم مقام صدر کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور اس وقت تک کام کرتا جب تک نئے صدر کا چناؤ نہیں ہو جاتا۔

صدر کے اختیارات و فرائض

صدر کے اختیارات پہلے برائے نام تھے جبکہ حقیقی اختیارات وزیر اعظم کے پاس تھے جو حکومت کا سربراہ تھا لیکن 1985ء میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے صدر کو بااختیار بنا دیا گیا۔ لیکن یکم اپریل 1997ء کو تیرھویں ترمیم کے ذریعے صدر کے اختیارات کو کم کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے صدر اسمبلی ازخود نہیں توڑ سکتا اور نہ ہی گورنروں اور مسلح افواج کے سربراہوں کا تقرر اپنی مرضی سے کر سکتا ہے بلکہ وہ وزیر اعظم کے مشورے کا پابند ہے۔

تاہم چیف الیکشن کمشنر اور چیئرمین پبلک سروس کمیشن کی تعیناتی اپنی صوابدید پر کر سکتا ہے۔

انتظامی اختیارات: صدر انتظامیہ کا سربراہ ہے اور آئین کے مطابق اپنے اختیارات خود یا وزیراعظم اور اس کی کابینہ کے مشورے سے استعمال کرے گا صدر قومی اسمبلی کے کسی ایسے رکن کو حکومت بنانے کی دعوت دے گا جس کو قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو گی اور وہ شخص قومی اسمبلی میں اپنے چناؤ کے بعد اپنی کابینہ تشکیل دے گا لیکن کابینہ کے ارکان کی فہرست کی منظوری صدر سے لینا پڑتی ہے۔ آئین کی دفعہ 48 کے تحت صدر ہنگامی حالات کی صورت میں نگران کابینہ کا تقرر بھی کرتا ہے۔ صدر کو اگر یہ احساس ہو جائے کہ وزیراعظم کو قومی اسمبلی کا اعتماد حاصل نہیں رہا تو صدر قومی اسمبلی کا خصوصی اجلاس بلا سکتا ہے اور وزیراعظم کو اعتماد کا ووٹ لینے کے لیے کہہ سکتا ہے۔ اگر قومی اسمبلی عدم اعتماد کا اظہار کر دے تو پھر اسے اپنا عہدہ چھوڑنا پڑتا ہے۔ وزیراعظم کے لیے ضروری ہے کہ تمام فیصلے کرنے سے پہلے صدر کو آگاہ کرے۔ اختلاف کی صورت میں صدر تین ماہ کے اندر کابینہ کے فیصلہ پر دوبار غور کے لیے اپنی تجاویز کابینہ کو بھیج سکتا ہے لیکن اگر کابینہ دوبارہ اپنا فیصلہ برقرار رکھے تو صدر کو اسے ماننا پڑے گا۔ صدر کسی بھی معاملہ پر کابینہ سے مشورہ طلب کر سکتا ہے لیکن اس پر عمل کرنے کا پابند نہیں تمام وفاقی احکامات صدر کے دستخط سے جاری ہوتے ہیں۔

تقرری اختیارات: صدر، وزیراعظم اور کابینہ کے ارکان کی تقرری کے علاوہ اعلیٰ انتظامی عہدیداروں کی تقرریاں بھی کرتا ہے۔ صدر مملکت وزیراعظم سے مشورہ کے بعد صوبوں میں گورنروں کا تقرر بھی کرتا ہے۔ صدر تینوں افواج کا سربراہ ہونے کی وجہ سے جائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی اور تینوں مسلح افواج کے چیف آف دی سٹاف کی تعیناتی وزیراعظم کے مشورے سے کرتا ہے۔ آرٹیکل 213 کے تحت چیف الیکشن کمشنر کی تعیناتی اور آرٹیکل 242 کے تحت چیئرمین پبلک سروس کمیشن کی تعیناتی اپنی صوابدید پر کرتا ہے۔ دوسرے ممالک میں سفیروں کا، اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین اور ارکان، مشترکہ مفادات کی کونسل کے ارکان، قومی فنانس کمیشن کے ارکان، آڈیٹر جنرل، اٹارنی جنرل سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور ججوں، ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور ججوں، وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کا تقرر صدر مملکت کرتا ہے۔

خارجہ امور: صدر کو خارجہ امور طے کرنے کا اختیار حاصل ہے، صدر دوسرے ممالک

میں اپنے سفیروں کا تقرر کرتا ہے اور دوسرے ممالک کے سفیروں کی منظوری دیتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے سربراہان اگر پاکستان کے دورہ پر آئیں تو ان کا استقبال کرتا ہے، خود بھی دوسرے ملکوں کے دوروں پر جاتا ہے، ان کے ساتھ معاہدات کرتا ہے۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندوں کا تقرر کرتا ہے۔ دوسرے ممالک کے ساتھ جنگ، امن اور صلح نامے کی شرائط طے کرنے کا اختیار بھی صدر کو حاصل ہے۔

دفاع سے متعلق اختیارات: ملک کے دفاع کی ذمہ داری بھی صدر پر ہے صدر خود مسلح افواج کا سربراہ ہے جائنٹ سٹاف کمیٹی کے چیئرمین اور تینوں مسلح افواج کے چیف آف دی سٹاف کا تقرر بھی صدر مملکت وزیراعظم کے مشورے سے کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی امداد یا اقوام متحدہ کی مدد کے لیے فوج بھیجنے کا اختیار بھی صدر کو حاصل ہے جنگ اور امن کے امور طے کرنا بھی صدر کے اختیارات میں شامل ہے۔

قانون سازی کے اختیارات: قانون سازی دراصل قانون ساز ادارے کا کام ہے لیکن مجلس شوریٰ قانون بنانے کے بعد صدر سے منظوری حاصل کرتی ہے صدر مجلس شوریٰ کو قانون سازی کے متعلق تجاویز اور پیغامات بھجوا سکتا ہے صدر جب چاہے مجلس شوریٰ کا اجلاس بلا سکتا ہے، ملتوی بھی کر سکتا ہے، دونوں ایوانوں یا کسی ایک ایوان سے خطاب بھی کر سکتا ہے، صدر وزیراعظم کے مشورے پر قومی اسمبلی توڑ سکتا ہے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اسمبلی خودبخود 48 گھنٹے کے اندر ٹوٹ جائے گی اگر وزیراعظم اس وقت مشورہ دے جب اس کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک اسمبلی میں پیش ہو چکی ہو تو پھر مشورے پر عمل نہیں ہو گا۔ اگر پارلیمنٹ کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو صدر اپنی طرف سے حکم نامے جاری کر سکتا ہے اس کے لیے وہ وزیراعظم سے مشورہ بھی لے سکتا ہے یہ حکم نامے جو آرڈیننس کہلاتے ہیں چار ماہ تک رائج رہ سکتے ہیں اس کے بعد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں یا صدر ان کو واپس لے لیتا ہے لیکن اگر قومی اسمبلی توثیق کر دے تو قوانین بن جاتے ہیں۔

عدالتی اختیارات: صدر آئین کے آرٹیکل 177 کے تحت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور اس کے مشورے سے دوسرے ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ آرٹیکل 193 کے تحت ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور ججوں کا تقرر کرتا ہے صدر ہائی کورٹس (High Courts) کے ججوں کا تبادلہ بھی کر سکتا ہے۔ آرٹیکل 45 کے تحت صدر کو کسی بھی عدالت کی طرف سے دی گئی سزا معاف کرنے یا اس میں کمی کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

ہنگامی اختیارات: اگر ملک کو اندرونی یا بیرونی طور پر خطرہ ہو تو صدر ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر سکتا ہے اگر کسی صوبے کے حالات خراب ہو جائیں اور صوبائی حکومت کنٹرول نہ کر سکے تو متعلقہ صوبے کا گورنر صدر کو اطلاع کر سکتا ہے اور پھر صدر اس کی حکومت کو معطل کر کے صوبے میں ہنگامی حالت نافذ کر سکتا ہے اور صوبے کا انتظام مرکزی حکومت چلاتی ہے صدر ہنگامی حالات کی صورت میں بنیادی حقوق بھی معطل کر سکتا ہے۔

وزیر اعظم (Prime Minister)

پارلیمانی نظام حکومت میں وزیر اعظم حکومت کا سربراہ ہوتا ہے اور پورے نظام میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے 1973ء کے آئین میں بھی وزیر اعظم کو تمام حکومتی سرگرمیوں کا محور بنایا گیا تھا لیکن 1985ء میں آئین میں ترمیم کے بعد وزیر اعظم کی حیثیت صدر کے مشیر اعلیٰ کی ہو گئی اور صدر کو انتظامیہ کا سربراہ بنا دیا گیا لیکن اب تیرھویں ترمیم کے ذریعے کافی حد تک وزیر اعظم کی حیثیت کو بحال کر دیا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں وزیر اعظم کا انتخاب کیسے ہوتا ہے اور وہ کون سے فرائض ادا کرتا ہے۔

وزیر اعظم کا انتخاب: قومی اسمبلی کے اراکین وزیر اعظم کو منتخب کرتے ہیں وزیر اعظم قومی اسمبلی کا رکن ہوتا ہے اور اس کی پارٹی کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ اسمبلی اپنے پہلے اجلاس میں سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کو منتخب کرتی ہے اور اس کے بعد وزیر اعظم کو چنا جاتا ہے۔

عہدے کی شرائط اور میعاد: وزیر اعظم کے لیے لازمی ہے کہ مسلمان ہو اور قومی اسمبلی کا رکن ہو وزیر اعظم اس وقت تک اپنے عہدے پر کام کر سکتا ہے جب تک اسے اسمبلی کا اعتماد حاصل رہے اگر عدم اعتماد کی تحریک پاس ہو جائے تو اسے اپنی کابینہ سمیت برطرف ہونا پڑتا ہے۔

وزیر اعظم کی حلف وفاداری: وزیر اعظم اپنے انتخاب کے بعد صدر کے سامنے اپنے عہدے کا حلف اٹھاتا ہے جس میں اپنے مسلمان ہونے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی ماننے کا اقرار کرتا ہے اور اسلامی نظریے پر عمل کرنے، ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دینے، ملک اور آئین کی حفاظت کرنے اور ملک کا وفادار رہنے کا عہد کرتا ہے۔

وزیراعظم اگر غیر ملکی دورے پر جائے یا بیماری کے سبب چھٹی لے تو سینئر وزیر اس کی جگہ کام کرتا ہے اگر وفات پا جائے یا استعفیٰ دے تو پھر بھی سینئر وزیر کو اس کی جگہ کام کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

وزیراعظم کے اختیارات و فرائض

وزیراعظم صدر کا مشیر اعلیٰ ہوتا ہے اس کو کابینہ میں نہایت اہم حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی کابینہ کے اراکین کا چناؤ کرتا ہے اور تمام حکومتی امور میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ قانون سازی میں بھی اس کی رائے کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

1- کابینہ کی تشکیل: وزیراعظم اپنا حلف اٹھانے کے بعد اپنی کابینہ کے اراکین کو چنتا ہے کابینہ کے زیادہ تر اراکین قومی اسمبلی میں سے لیے جاتے ہیں جبکہ صرف ایک چوتھائی ارکان سینٹ میں سے لیے جا سکتے ہیں۔ کابینہ کے اراکین کے لیے لازمی ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کے رکن ہوں کوئی پارلیمنٹ کا ممبر نہ ہو تو وہ چھ مہینے کے اندر اندر اپنے آپ کو پارلیمنٹ کا ممبر منتخب کروائے گا ورنہ وزارت سے استعفیٰ دے گا۔ وزیراعظم وفاقی وزراء کو محکمے اپنی مرضی سے تقسیم کرتا ہے البتہ وہ ان کی قابلیت اور متعلقہ شعبے میں ان کے ذہنی رجحان کو مدنظر رکھتا ہے۔ کابینہ کی فہرست کی منظوری صدر سے لیتا ہے اور کابینہ اجتماعی حیثیت سے کام کرتی ہے۔

2- صدر کا مشیر اعلیٰ: 1985ء میں آئین میں ترمیم کر کے وزیراعظم کے اختیارات کو کم کر دیا گیا اب صدر تمام کام وزیراعظم کے مشورے سے سرانجام دیتا ہے البتہ کچھ معاملات میں صدر اپنی مرضی بھی کر سکتا ہے وزیراعظم صدر اور کابینہ کے درمیان رابطے کی حیثیت سے کام کرتا ہے وہ صدر کو تمام وزراء کی کارکردگی اور خیالات سے آگاہ کرتا ہے گوکہ وزیر خود بھی صدر سے ملاقات کرتا ہے لیکن اجتماعی طور پر تمام شعبوں کی کارکردگی سے صدر کو باخبر رکھنا وزیراعظم کا فرض ہے۔

3- کابینہ کا قائد: وزیراعظم کابینہ کا قائد ہوتا ہے۔ تمام وزراء وزیراعظم کی زیرقیادت کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے فرائض انجام دیتے وقت وزیراعظم سے مشورہ لیتے ہیں۔ وزیراعظم تمام شعبوں کی نگرانی کرتا ہے جو وزیر صحیح کام نہیں کرتا اس کو تنبیہہ کرتا ہے اور مستعفی ہونے پر مجبور بھی کر سکتا ہے۔ کابینہ میں اختلافات کی صورت میں وہ ان کو ہدایات جاری

کرتا ہے اور آپس میں تعاون کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تمام وزرا وزیر اعظم کا احترام کرتے ہیں اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔

4- **قومی قائد:** وزیر اعظم کابینہ کا قائد ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کا بھی قائد ہوتا ہے اور اس کو پوری قوم کی رہنمائی کا فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی پالیسی کے حق میں رائے عامہ منظم کرتا ہے۔ لوگ اپنے قائد کی رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں اس لیے وزیر اعظم مختلف قومی امور پر قوم سے خطاب کر کے ان کو حالات سے آگاہ کرتا ہے۔

5- **قائد ایوان:** قومی اسمبلی میں اکثریت کا قائد ہونے کی وجہ سے وزیر اعظم ایوان کا بھی قائد ہوتا ہے کیونکہ اکثریت نے اس کو منتخب کیا ہوتا ہے۔ قائد ایوان ہونے کی وجہ سے اس کی تجاویز کو اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ ایوان کا ایجنڈا کنٹرول کرتا ہے کہ ایوان کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ ایوان کا اجلاس اس کی تجویز پر بلایا جاتا ہے اور اسی کی تجویز پر برخاست کیا جاتا ہے۔ صدر اس کے مشورے پر قومی اسمبلی توڑ بھی سکتا ہے۔ وزیر اعظم کو اسمبلی میں تقریر کرنے یا بحث کرنے کے لیے عام اراکین سے زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔ ایوان کی اکثریت اس کے احکامات پر عمل کرتی ہے۔ وزیر اعظم کا فرض ہے کہ وہ ایوان کے اراکین کے مسائل سنے، ان کی رہنمائی کرے اور ایوان میں جماعتی نظم و ضبط برقرار رکھے۔

6- **انتظامی فرائض:** پورے ملک کا انتظام چلانا وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کی ذمہ داری ہے وہ تمام شعبوں کے سربراہوں کو ہدایات جاری کرتا ہے۔ مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین کو ملک میں نافذ کرتا ہے اس سلسلے میں اس کے پاس وسیع اختیارات ہوتے ہیں۔ ملک میں امن و امان قائم کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے اس کے لیے اس کے پاس پولیس کا عملہ ہوتا ہے۔ ملک میں سرکاری ملازمین حکومت کی زیر نگرانی انتظامی امور سرانجام دیتے ہیں۔

7- **تقرری کے فرائض:** وزیر اعظم کو اعلیٰ انتظامی عہدوں پر صدر کے ساتھ مل کر تقرری کرنے کا اختیار حاصل ہے یہ عہدے سفارتی، وزارتی اور عدالتی ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم گورنروں، مسلح افواج کے سربراہوں، سپریم اور ہائی کورٹ کے ججوں، سفارتی عملے کے ارکان، قومی مالیاتی کمیشن کے ارکان، قومی اقتصادی کونسل کے ارکان کی تقرری میں صدر کو مشورہ دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

8- **اعزازات عطا کرنے کے اختیارات:** حکومت کی طرف سے مختلف شعبوں میں

نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو اعزازات عطا کیے جاتے ہیں یہ تمام اعزازات وزیراعظم کی سفارش پر صدر کے نام سے دیے جاتے ہیں۔

9- **خارجہ تعلقات:** وزیراعظم دوسرے ممالک کے دوروں پر جاتا ہے۔ خارجہ پالیسی مرتب کرتا ہے چونکہ وزیراعظم سربراہ کابینہ ہے اس وجہ سے وزیر خارجہ وزیراعظم کی مرضی سے خارجہ پالیسی طے کرتا ہے۔ دوسرے ممالک کے ساتھ لین دین' تجارت سیاسی مسائل میں حمایت اور مخالفت سب کچھ وزیراعظم کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وزیراعظم چاہے تو امور خارجہ کا محکمہ اپنے پاس بھی رکھ سکتا ہے۔ صدر دوسرے ممالک میں سفارتی عملے کا تقرر بھی وزیراعظم کے مشورے سے کرتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر مختلف سیاسی معاملات پر اپنے ملک و قوم کے موقف کی وضاحت کرنا بھی وزیراعظم کے فرائض میں شامل ہے۔

10- **قانون سازی کے اختیارات:** وزیراعظم قومی اسمبلی کا رکن ہونے کی وجہ سے قانون سازی میں حصہ لیتا ہے ساری کارروائی وزیراعظم کے مشورے سے ہوتی ہے۔ مسودات کو پیش کرنے اور بحث و مباحثے میں وزیراعظم مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ وزیراعظم اور اس کی کابینہ کی طرف سے پیش کیے گئے بل کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ وزیراعظم کو یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ صدر کو قومی اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے لیکن اگر صدر ایسا نہیں کرتا تو 48 گھنٹے کے اندر اسمبلی خودبخود ٹوٹ جاتی ہے۔ اگر قومی اسمبلی میں وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جا چکی ہو تو پھر اس مشورے پر عمل نہیں ہو گا۔

11- **مالیاتی اختیارات:** وزیراعظم مالیاتی امور میں گہری دلچسپی لیتا ہے کیونکہ پارلیمانی نظام حکومت میں بجٹ یا مالی بل ناکام ہو جانے کی صورت میں کابینہ کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ وزیر خزانہ بجٹ تیار کرتا ہے اور وزیراعظم سے مشورہ لیتا ہے۔ دراصل وہ وزیراعظم کی زیرنگرانی بجٹ تیار کرتا ہے۔ اس کی پارٹی کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ جس طرح چاہے بجٹ پر اثرانداز ہو سکتا ہے۔

12- **عوامی فلاح و بہبود:** وزیراعظم چونکہ عوام کا نمائندہ اور قائد ہوتا ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ عوام کی بہتری کے لیے کام کرے۔ وہ ملک میں زرعی اور صنعتی ترقی کو فروغ دینے کے لیے اقدامات کرتا ہے تعلیم پر بھرپور توجہ دیتا ہے تاکہ خواندگی کا تناسب بہتر ہو سکے عوام کو خوشحال زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے وہ اپنی کابینہ کے اراکین کو ہدایات جاری کرتا ہے عوام کی صحت کے مسائل کو دور کرنے کے لیے طبی تعلیم

اور طبی سہولتیں فراہم کرنے کی منصوبہ بندی کرتا ہے غرض کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

مجلس شوریٰ (Parliment)

1973ء کے آئین کے تحت ملک میں دوایوانی مقننہ قائم کی گئی۔ اس کا نام مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) رکھا گیا۔ ایوان زیریں کا نام قومی اسمبلی اور ایوان بالا کا نام سینٹ رکھا گیا قومی اسمبلی میں آبادی کے تناسب سے جبکہ سینٹ میں تمام صوبوں کو مساوی نمائندگی دی جاتی ہے۔

قومی اسمبلی (National Assembly)

قومی اسمبلی کو عوام براہ راست انتخاب کے ذریعے چنتے ہیں۔ اس کے ممبران کی تعداد 217 ہے، جس میں 207 مسلم اور 10 اقلیتوں کے نمائندے ہیں۔ نشستوں کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔ پنجاب 115، سندھ 46، سرحد 26، بلوچستان 11، قبائلی علاقے 8، اور اسلام آباد ایک۔ اقلیتوں کی نشستوں کی تقسیم اس طرح ہے عیسائی 4، ہندو اور شیڈول کاسٹ 4، سکھ بدھ پارسی ایک اور احمدی یا مرزائی ایک۔

اسمبلی کی میعاد: قومی اسمبلی کو پانچ سال کے لیے منتخب کیا جاتا ہے لیکن اس کو اس کی مدت سے پہلے وزیراعظم کے مشورے پر صدر توڑ سکتا ہے۔

اجلاس: قومی اسمبلی کے سال میں کم از کم تین اجلاس منعقد تے ہیں۔ اسمبلی کے کام کرنے کے دن 130 ہوتے ہیں۔ دو اجلاسوں کے درمیان 120 دن سے زیادہ وقفہ نہیں ہوتا۔ قومی اسمبلی کے ایک چوتھائی ارکان کی درخواست پر سپیکر اجلاس بلا سکتا ہے۔ درخواست کی وصولی کے بعد دو ہفتوں کے اندر اجلاس بلانا ضروری ہے۔ اجلاس کے مقام اور وقت کا تعین سپیکر خود کرتا ہے۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں خفیہ ووٹنگ ہوتی ہے۔ تمام فیصلے کثرت رائے سے کیے جاتے ہیں اسمبلی کے لیے کورم Quorum ایک چوتھائی ا. کان ہیں۔

قومی اسمبلی کی رکنیت کے لیے شرائط: (i) پاکستان کا شہری ہو (ii) عمر کم از کم 25 سال ہو (iii) سرکاری اور نیم سرکاری یا کسی اور نفع بخش عہدے پر فائز نہ ہو (iv) قومی

اسمبلی کے لیے تیار کی گئی ووٹر لسٹ میں اس کا نام درج ہو (v) پاگل اور دیوالیہ نہ ہو۔

1985ء میں کی گئی ترمیم کے مطابق متقی ہو' پرہیزگار ہو' اعلیٰ سیرت و کردار کا مالک ہو نظریہ پاکستان اور ملکی مفاد کے خلاف کسی سرگرمی میں ملوث نہ رہا ہو۔ غیر مسلموں کے لیے مسلمان ہونے کے علاوہ تمام شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

رکنیت سے علیحدگی: اگر کوئی رکن ایک سے زیادہ نشستوں پر کامیاب ہو جائے تو وہ صرف ایک نشست رکھ سکتا ہے باقی نشستوں سے اس کو دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اگر اسمبلی کا رکن سپیکر کو اطلاع دیے بغیر مسلسل چالیس اجلاس سے غیر حاضر رہے تو سپیکر اس کی نشست کو خالی قرار دے سکتا ہے۔ اسمبلی کا کوئی رکن سپیکر کو اپنا استعفیٰ پیش کر کے اپنی رکنیت چھوڑ سکتا ہے۔

اراکین کو مراعات: پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین کو یکساں مراعات حاصل ہیں۔ پارلیمنٹ کے تمام اراکین قانون کی حدود میں رہتے ہوئے اجلاس کے دوران اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکیں گے اس رائے کے خلاف عدالتی کارروائی نہیں کی جائے گی پارلیمنٹ کے قوانین کے مطابق تمام اراکین کو تنخواہ' الاؤنس اور دیگر مراعات دی جاتی ہیں۔

سپیکر اور ڈپٹی سپیکر

قومی اسمبلی اپنے انتخاب کے بعد سب سے پہلے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کو منتخب کرتی ہے دونوں قومی اسمبلی کے ارکان ہوتے ہیں سپیکر اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے جبکہ ڈپٹی سپیکر اس کی غیر حاضری کی صورت میں وہ تمام امور سرانجام دیتا ہے جو سپیکر کو سرانجام دینا ہوتے ہیں۔

سپیکر کے فرائض

1- **اجلاس کی صدارت:** سپیکر قومی اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے ایوان کی کارروائی کو کنٹرول کرتا ہے اور پوائنٹ آف آرڈر پر فیصلہ دیتا ہے۔

2- **نظم و ضبط:** سپیکر ایوان میں نظم و ضبط قائم کرتا ہے تمام ارکان کو بل پر بحث کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ارکان کو مہذب رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسمبلی کی کارروائی

کے دوران اگر کوئی رکن حکم کی تعمیل نہ کرے تو اسے ایوان سے باہر نکل جانے کے لیے کہہ سکتا ہے اگر وہ پھر بھی نہ جائے تو وہ اپنی مدد کے لیے سارجنٹ ایٹ آرمز کو بلا سکتا ہے۔

3- **تحاریک اور سوالات :** ایوان میں تمام تحاریک سپیکر کے توسط سے پیش ہوتیں ہیں اسمبلی کے اراکین سپیکر کی اجازت سے وزراء سے سوالات پوچھ سکتے ہیں۔

4- **مالی بل :** قانون سازی کے لیے تمام بل سپیکر کی اجازت سے پیش ہوتے ہیں کسی بل کو مالی بل قرار دینا بھی سپیکر کے اختیارات میں شامل ہے۔

5- **اجلاس کی طلبی اور التوا :** سپیکر اسمبلی کا اجلاس بلاتا ہے اور ملتوی بھی کر سکتا ہے۔ کورم پورا نہ ہونے کی صورت میں اجلاس ختم کرنے کا اعلان بھی کر سکتا ہے۔

6- **فیصلہ کن ووٹ :** سپیکر عام طور پر اسمبلی میں ووٹنگ کے دوران ووٹ کا استعمال نہیں کرتا لیکن اگر کسی مسودے پر ووٹ مساوی ہوں تو فیصلہ کن ووٹ استعمال کرتا ہے۔

سینٹ (Sanate)

سینٹ مجلس شوریٰ کا ایوان بالا ہے جس میں چاروں صوبوں کو برابر نمائندگی دی جاتی ہے۔ اس کے اراکین کی تعداد 87 ہے جس میں 19 نشستیں ہر صوبے کے لیے مخصوص ہیں ان میں چودہ عام اور پانچ نشستیں علما اور ماہرین کے لیے ہیں۔ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کے لیے آٹھ اور اسلام آباد کے لیے تین نشستیں ہیں۔

انتخاب : صوبائی اسمبلیاں واحد قابل انتقال ووٹ یعنی ہیر سسٹم Hare System کے ذریعے اپنے نمائندوں کو چنتی ہیں۔ وفاقی دارالحکومت کے نمائندوں کو قومی اسمبلی منتخب کرتی ہے جب کہ قبائلی علاقوں کے اراکین اسمبلی اپنے نمائندے سینٹ میں منتخب کر کے بھیجتے ہیں۔

سینٹ کی میعاد : سینٹ ایک مستقل ایوان ہے اس کے ارکان چھ سال تک کام کرتے ہیں۔ آدھے ارکان تین سال بعد ریٹائرڈ ہو جاتے ہیں۔ سینٹ کے 14 عام ارکان میں 7 ایک مرتبہ اور 7 دوسری مرتبہ ریٹائرڈ ہوتے ہیں۔ پانچ ماہرین میں 2 پہلے اور 3 بعد میں ریٹائرڈ ہوتے ہیں۔ قبائلی علاقوں کے بھی چار چار کر کے جبکہ وفاقی دارالحکومت میں سے ایک پہلے اور دو بعد میں ریٹائرڈ ہوتے ہیں۔

سینٹ کے ارکان کے لیے شرائط : سینٹ کے ارکان کے لیے لازمی ہے کہ ان کی عمر کم از کم تیس سال ہو۔ وہ پاکستان کے شہری ہوں پاگل اور دیوالیہ نہ ہوں کسی سرکاری و نیم سرکاری عہدے پر ملازم نہ ہوں متقی ہوں پرہیز گار ہوں نظریہ پاکستان کے مخالف نہ ہوں۔

اجلاس : سال میں کم از کم تین اجلاس منعقد کیے جاتے ہیں اور ان کے کام کرنے کی مدت 130 دن ہوتی ہے۔ دو اجلاسوں کے درمیان وقفہ 120 دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کورم ایک چوتھائی ارکان ہے۔

چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین

چیئرمین سینٹ کے اجلاس کی صدرات کرتا ہے جبکہ ڈپٹی چیئرمین اس کی غیر حاضری کی صورت میں اجلاس کی صدارت کرتا ہے۔ سینٹ ہر تین سال بعد اپنے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کا انتخاب کرتا ہے۔ چیئرمین کو وہی فرائض سرانجام دینا ہوتے ہیں جو سپیکر قومی اسمبلی سرانجام دیتا ہے۔ سینٹ کا چیئرمین صدر کی ملک میں عدم موجودگی کی صورت میں قائم مقام صدر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

پارلیمنٹ کے فرائض
(Responsibilities of Parliament)

1- **قانون سازی :** پارلیمنٹ ملک کا قانون ساز ادارہ ہونے کے ناطے ملک کے لیے قوانین بناتی ہے۔ یہ مرکزی اور مشترکہ امور کی فہرست میں شامل امور کے بارے میں قانون سازی کرتی ہے دونوں ایوانوں کو قانون بنانے کے یکساں اختیارات حاصل ہیں البتہ مالی بل کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے اور وہی اس کو منظور کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہے لیکن سینٹ کے اراکین مختلف قراردادوں اور تحاریک کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار کرسکتے ہیں۔ پارلیمنٹ ان علاقوں کے لیے بھی قانون سازی کرتی ہے جو صوبے کی حدود میں شامل نہیں بلکہ بعض اوقات صوبوں کی درخواست پر صوبوں کے لیے قانون سازی کرتی ہے گوکہ صوبوں کو اس میں ردوبدل کا اختیار حاصل ہے۔ متعلقہ امور کے بارے میں اگر مرکز اور صوبے بیک وقت قانون بنالیں تو پھر پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون

نافذالعمل ہو گا۔ ایک بل پارلیمنٹ میں مختلف مراحل طے کرتا ہے' پہلے مسودہ تیار کیا جاتا ہے پھر ایوان میں پیش کیا جاتا ہے۔ سپیکر بل کو منتخب کر کے بل کی خواندگی کے لیے دن مقرر کرتا ہے۔ اس دن بل کی پہلی خواندگی ہوتی ہے جس میں بل کا تعارف کروایا جاتا ہے اس کے بعد دوسری خواندگی ہوتی ہے۔ جس میں بل کے بارے میں کھل کر بحث ہوتی ہے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ بل کامیاب ہو گا یا ناکام۔ اگر تو یہ ظاہر ہو جائے کہ بل کو اکثریت کی حمایت حاصل ہے تو پھر اسے کمیٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہےورنہ اس کو رد کر دیا جاتا ہے۔ کمیٹی اپنی رپورٹ تیار کر کے بھیجتی ہے اور تیسری خواندگی ہوتی ہے جس میں تفصیل سے بحث ہوتی ہے بلکہ سپیکر ووٹنگ کرواتا ہے۔ اگر بل پاس ہو جائے تو سینٹ میں بھیج دیا جاتا ہے' سینٹ بل کو یا تو پاس کر دیتا ہے یا پھر رد کر دیتا ہے اگر سینٹ 90 دن کے اندر فیصلہ نہ دے تو قومی اسمبلی دوبارہ غور و حوض کے بعد بل پاس کرے تو سینٹ کی منظوری کی ضرورت نہیں رہتی۔ سینٹ ترمیم کی تجویز پیش کرے یا اختلاف رکھے تو صدر دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کر سکتا ہے۔ اگر اتفاق رائے ہو جائے اور سادہ اکثریت اس کو منظور کرے تو پھر بل صدر کی منظوری کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ صدر 30 دن کے اندر یا تو منظور کر لیتا ہے یا دوبارہ نظرثانی کے لیے بھیج دیتا ہے' صدر چاہے تو ریفرنڈم بھی کروا سکتا ہے۔

2- آئین میں ترمیم : پارلیمنٹ کے دونوں ایوان مل کر آئین میں ترمیم کر سکتے ہیں ترمیم کا بل کسی بھی ایوان میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر دونوں ایوان اس کو دو تہائی اکثریت سے منظور کر لیں تو پھر اسے صدر کی منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔ صدر منظوری نہ دے تو بھی ترمیم ہو جاتی ہے۔ اگر کسی ترمیم سے صوبائی حدود متاثر ہوں تو متعلقہ صوبوں کی رضامندی بہت ضروری ہے۔

3- انتظامیہ کی نگرانی : پارلیمانی طرز حکومت میں انتظامیہ مقننہ کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ انتظامیہ کا تعلق چونکہ دونوں ایوانوں سے ہوتا ہے اس لیے دونوں ایوانوں کے اجلاسوں میں کابینہ کے ارکان شرکت کرتے ہیں۔ مقننہ انتظامیہ کی نگرانی کرتی ہے اور اسے اپنی نگرانی کا احساس سوالات کے ذریعے کرواتی ہے۔ مختلف شعبوں کی کارکردگی اور غلطیوں کو سوالات کے ذریعے منظر عام پر لاتی ہے۔ پارلیمنٹ میں تحاریک کے ذریعے اہم مسئلوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے جن میں تحریک التوا اور تحریک استحقاق شامل ہیں۔ قومی اسمبلی وزیر اعظم کا انتخاب بھی کرتی ہے اور اس کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک بھی پاس کی سکتی ہے۔

4- **مالیاتی اختیارات :** مجلس شوریٰ کو مالیات پر بھی کنٹرول حاصل ہے۔ کابینہ بجٹ بنا کر قومی اسمبلی میں پیش کرتی ہے جس پر بحث ہوتی ہے۔ قومی اسمبلی اس کو پاس کرتی ہے اس کی منظوری کے بغیر عوام پر نئے ٹیکس عائد نہیں کیے جا سکتے۔ تمام مالیاتی بل قومی اسمبلی میں پیش کیے جاتے ہیں اس طرح پوری اسمبلی کو مالیاتی اختیارات میں سینٹ پر برتری حاصل ہے۔ سینٹ کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی تجاویز قومی اسمبلی کو بھیجے یا پھر مختلف قراردادوں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ قومی اسمبلی ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ان تجاویز کو مان لے۔

5- **انتخابی اختیارات :** مجلس شوریٰ اپنے سپیکر، ڈپٹی سپیکر، چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کا انتخاب کرتی ہے۔ دونوں ایوان اور چاروں صوبائی اسمبلیاں مل کر صدر منتخب کرتے ہیں۔ وزیراعظم کو قومی اسمبلی منتخب کرتی ہے۔ قومی اسمبلی سینٹ کے وفاقی دارالحکومت کے نمائندوں کو بھی منتخب کرتی ہے۔

6- **عدالتی اختیارات :** آئین کے تحت پارلیمنٹ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی تعداد کا تعین کرتی ہے۔ ان کے لیے اصول اور ضابطے بناتی ہے اور ان کی تنخواہ کا تعین کرتی ہے۔ صدر کو برطرف کرنے کے لیے مواخذہ کی تحریک بھی نیم عدالتی قسم کی کارروائی ہے جو کہ پارلیمنٹ میں کی جاتی ہے۔ صدر کو بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے اس کے بعد ووٹنگ کروائی جاتی ہے اگر اکثریت تحریک کے حق میں فیصلہ دے تو صدر کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔

7- **عوام کے مسائل حل کرنے کا اختیار :** پارلیمنٹ کے دونوں ایوان عوام کے مسائل حل کرتے ہیں۔ وہ اپنے سوالات اور بحث کے ذریعے حکومت کو متوجہ کرتے ہیں وزرا بھی چونکہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں اس لیے وہ پارلیمنٹ کی طرف سے پیش کردہ عوامی مسائل کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو حکومت کی طرف سے فنڈز بھی دیے جاتے ہیں جس سے وہ اپنے حلقوں کے عوام کے مسائل کو حل کرتے ہیں۔

گورنر (Governor)

گورنر صوبے کا سربراہ ہوتا ہے۔ آئین کی دفعہ 101 کے مطابق صوبائی گورنروں کا تقرر

صدر وزیراعظم کے مشورے سے کرتا ہے۔ گورنر اس وقت تک اپنے عہدے پر کام کر سکتا ہے جب تک صدر اس سے مطمئن ہو۔ گورنر اگر استعفیٰ دینا چاہے تو وہ صدر کو دے سکتا ہے۔ گورنر چیف جسٹس آف ہائی کورٹ کے سامنے حلف اٹھاتا ہے۔

گورنر کے لیے شرائط و پابندیاں : گورنر کے لیے لازمی ہے کہ اس کی عمر کم از کم 35 سال ہو۔ قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل ہو۔ وہ کسی نفع بخش عہدے پر کام نہ کرتا ہو۔ گورنر کسی اسمبلی کا رکن نہیں بن سکتا اگر رکن بننا چاہے تو گورنر کی حیثیت سے استعفیٰ دیدے۔

مراعات : گورنر کو حکومت کی طرف سے تنخواہ اور الاؤنس دیے جاتے ہیں جن کا تعین صدر کرتے ہے۔ گورنر کو مفت رہائش اور ٹرانسپورٹ کی سہولت دی جاتی ہے۔ گورنر پر کسی بھی عدالت میں فوجداری مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ دیوانی مقدمے کی صورت میں 60 دن پہلے نوٹس دینا ضروری ہے۔ اگر گورنر ملک سے باہر ہو یا بیماری کے باعث رخصت پر ہو تو صدر کسی دوسرے شخص کو قائم مقام گورنر نامزد کر سکتا ہے۔

اختیارات و فرائض

گورنر صوبے کا انتظامی سربراہ ہے تاہم وہ بعض معاملات میں صوبائی وزیراعلیٰ کے مشوروں کا پابند ہوتا ہے۔

1- انتظامی فرائض : تمام انتظامی امور گورنر کے نام سے طے کیے جاتے ہیں۔ گورنر وزیراعلیٰ کو کابینہ کے چناؤ میں مشورہ دے سکتا ہے۔ گورنر وزیراعلیٰ کے مشورے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر دونوں میں اختلافات ہو تو گورنر وزیراعلیٰ کو دوبارہ غور کرنے کے لیے کہہ سکتا ہے۔ تین ماہ کے بعد بھی اگر وزیراعلیٰ اور اس کی کابینہ اپنے فیصلے پر عمل کرے تو گورنر کو ان کے ساتھ متفق ہونا پڑے گا۔ گورنر ان انتظامی امور کو سرانجام دے گا جو صدر اس کو کرنے کے لیے کہے گا۔

2- تقرری کے اختیارات : صوبائی سطح پر گورنر اعلیٰ عہدیداروں کا تقرر کرتا ہے گو کہ وہ ان تقرریوں میں صدر اور وزیراعلیٰ سے مشورہ لیتا ہے۔ گورنر صوبائی پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین اور ارکان، ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور اس کے ججوں اور ایڈووکیٹ جنرل کا

تقرر کرتا ہے۔

3- ہنگامی حالات میں **فرائض** : گورنر ہنگامی حالات کی صورت میں صوبے کا انتظام صدر کی مرضی سے چلاتا ہے اگر کسی صوبے کے حالات اس کی حکومت کے کنٹرول سے باہر ہو جائیں تو صدر اس صوبے میں ہنگامی حالات کا نفاذ کر دیتا ہے اور گورنر کو صوبے کے انظام چلانے کے لیے ہدایات جاری کرتا ہے۔ اس طرح صوبے میں گورنر راج قائم ہو جاتا ہے اور تمام انتظامی اختیارات گورنر کے پاس چلے جاتے ہیں۔

4- قانون سازی کے **فرائض** : گورنر صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلا سکتا ہے اسے ملتوی بھی کر سکتا ہے۔ گورنر اسمبلی سے خطاب بھی کر سکتا ہے۔ اسمبلی کے پاس کردہ بلوں پر توثیقی دستخط بھی کرتا ہے۔ اسمبلی کو قانون بننے سے پہلے پیغامات بھی بھیج سکتا ہے۔ وزیراعلیٰ گورنر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے سکتا ہے اور اگر گورنر اس پر عمل نہ کرتے تو 48 گھنٹے کے اندر اسمبلی خود بخود ٹوٹ جائے گی۔ اگر اسمبلی میں وزیراعلیٰ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جا چکی ہو تو اسمبلی نہیں ٹوٹے گی۔ اسمبلی کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو گورنر ضرورت پڑنے پر حکم نامے جاری کر سکتا ہے جو تین ماہ تک نافذ العمل رہ سکتے ہیں اور اگر اسمبلی منظور کرے تو قوانین بن جاتے ہیں۔

5- مالیاتی اختیارات : صوبائی اسمبلی میں صوبائی کابینہ بجٹ پیش کرتی ہے۔ بجٹ پاس ہونے کے بعد گورنر کے پاس منظوری کے لیے بھیجا جاتا ہے جس پر وہ دستخط کرکے اس کو منظور کرتا ہے۔ گورنر صوبائی وزیر خزانہ کو پیغامات بھی بھیجتا ہے۔

وزیراعلیٰ (Chief Minister)

آئین کے تحت صوبوں میں بھی پارلیمانی طرز حکومت رائج کیا گیا ہے۔ وزیراعلیٰ صوبائی حکومت کا سربراہ ہے اور صوبے کا انتظام چلاتا ہے۔

وزیراعلیٰ کا انتخاب : صوبائی اسمبلی اپنے پہلے اجلاس میں سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کا انتخاب کرتی ہے اس کے بعد وزیراعلیٰ کا چناؤ ہوتا ہے۔ وزیراعلیٰ اسمبلی کا رکن ہوتا ہے جو امیدوار اکثریت حاصل کرتا ہے وہ وزیراعلیٰ کا عہدہ سنبھال لیتا ہے اور وزیراعلیٰ گورنر کے سامنے حلف اٹھاتا ہے۔

وزیر اعلیٰ کی معیاد عہدہ اور علیحدگی: اس کے عہدے کی کوئی معیاد نہیں ہے وہ اس وقت تک عہدے پر کام کر سکتا ہے جب تک اس کو اسمبلی کا اعتماد حاصل رہے۔ اگر اسمبلی ٹوٹ جائے تو بھی گورنر اس کو کام کرنے کے لیے کہہ سکتا ہے، لیکن صدر نئی نگران کابینہ کے تقرر کی ہدایت جاری کر سکتا ہے۔ وزیر اعلیٰ اپنی مرضی سے اپنا استعفیٰ گورنر کو پیش کرکے اپنے عہدے سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔

اختیارات و فرائض

1- **صوبائی کابینہ کا چناؤ:** وزیر اعلیٰ اپنی کابینہ کے ارکان اسمبلی میں سے چنتا ہے اور پھر اس کی منظوری گورنر سے لیتا ہے۔ وہ وزرا کے مابین شعبوں کو تقسیم کرتا ہے اس سلسلے میں وہ متعلقہ وزیر کی ذہانت اور قابلیت کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔

2- **صوبائی اسمبلی کی قیادت:** وزیر اعلیٰ صوبائی اسمبلی کی قیادت کرتا ہے کیونکہ اس کی پارٹی کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اسمبلی کے اراکین کو نظم و ضبط کی پاسداری کی ہدایات جاری کرتا ہے تاکہ اسمبلی کا ماحول خوشگوار رہے۔ وہ اسمبلی کے اراکین کی شکایات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

3- **صوبائی گورنر اور کابینہ میں رابطہ:** وزیر اعلیٰ گورنر اور کابینہ کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے۔ گو کہ وزرا بھی گورنر سے ملاقات کر سکتے ہیں، لیکن وزیر اعلیٰ تمام شعبوں کی مجموعی کارکردگی سے گورنر کو آگاہ رکھتا ہے اور گورنر کی ہدایات اور مشورے کابینہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔

4- **انتظامی فرائض:** وزیر اعلیٰ صوبے کا منتظم اعلیٰ ہوتا ہے وہ صوبے کا انتظام چلاتا ہے۔ نظم و نسق چلانے کے لیے قوانین کا نفاذ بھی کرتا ہے۔ صوبے میں امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ رفاہ عامہ اور تعمیر و ترقی کے کاموں کی وہ براہ راست نگرانی کرتا ہے۔

5- **قانون سازی کے فرائض:** وزیر اعلیٰ چونکہ اسمبلی کا رکن ہوتا ہے اس لیے وہ اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہو کر بحث میں حصہ بھی لیتا ہے۔ زیادہ تر بل وزیر اعلیٰ اور اس کی کابینہ کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں اور وہی کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ گورنر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ بھی دے سکتا ہے اگر گورنر اس پر عمل نہ کرے تو

48 گھنٹے کے اندر اسمبلی خود ہی ٹوٹ جائے گی، لیکن اگر اس کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جا چکی ہو تو پھر اسمبلی نہیں ٹوٹتی۔

6- **مالیاتی اختیارات**: وزیراعلیٰ کو مالیات پر بھی کنٹرول حاصل ہے کیونکہ اس کی کابینہ کا وزیر بجٹ تیار کرتا ہے، وزیراعلیٰ اس کی معاونت کرتا ہے۔ متعدد مالی بل بھی وزیراعلیٰ اور اس کی کابینہ کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔

7- **عوام کی شکایات دور کرنے کا اختیار**: عوام کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے عوام کی شکایات کو دور کرنا اس کے اختیارات میں شامل ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو عوام کی شکایات دور کرنے کی ہدایات جاری کرتا ہے۔ صوبے میں بیروزگاری ختم کرنے، صنعتی اور زرعی مسائل حل کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔

صوبائی خودمختاری

(Provincial Autonomy)

1973ء کا آئین وفاقی آئین ہے اس کے تحت مرکزی حکومت اور اس کے زیر انتظام قبائلی علاقے اور چار صوبائی حکومتیں کام کر رہی ہیں۔ 1956ء اور 1962ء کے آئینوں کے برعکس اس میں صوبوں کو داخلی خودمختاری دی گئی ہے اور اختیارات کی تقسیم کچھ اس طریقے سے کی گئی ہے کہ چاروں صوبے مطمئن ہیں۔ صوبوں کو ان کے داخلی امور میں مکمل اختیارات دیے گئے ہیں جس سے انہیں خود مختاری کا احساس دلایا گیا ہے۔ صوبوں کو آپس کی تجارت کی مکمل آزادی دی گئی ہے تاہم جہاں ضروری سمجھا جائے وہاں پارلیمینٹ پابندی عائد کر سکتی ہے۔ مرکز اور صوبوں میں دو فہرستوں کے تحت اختیارات تقسیم کیے گئے ہیں۔ ایک مرکزی فہرست اور دوسری متصلہ امور کی فہرست جبکہ باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو دیے گئے ہیں۔ اس طرح صوبائی حکومتیں ایسے بے شمار امور جن کا دونوں فہرستوں میں ذکر نہیں، سرانجام دینے میں خودمختار ہیں مثلاً زراعت، صنعت اور تعلیم کے شعبوں میں صوبائی حکومتیں اپنی مرضی سے پالیسیاں بنا سکتی ہیں۔ انتظامی امور میں بھی صوبے خودمختار ہیں۔ ہر صوبے کی اپنی خودمختار انتظامیہ ہے جو صوبے کا انتظام چلاتی ہے لیکن اس کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ اس کے احکامات مرکزی انتظامیہ کے متصادم نہ ہوں۔ صوبائی اسمبلی کی اجازت کے بغیر صوبائی حدود میں ردو بدل نہیں کیا جا سکتا۔ وفاقی حکومت صوبوں کو اپنے

اعلیٰ افسران مہیا کرتی ہے جو صوبے کا انتظام چلاتے ہیں اور صوبائی حکومت کی مدد کرتے ہیں۔ عدالتی نظام اگرچہ صوبائی سطح پر الگ نہیں لیکن عدلیہ اپنے فرائض آزادانہ سرانجام دے رہی ہے۔ اگر کسی صوبے کا انتظام صحیح طریقے سے نہ چل رہا ہو یا وہاں پر تخریب کار امن عامہ کو خراب کر رہے ہوں یا ملکی سلامتی کو بیرون ملک سے خطرہ ہو تو ایسی صورت میں ملک میں ہنگامی حالات کا نفاذ کیا جا سکتا ہے اور اس طرح پورے ملک کا انتظام مرکزی حکومت چلاتی ہے۔

مالیاتی لحاظ سے بھی صوبائی حکومتیں مکمل طور پر خودمختار نہیں ہیں۔ گو کہ صوبائی حکومتیں اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے عوام پر ٹیکس عائد کر سکتی ہیں لیکن پھر بھی وہ مرکز کی محتاج ہیں۔ مرکزی حکومت ان کو مالی امداد دیتی ہے۔ صوبوں کو قومی آمدنی سے مناسب حصہ دینے کا بھی خاطرخواہ انتظام کیا گیا ہے۔ سوئی گیس اور بجلی سے حاصل ہونے والی آمدنی ان صوبوں کو ملے گی جہاں ان کے وسائل ہیں۔ تیل اور گیس کو بھی متصلہ امور کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ قومی مالیاتی کمیشن مرکز و صوبوں کے مالیاتی امور کو طے کرتا ہے جبکہ آڈیٹر جنرل پورے ملک کا حساب کتاب چیک کرتا ہے۔ اس طرح مالیات میں صوبے مکمل طور پر آزاد نہیں ہیں' لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ صوبوں کو حد کے اندر رکھتے ہوئے خودمختاری دی گئی ہے جس سے صوبائی خودمختاری کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔

سپریم کورٹ (Supreme Court)

سپریم کورٹ ملک کی اعلیٰ عدالت ہے اس کو ملک کی تمام عدالتوں پر برتری حاصل ہے۔ سپریم کورٹ کا صدر مقام اسلام آباد ہے۔ لیکن اس کے مستقل بنچ لاہور اور کراچی میں بھی واقع ہیں۔

سپریم کورٹ کی تنظیم و تشکیل: آئین کے آرٹیکل 176 کے مطابق سپریم کورٹ ایک چیف جسٹس اور اتنے ججوں پر مشتمل ہوگی جن کی تعداد کا تعین پارلیمینٹ قانون سازی کے ذریعے کرے گی لیکن جب تک اس قسم کی قانون سازی نہیں ہوگی صدر ججوں کی تعداد کا تعین کرے گا۔ صدر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا تقرر کرے گا اور پھر باقی ججوں کا تقرر چیف جسٹس کے مشورے سے کرے گا۔

ججوں کے لیے شرائط: 1۔ پاکستان کا باقاعدہ شہری ہو 2۔ پانچ سال تک ہائیکورٹ کا جج رہ

چکا ہو یا پھر ہائی کورٹ میں پندرہ سال تک ایڈووکیٹ رہا ہو۔

ریٹائرمنٹ اور برطرفی: سپریم کورٹ کا جج 65 سال تک اپنے عہدے پر کام کرتا ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے وہ استعفیٰ بھی دے سکتا ہے اور بدعنوانی کی وجہ سے اس کو برطرف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ عدالتی کونسل تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ بدعنوان ہے یا ذہنی اور جسمانی لحاظ سے معذور ہو گیا ہے اور پھر صدر اس فیصلے پر عمل کرتا ہے۔ جب جج کسی وجہ سے اپنے فرائض ادا نہ کر پا رہا ہو تو صدر قائم مقام چیف جسٹس اور عارضی ججوں کا تقرر کر سکتا ہے۔ اگر کام کا بوجھ بڑھ جائے تو بھی صدر اضافی ججوں کا تقرر کرتا ہے۔

تنخواہ اور مراعات: سپریم کورٹ کے ججوں اور چیف جسٹس کو معقول تنخواہ دی جاتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد معقول پنشن بھی دی جاتی ہے۔ ان کو وہ تمام سہولتیں اور الاؤنس بھی دیے جاتے ہیں جن کا تعین صدر کرتا ہے۔ ان کی تنخواہ اور الاؤنس پر نظرثانی ہوتی رہتی ہے۔ ان کو رہائش اور آمدورفت کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔

پابندیاں: سپریم کورٹ کا جج اپنا عہدہ چھوڑ کر کسی نفع بخش عہدے پر کام نہیں کر سکتا لیکن چند عہدوں سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ جس میں چیف الیکشن کمشنر، عدالتی یا نیم عدالتی منصب، آئینی کمیشن کی رکنیت اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی یا رکنیت شامل ہے۔ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس یا جج ریٹائرمنٹ کے بعد کسی عدالت میں بطور وکیل پیش نہیں ہو سکتا۔

اختیارات و فرائض

1- ابتدائی اختیارات: آئین کے آرٹیکل 184 کے تحت سپریم کورٹ ایسے تنازعات طے کرتی ہے جو مرکزی حکومت کے کسی ایک یا ایک سے زائد صوبوں کے ساتھ ہوں یا پھر صوبوں کے آپس میں تنازعات ہوں۔ ایسے مقدمات صرف سپریم کورٹ میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو ابتدائی اختیارات کہا جاتا ہے۔ سپریم کورٹ ان کو طے کرتے وقت توضیعی فیصلے دیتی ہے تاکہ ان کے حقوق و فرائض کا تعین ہو سکے۔

2- اپیلوں کی سماعت کا اختیار: ہائی کورٹوں کے فیصلے کے خلاف اپیل سپریم کورٹ میں دائر کی جا سکتی ہیں۔ یہ دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کی اپیلیں سنتی ہے۔ دیوانی مقدمات

کے لیے ضروری ہے کہ ان کی مالیت پچاس ہزار سے کم نہ ہو۔ ہائی کورٹ اگر کسی کو توہین عدالت کی بنا پر سزا دے تو بھی سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکتی ہے۔ اگر ہائی کورٹ کسی ماتحت عدالت کی طرف سے سنائی گئی سزا سے زیادہ سزا سنا دے تو بھی سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکتی ہے۔ سروس ٹریبونل کے فیصلے کے خلاف بھی سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکتی ہے۔

3- ہدایات اور احکامات جاری کرنے کا اختیار: سپریم کورٹ زیر سماعت مقدمات کے سلسلے میں عدل و انصاف کی خاطر ہدایات جاری کر سکتی ہے۔ اس کے لیے وہ کسی بھی فرد یا دستاویز کو اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اس قسم کی ہدایات کا اطلاق پورے ملک پر ہو گا۔ سپریم کورٹ کسی بھی ادارے یا شخص کو حکم امر کے تحت کام کرنے کے احکامات جاری کر سکتی ہے جو ان کے دائرہ اختیار میں شامل ہوں اسی طرح حکم امتناعی کے ذریعے ایسے کام کرنے سے روک سکتی ہے جو ان کے اختیار میں شامل نہ ہوں۔ سپریم کورٹ کسی سرکاری ادارے یا افراد کے ایسے احکامات کو غیر موثر قرار دے سکتی ہے جنہیں وہ قانونی طور پر کرنے کے مجاز نہ تھے۔ پروانہ حبس بے جا کی بنیاد پر وہ کسی متاثرہ فرد کی درخواست پر کسی نظربند شخص کو عدالت کے سامنے پیش کرنے کا حکم دے سکتی ہے تاکہ متاثرہ شخص کو عدالت کے سامنے پیش کر کے انصاف مہیا کیا جا سکے۔

4- آئین کی تشریح: سپریم کورٹ کو آئین کی تشریح کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اگر آئین کسی معاملہ میں وضاحت نہ کرتا ہو تو سپریم کورٹ کو وضاحت کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ سپریم کورٹ جو بھی وضاحت پیش کرے اس پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔

5- بنیادی حقوق کا تحفظ: سپریم کورٹ عوام کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ اگر آئین میں شامل بنیادی حقوق شہریوں کو فراہم نہ کیے جائیں تو شہری سپریم کورٹ سے حقوق فراہم کرنے کی اپیل کر سکتے ہیں۔ سپریم کورٹ بنیادی حقوق بحال کرنے کے لیے احکامات بھی جاری کرتی ہے۔

6- مشاورتی اختیارات: صدر کسی مسئلے پر سپریم کورٹ سے مشورہ طلب کر سکتا ہے۔ سپریم کورٹ ایک رپورٹ کی صورت میں صدر کو مشورہ دے گی لیکن صدر کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ صدر اس مشورے کو نظرانداز بھی کر سکتا ہے۔ لیکن مشورہ مانگنے پر مشورہ دینا سپریم کورٹ کا فرض ہے۔

7- **آئین کا تحفظ :** آئین کی حفاظت سپریم کورٹ کی ذمہ داری ہے۔ اگر انتظامیہ یا مقننہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جو آئین کے منافی ہو تو اس کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدمہ کیا جا سکتا ہے۔ مئی 1988ء میں جنرل ضیاء الحق نے جونیجو وزارت کو برطرف کر دیا۔ سپریم کورٹ نے اس اقدام کو غیر آئینی قرار دیا۔ 1993ء میں صدر غلام اسحاق خاں نے قومی اسمبلی توڑ دی اور نواز شریف کی وزارت کو برطرف کر دیا تو پھر سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو غیر آئینی قرار دے دیا۔

8- **نظرثانی اور نگرانی کے اختیارات :** آئین میں سپریم کورٹ کو عدالتی نظرثانی کا اختیار نہیں دیا گیا لیکن یہ اپنے ہی کیے گئے فیصلوں پر نظرثانی کا اختیار رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص کو موت کی سزا سنائی جائے تو وہ فیصلہ پر نظرثانی کی اپیل کر سکتا ہے۔ یہ اختیار اس لیے دیا گیا ہے کہ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کو دور کیا جا سکے۔ سپریم کورٹ ہائی کورٹس کی نگرانی کرتی ہے اور انہیں ہدایات جاری کرتی ہے۔

ہائی کورٹ (High Court)

پاکستان کے ہر صوبے میں ایک بڑی عدالت قائم کی گئی ہے جس کو ہائی کورٹ کہتے ہیں۔ یہ صوبے میں ماتحت عدالتوں کی نگرانی کرتی ہے۔

تنظیم و تشکیل : ہائی کورٹ ایک چیف جسٹس اور اتنے ججوں پر مشتمل ہوگی جن کی تعداد کا تعین پارلیمنٹ کرے گی لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا ہو تو صدر ججوں کی تعداد کا تعین کرے گا۔ صدر ججوں کا تبادلہ ایک ہائی کورٹ سے دوسری ہائی کورٹ میں کر سکتا ہے۔ ہائی کورٹس کے صدر مقام متعلقہ صوبوں کے دارالحکومت میں ہوتے ہیں۔ 1985ء کی ترمیم کے ذریعے ہائی کورٹ کے بنچوں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ اس لیے وہ دوسرے شہروں میں بھی قائم کیے جا سکتے ہیں۔

ججوں کے لیے شرائط : ہائی کورٹ کے ججوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے شہری ہوں۔ ان کی عمر کم از کم 40 سال ہو۔ ہائی کورٹ میں کم از کم دس سال تک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے کام کیا ہو یا سول سروس کا دس سالہ تجربہ بشمول تین سال ڈسٹرکٹ جج کی حیثیت سے کام یا پھر پاکستان میں دس سال تک عدالتی عہدے پر کام کیا ہو۔

ریٹائرمنٹ اور برطرفی: ہائی کورٹ کے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر 62 سال ہے لیکن اس سے پہلے بھی وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے سکتے ہیں۔ اعلیٰ عدالتی کونسل بھی ذہنی معذوری یا بدعنوانی کی صورت میں مواخذہ کی تحریک کے ذریعے برطرف کروا سکتی ہے۔ اگر چیف جسٹس کا عہدہ بیماری یا کسی اور وجہ سے خالی ہو تو صدر ہائی کورٹ کے کسی بھی جج کو قائمقام چیف جسٹس مقرر کر سکتا ہے۔ اگر عدالت میں کام کا بوجھ بڑھ جائے یا کوئی جج رخصت پر ہو تو صدر عارضی ججوں کا تقرر کر سکتا ہے۔

تنخواہ اور مراعات: ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور ججوں کو معقول تنخواہ دی جاتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد معقول پنشن بھی دی جاتی ہے۔ ججوں کو رہائش اور آمدورفت کی سہولتیں بھی فراہم کی جاتیں ہیں۔

ہائی کورٹ دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات کی سماعت کرتی ہے۔ اس کے اختیارات و فرائض درج ذیل ہیں۔

1- **ہدایات اور احکامات جاری کرنا:** ہائی کورٹ اپنی ماتحت عدالتوں کو ہدایات و احکامات جاری کرتی رہتی ہے اور چاہے تو کوئی مقدمہ کسی دوسری عدالت سے اپنے پاس بلوا سکتی ہے۔ کسی ایسی عدالت کے فیصلے کو کالعدم قرار دے سکتی ہے جو اس مقدمے کی سماعت کرنے کی مجاز نہ ہو۔ ہائی کورٹ مختلف اداروں اور افراد کو غیرقانونی کام کرنے سے روک سکتی ہے، کسی ادارے کو حکم امر اور حکم امتناعی جاری کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پروانہ حبس بے جا بھی جاری کر سکتی ہے جس میں کسی متاثرہ شخص کی درخواست پر اس کو عدالت میں طلب کر کے حقائق معلوم کرتی ہے اگر وہ بے قصور ہو تو اس کو انصاف فراہم کیا جاتا ہے۔

2- **اپیلوں کی سماعت:** ہائی کورٹ ڈسٹرکٹ اور سیشن کورٹ کے فیصلوں کے خلاف کی گئی اپیلوں کی سماعت کرتی ہے سیشن کورٹ کے ایسے فیصلوں کی توثیق لازماً ہائی کورٹ نے کرنا ہوتی ہے جس میں اشخاص کو سزائے موت یا عمرقید کی سزا سنائی جاتی ہے۔

3- **حقوق کا تحفظ:** ہائی کورٹ عوام کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔ اگر کوئی فرد یا ادارہ عوام کے حقوق سلب کرتا ہے تو ہائی کورٹ حقوق کی بحالی کا حکم دیتی ہے۔ حکومت بھی عوام کے حقوق کو ہنگامی حالات کے علاوہ سلب نہیں کر سکتی اگر ایسا کیا جائے تو ہائی کورٹ عوام

کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔

4- ماتحت عدالتوں کی نگرانی: ہائی کورٹ صوبے کی تمام عدالتوں کی نگرانی کرتی ہے ان کو ہدایات جاری کرتی ہے۔ کسی ماتحت عدالت میں زیر سماعت مقدمے کو کسی دوسری عدالت میں منتقل کر سکتی ہے۔ ہائی کورٹ کے جج ماتحت عدالتوں کا معائنہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔

اعلیٰ عدالتی کونسل

(Supreme Judicial Council)

تشکیل: اعلیٰ عدالتی کونسل کے اراکین کو صدر نامزد کرتا ہے یہ پانچ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس میں سپریم کورٹ کا چیف جسٹس، سپریم کورٹ کے دو سینئر جج اور دو ہائی کورٹوں کے دو سینئر چیف جسٹس جو چاروں صوبوں میں سب سے سینئر ہوں۔ کونسل اپنے تمام فیصلے کثرت رائے کی بنیاد پر کرتی ہے جو صدر کے دستخطوں کے بعد نافذالعمل ہوتے ہیں۔

فرائض: کونسل دو اہم قسم کے فرائض سرانجام دیتی ہے جن میں ججوں کے خلاف لگائے گئے الزامات کی تحقیق کرنا، اگر الزامات درست ہوں تو اس کے مطابق سزا تجویز کرنا اور ججوں کے کام کے بارے میں ضابطہ عمل تیار کرنا شامل ہیں۔ اگر کسی جج کے بارے میں پتہ چلے کہ اس نے بدعنوانی کی ہے یا ذہنی طور پر معذور ہونے کی وجہ سے اپنے فرائض صحیح طرح ادا نہیں کر سکتا تو صدر اعلیٰ عدالتی کونسل کا اجلاس بلانے کی ہدایت کرتا ہے۔ کونسل متعلقہ جج کے خلاف کارروائی کرتی ہے، اس کی پوری طرح چھان بین کی جاتی ہے حقائق و شواہد اکٹھے کیے جاتے ہیں، جج کو اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ایک طرح سے نیم عدالتی کارروائی ہوتی ہے، گواہوں کو طلب کیا جاتا ہے، دستاویزات طلب کی جاتی ہیں اور پھر کثرت رائے سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اگر کسی جج کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا جائے تو کونسل کے اس فیصلے کے خلاف کسی عدالت میں اپیل نہیں کی جا سکتی۔ اگر اعلیٰ عدالتی کونسل کے کسی رکن کے خلاف کارروائی کرنا ہو تو صدر اس رکن کی جگہ کسی نئے رکن کا تقرر کر دیتے ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل

(Council of Islamic Ideology)

تنظیم و تشکیل: پاکستان اسلامی نظریے کے بنیاد پر حاصل کیا گیا لہٰذا اس کے تحفظ کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی، جس کی تشکیل صدر کرتا ہے اس کے اراکین کی تعداد زیادہ سے زیادہ پندرہ تھی جو جون 1981ء میں 20 کر دی گئی۔ تمام مکتبہ ہائے فکر کو اس میں نمائندہ دی گئی ہے کم از کم ایک خاتون رکن بھی ضروری ہوگی۔ اس کے علاوہ اسلامی اصولوں کی تحقیق اور تجربہ رکھنے والے کم از کم چار افراد کو اس میں نمائندگی دی جائے گی۔ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے موجودہ یا سابق دو جج بھی اس کے رکن ہوں گے۔ ان کے عہدے کی معیاد کم از کم تین سال ہے۔ یہ صدر کو استعفیٰ پیش کر سکتے ہیں۔ کونسل خود بھی کسی رکن کے خلاف قرارداد پاس کر کے صدر کو اس کے برطرف کرنے کی سفارش کر سکتی ہے۔

فرائض: اسلامی نظریاتی کونسل مجلس شوریٰ اور صوبائی اسمبلیوں کو اسلامی سفارشات پیش کرتی ہے تاکہ وہ اسلام کے مطابق قانون سازی کریں۔ صدر، گورنر یا وزیراعظم کونسل سے اسلامی قانون کے بارے میں مشورہ طلب کریں تو یہ انہیں مشورے دیتی ہے۔ کونسل درج ذیل فرائض انجام دیتی ہے۔

1- کونسل اسلامی قوانین اور فقہ کے بارے میں تحقیق کرتی ہے تاکہ ملک میں رائج قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالا جا سکے۔

2- کونسل ہر سال سالانہ رپورٹ تیار کرتی ہے جس میں اپنی سالانہ کارکرگی کا جائزہ لیتی ہے اور وہ رپورٹ مرکزی اور صوبائی قانون ساز ادارے کو بھیجتی ہے۔

3- اسلامی نظریاتی کونسل کو نظرثانی کا اختیار بھی حاصل ہے۔ اگر مجالس قانون ساز شرعی قوانین کے بارے میں بل پیش کرنے سے پہلے رہنمائی حاصل نہ کر سکیں تو انہیں قانون بنانے کے بعد کونسل کے سامنے قانون پیش کرنا پڑتا ہے اور پھر کونسل کے مشورے پر عمل کیا جاتا ہے۔

اٹارنی جنرل (Attorney General)

اٹارنی جنرل مرکزی حکومت کے قانونی مشیر کو کہتے ہیں۔ یہ ہر اس کام میں حکومت کی رہنمائی کرتا ہے جس کے بارے میں حکومت اس سے قانونی مشورہ طلب کرتی ہے۔

تقرر اور اہلیت: اٹارنی جنرل کا تقرر صدر کرتا ہے اور یہ اتنی مدت تک کام کر سکتا ہے جب تک صدر اس سے مطمئن رہے۔ وہ خود بھی صدر کو استعفیٰ پیش کر سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سپریم کورٹ کا جج بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

فرائض:

1- اٹارنی جنرل چونکہ مرکزی حکومت کا قانونی مشیر ہوتا ہے اس لیے یہ صدر، وزیراعظم اور پارلیمنٹ کو قانونی مشورے دیتا ہے۔

2- یہ قانون ساز ادارے کے اجلاس میں شریک ہو سکتا ہے بحث بھی کر سکتا ہے لیکن ووٹ نہیں ڈال سکتا۔

3- یہ مختلف عدالتوں اور ٹربونلز میں حکومت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ حکومت بدلنے کے باوجود کام کرتا رہتا ہے کیونکہ اس کی تقرری سیاسی بنیادوں پر نہیں ہوتی۔

الیکشن کمیشن (Election Commission)

ملک میں آزادانہ انتخابات کروانے کے لیے الیکشن کمیشن قائم کیا گیا ہے جس میں تین ارکان شامل ہوتے ہیں۔ اس کا سربراہ چیف الیکشن کمشنر کہلاتا ہے جس کا تقرر صدر تین سال کے لیے کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سپریم کورٹ کا جج رہ چکا ہو یا سپریم کورٹ کا جج بننے کا اہل ہو۔ صدر اس کی میعاد میں ایک سال کا اضافہ بھی کر سکتا ہے۔

پابندیاں: الیکشن کمیشن کے ارکان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی دوسرے نفع بخش عہدے پر فائز نہ ہوں۔ اپنی ملازمت کے دو سال بعد تک وہ اس اصول پر کاربند رہیں گے۔ اگر پارلیمنٹ چاہے تو مدت ملازمت پورا کرنے کے دو سال کے اندر انہیں دوبارہ الیکشن کمیشن کی رکنیت صدر کے حکم سے دلا سکتی ہے۔

عہدے سے علیحدگی: الیکشن کمیشن کے ارکان کو اگر عہدے سے الگ کرنا ہو تو اعلیٰ عدالتی کونسل تحقیق کے بعد صدر کو عہدے سے الگ کرنے کی سفارش کرے گی۔ صدر خود اپنی مرضی سے ان کو برطرف نہیں کر سکتا۔

فرائض:

1- ملک میں عام انتخابات کروانا اس کی سب سے اہم ذمہ داری ہے جس کے لیے وہ ملک میں انتخابی فہرستوں کی تیاری، پولنگ کے سامان کی فراہمی، پولنگ سٹیشنوں کا انتظام اور انتخابی عملے کے تقرر کا کام سرانجام دیتا ہے۔
2- انتخابات کے بعد شکایات کو دور کرنے کے لیے انتخابی ٹریبونل بھی قائم کرتا ہے۔
3- انتخابات کے دوران پیش آنے والے مسائل کا جائزہ لے کر رپورٹ تیار کرتا ہے تاکہ آئندہ اس قسم کے مسائل جنم نہ لے سکیں۔

مشترکہ مفادات کی کونسل

(Council of Common Interests)

تنظیم و تشکیل: مشترکہ مفادات کی کونسل میں چاروں صوبوں کے وزرا اعلیٰ اور چار وفاقی وزیر بھی شامل ہوں گے۔ اگر وزیراعظم اس کونسل میں شامل ہو تو وہ اس کو چیئرمین بنانا ہو گا ورنہ کوئی بھی سینئر وفاقی وزیر کونسل کی صدارت کرے گا۔ صدر اس کونسل کے ارکان کو نامزد کرے گا۔

فرائض: مشترکہ مفادات کی کونسل وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے درمیان دوستانہ فضا ہموار کرتی ہے اور وسائل کو تقسیم کرتی ہے۔ صوبوں کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو طے کرتی ہے۔ مرکزی حکومت اور قبائلی علاقوں کے مابین پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو بھی دور کرتی ہے۔ یہ کونسل بجلی، پانی، تیل، گیس اور معدنیاتی امور پر غور و حوض کرتی ہے اور ایسی پالیسیاں بناتی ہے جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو قابل قبول ہوں۔ عوام کو اگر مندرجہ بالا شعبوں سے کوئی شکایت ہو تو کونسل ان شکایات کا جائزہ لینے کے بعد ان کو دور کرتی ہے اگر کسی مسئلے کو حل کرنے میں مشکل آ رہی ہو یا کونسل کے فیصلے پر کوئی صوبہ، قبائلی علاقہ یا مرکزی حکومت مطمئن نہ ہو تو دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس بلا کر اس

مسئلے کو حل کیا جاتا ہے یا پھر کونسل صدر کو کسی خاص کمیشن کے قیام کی سفارش کرے گی جس میں ماہرین شامل ہوں گے۔ کمیشن اپنی رپورٹ کونسل کو دے گا اور اس کے بعد کونسل اپنا فیصلہ سنائے گی۔ ان فرائض کے علاوہ کونسل کو وہ فرائض بھی ادا کرنا ہوں گے جو پارلیمنٹ مختلف قراردادوں کے ذریعے کونسل کے حوالے کرتی ہے۔

سوالات

1- 1973ء کے آئین کی خصوصیات بیان کریں۔
2- 1973ء کے آئین کے تحت صدر کے اختیارات و فرائض بیان کریں۔
3- 1973ء کے آئین کے تحت وزیراعظم کی حیثیت اور فرائض واضح کریں۔
4- 1973ء کے آئین کے تحت مجلس شوریٰ کی تنظیم اور اختیارات و فرائض بیان کریں۔
5- 1973ء کے آئین کے تحت قومی اسمبلی کی تشکیل اور اختیارات بیان کریں۔
6- 1973ء کے آئین کے تحت گورنر کے اختیارات و فرائض تحریر کریں۔
7- 1973ء کے آئین کے تحت سپریم کورٹ کی تشکیل اور دائرہ سماعت بیان کریں۔
8- 1973ء کے آئین کے تحت ہائی کورٹ کی تشکیل اور دائرہ سماعت بیان کریں۔
9- 1973ء کے آئین میں تیرہویں ترمیم کا تفصیل سے جائزہ لیں۔
10- مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیں۔

قومی اسمبلی کا سپیکر — اعلیٰ عدالتی کونسل
اسلامی نظریاتی کونسل — مشترکہ مفادات کی کونسل
الیکشن کمیشن — 1973ء کے آئین کی اسلامی دفعات

باب پنجم

اصلاحات 1972ء

(Reforms of 1972)

1971ء میں پاکستان کا مشرقی حصہ بھارتی جارحیت کے نتیجے میں علیحدہ ہو گیا تو مغربی پاکستان کی معاشی حالت بہت خراب ہو گئی- پاکستان کے عوام دل برداشتہ ہو گئے- زرمبادلہ کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ پٹ سن تھا- مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا تو ملکی معیشت کو سہارا دینے والا یہ ذریعہ چھن گیا- اپاہج معیشت ورثے میں ملی تو اس کے باوجود پاکستان کی حکومت نے چیلنج قبول کرتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا- نئی پالیسیاں بنانے کے لیے غور و فکر کیا گیا اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ ملک کو نئے سرے سے مضبوط بنانے کے لیے مختلف شعبوں میں اصلاحات کی جائیں- زراعت' صنعت' تجارت اور دیگر شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں- ملکی معیشت کو کافی حد تک بدلنے کی ضرورت تھی کیوں کہ بقول ڈاکٹر محبوب الحق' چیف اکانومسٹ پاکستان' قوم کے 60 فیصد صنعتی اثاثے اور انشورنس کا 80 فیصد کاروبار صرف 22 خاندانوں کے ہاتھوں میں تھا- ملک کے کئی سرمایہ داروں نے قومی دولت کو غیر ملکی بنکوں میں جمع کروایا ہوا تھا- پاکستان میں چند افراد کی معاشی اجارہ داریوں نے عوام کو ان کے جائز حقوق سے محروم کیا ہوا تھا- کسانوں کا استحصال ہو رہا تھا کیونکہ زمینوں پر بڑے جاگیردار اور زمیندار قابض تھے- ملک کا قانونی نظام بہت پیچیدہ تھا اور انصاف حاصل کرنا عام شہری کے بس کی بات نہیں تھی- صنعتوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے حالات انقلابی اصلاحات کا تقاضا کر رہے تھے- انتظامی مشینری پر بھی عوامی حلقے سخت تنقید کر رہے تھے نیز تعلیمی شعبہ میں بھی بہت سی خرابیاں موجود تھیں- حکومت نے اس حالات کو دیکھتے ہوئے مختلف اصلاحات نافذ کیں-

زرعی اصلاحات (Agriculture Reforms)

پاکستان کی 80 فیصد سے زائد آبادی زراعت سے تعلق رکھتی ہے- دیہاتی علاقوں ترقی

کے بغیر پاکستان کی ترقی کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ پاکستان کے بیشتر علاقوں میں بڑی زمینداریاں قائم ہیں۔ وڈیرے، جاگیردار اور زمیندار زرعی وسائل پر قابض رہے ہیں۔ امراء کا یہ طبقہ عام دیہاتیوں کا استحصال کرتا رہا ہے۔ایوب خان نے زرعی شعبے میں اصلاحات لانے کے لیے بعض اقدام اٹھائے لیکن زمینوں پر قابض طبقے نے یہ کوششیں ناکام بنا دیں۔ 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے زرعی شعبے میں درج ذیل انقلابی اصلاحات متعارف کرائیں۔

حد ملکیت: ایوبی دور میں ملکیت کی حد 500 ایکڑ نہری اور 1600 ایکڑ بارانی مقرر کی گئی تھی۔ باغ لگانے اور مویشی پالنے کے لیے بھی زمین مختص کی گئی تھی۔ بھٹو دور میں حد ملکیت کا تعین نئے سرے سے کیا گیا۔ 150 ایکڑ نہری اور 300ایکڑ بارانی زمین رکھنے کی اجازت ہر فرد کو دی گئی۔ ٹریکٹر یا ٹیوب ویل کامالک مزید 3000 پیداواری یونٹ اپنی تحویل میں رکھ سکتا تھا۔ مویشی پالنے، باغ لگانے اور شکار گاہیں بنانے کی بنیاد پر رعائتیں ختم کر دی گئیں۔ جنرل ضیاء الحق نے 1977ء میں ملکیت کی حد 100 ایکڑ نہری اور 200 ایکڑ بارانی مقرر کی۔

مزارعوں کے لیے تحفظات: مزارعوں کی ناجائز بے دخلی کے خلاف تحفظات مہیا کیے گئے۔ آبیانہ کی ادائیگی زمیندار کی ذمہ داری قرار پائی۔ کاشتکاری کے آدھے اخراجات زمیندار پر ڈالے گئے۔ زمینداروں کو مزارعین سے بیگار لینے اور اس سے کوئی محصول وصول کرنے سے منع کر دیا گیا۔

تقسیم اراضی: مزارعین میں سرکار کی غیر آباد اور زمینداروں کی مقرر حد سے زائد زمینیں تقسیم کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 1976ء تک 15 لاکھ ایکڑ سرکاری زمین بے زمین کاشتکاروں میں بانٹی گئی۔ زمینداروں سے واپس لی گئی 35 لاکھ ایکڑ زمین مزارعین میں تقسیم کیے جانے کا اعلان بھی کیا گیا۔

مالیہ کا خاتمہ: 12 ایکڑ نہری اور 25 ایکڑ بارانی اراضی کے مالک کام کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں پر ترقیاتی محصول اور مالیہ کے نفاذ کا عمل روک دیا گیا۔

مشینی کاشت: جدید زرعی طریقے اپنانے کے لیے حکومت نے کاشتکاروں اور زمینداروں کو قرضے دینے کا پروگرام بنایا تاکہ وہ جدید مشینری، ٹیوب ویل، ٹریکٹر اور ہارویسٹر خرید

سکیں- مشینی کاشت کے لیے تحریک امداد باہمی کی سکیمیں بھی بنائی گئیں-

اشتمال اراضی: چھوٹے چھوٹے زرعی قطعات کو جمع کر کے اشتمال اراضی کا ایک بڑا منصوبہ ترتیب دیا گیا- مشترکہ اراضی کی تقسیم کو روکنے کے لیے مشترکہ کاشتکاری کے عمل کی حوصلہ افزائی کی گئی-

دیہی ترقیاتی پروگرام: اس پروگرام کے تحت کسانوں کو ٹریکٹر' بہتر بیج اور کھاد خریدنے کے لیے قرضے دیے گئے' دیہاتوں میں مرغبانی' درخت اگانے' ریشم کے کیڑے پالنے اور شہد حاصل کرنے کے منصوبوں کے لیے مالی اور فنی امداد کی گئی- دیہاتوں میں تعلیم' صحت اور صفائی کا معیار بہتر بنانے کے لیے ملک گیر منصوبے ترتیب دیے گئے- دیہاتوں کی ترقی کے لیے پیپلز ورکس پروگرام اور ایسے ہی دیگر منصوبے وقتاً" فوقتاً" متعارف کرائے گئے-

عشر کا نفاذ: 1982ء میں مالیہ کا نظام ختم ہو گیا-اور اس کی جگہ عشر کا نفاذ عمل میں آیا- زرعی پیداوار پر عشر کی شرح 5 فیصد مقرر کی گئی- غیر مسلموں اور چھوٹے کاشتکاروں کو عشر کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا-

لیبر اصلاحات (Labour Reforms)

جہاں صنعتوں کے قیام نے ریاست کو ترقی کی راہ دکھائی وہاں کئی مسائل نے بھی جنم لیا- صنعتی ترقی میں سرمایہ کو کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے- لیکن بنیادی طور پر اہم ترین عنصر مزدور ہوتا ہے- ایک فلاحی مملکت میں مزدور کے حالات کار مناسب ہونا ضروری ہے- اس مقصد کے لیے 1955ء' 1959ء اور 1969 میں لیبر پالیسیاں متعارف کرائی گئیں لیکن خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہو سکے- 71-1970ء کے انتخابات کے دوران مزدوروں کے مسائل کو بڑی اہمیت دی گئی- محنت کشوں کے لیے خوراک' لباس اور رہائش کی فراہمی کے وعدے ہوئے- 1972ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا- اصلاحات کو محنت کشوں' کارخانہ داروں اور حکومت کے نمائندوں نے مشترکہ طور پر کافی غور و فکر کے بعد ترتیب دیا-

مزدوروں کی نمائندگی: ہر صنعتی ادارے میں انتظامی معاملات کو چلانے کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں اور ان میں 20 فیصد نمائندگی مزدوروں کے نمائندوں کو دی گئی- مزدور نمائندوں

کو صنعتی اداروں کے سٹور اور جملہ حساب کتاب چیک کرنے کے اختیارات مل گئے۔ ملوں میں بنیادی فیصلوں کی تیاری میں مزدور نمائندوں کو شریک کیا گیا۔

ہڑتال کی قانونی حیثیت : مزدوروں کی تسلیم شدہ یونینوں کو مزدوروں کے حقوق کا محافظ مانا گیا۔ البتہ کسی یونین کو یہ اختیار نہ دیا گیا کہ وہ ہڑتال کا اعلان کر دے۔ ہڑتال کا حق مانتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ تمام مزدور خفیہ رائے دہی کے ذریعے اکثریتی ووٹوں سے ہڑتال کے لیے تین دن کا نوٹس دیں گے۔ مزدوروں کے لیے لازم قرار پایا کہ 15 دن کے اندر اپنی یونین رجسٹرڈ کروا لیں۔ ایک مزدور کو ایک وقت میں صرف ایک یونین کی رکنیت حاصل کرنے کا حق دیا گیا۔

لیبر عدالتیں : اصلاحات نافذ ہوئیں تو مزدور کو ازخود اپنا مقدمہ لیبر عدالت میں لے جانے کا حق مل گیا۔ اگرچہ 1972ء سے پہلے بھی مصالحتی کورٹس موجود تھیں، لیکن فریقین صرف باہمی رضامندی ہی سے مقدمہ وہاں لے جا سکتے تھے۔ ضروری قرار پایا کہ شکایت کی صورت میں مزدور پہلے مل انتظامیہ سے رجوع کرے۔ اگر انصاف نہ ملے تو پھر وہ لیبر عدالت میں جانے کا حق استعمال کر سکتا ہے۔ عدالت کو 30 روز کے اندر فیصلہ سنانے کا پابند کر دیا گیا۔

رہائشی سہولیات : اصلاحات کی رو سے صنعت کاروں پر ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ محنت کشوں کے لیے مکانات تعمیر کروائیں نیز اگر کوئی مزدور اپنا مکان بنوانا چاہے تو اس کی مالی مدد کریں۔ رہائشی سہولتوں کی فراہمی کے لیے منصوبوں کی تیاری کا کام ہر صنعتی ادارے میں مالکان، محنت کشوں اور حکومت کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔

سالانہ منافع میں حصہ : مزدوروں کو ہر سال تنخواہ کے برابر بونس دینے کا اعلان کیا گیا۔ کسی مل کی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ کی صورت میں خصوصی بونس دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ مزدوروں کے لیے منافع کی شرح 4 فیصد کے لگ بھگ رکھی گئی۔

شاپ اسٹیوارڈ : ملوں میں ٹریڈ یونین کے قیام کو قانونی طور پر مان لیا گیا اور نچلی پیداواری سطح پر شاپ اسٹیوارڈ کا عہدہ تخلیق کیا گیا۔ اس کا انتخاب ہر ادارے کے مزدوروں کے ووٹوں سے ہونا قرار پایا۔ شاپ اسٹیوارڈ کی ذمہ داری تھی کہ وہ مل مالکان اور محنت کشوں کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرے نیز مزدوروں کی شکایات کا

ازالہ کرے۔ 1972ء سے 1977ء تک یونینوں کے قیام کا عمل جاری رہا اور 1977ء تک ٹریڈ یونینوں کی تعداد 8200 سے تجاوز کر چکی تھی۔

ملازمتوں کا تحفظ: کسی محنت کش کو بغیر وجہ کے ملازمت سے برطرف نہیں کیا جا سکتا۔ مزدوروں کو ملازمت کے تحفظ کا مکمل حق مل گیا۔ اگر کسی مزدور کو بغیر ٹھوس وجہ کے برطرف کیا جاتا تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق رکھتا تھا۔ اصلاحات کی رو سے کسی مزدور کو 4 ہفتوں سے زیادہ عرصہ کے لیے معطل کرنے کا اختیار مالکان کو حاصل نہ رہا۔

اوقات کار: مزدوروں کے لیے کام کے اوقات کا تعین نئے سرے سے کیا گیا۔ مزدور سے فی ہفتہ صرف 48 گھنٹے کام لینے کا اختیار انتظامیہ کا ملا۔ اس سے پہلے کم از کم مدت 54 گھنٹے فی ہفتہ مقرر تھی۔

انشورنس کی سہولت: محنت کشوں کو گروپ انشورنس کی سہولت مل گئی ۔ دوران کار فوت ہو جانے یا زخمی ہونے کی صورت میں اہل خانہ کی مالی امداد کے لیے خصوصی فنڈ قائم کیا گیا۔ فنڈ کے لیے ہر مزدور کے حصے کا پریمیم ادا کرنے کی ذمہ داری مل مالک پر عائد کی گئی۔

سوشل سیکورٹی: سوشل سیکورٹی کا نظام 1972ء سے پہلے بھی موجود تھا ۔ ہر محنت کش سے 2 فیصد چندہ سوشل سیکورٹی کے نام پر لیا جاتا تھا۔ اصلاحات کے تحت اب چندہ کی ادائیگی مل مالکان کی ذمہ داری قرار پائی۔ ہر مل مالک کو 6 فیصد چندہ دینے کا پابند بنا دیا گیا۔ اب مزدور کو سوشل سیکورٹی کے نام پر کچھ نہیں دینا پڑتا۔

گرایجوئٹی: گرایجوئٹی کی شرح فی سال 15 روز سے بڑھا کر 20 روز کی تنخواہ کے مساوی کر دی گئی۔ کسی مزدور کے فوت ہونے یا نوکری چھوڑ جانے کی صورت میں یہ گرایجوئٹی دی جاتی ہے۔ اگر محنت کش کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اسے 12000 ادا کیے جاتے ہیں۔ 1972ء سے پہلے رقم 6000 روپے مقرر تھی۔ عمر بھر کی معذوری کی صورت میں زیادہ سے زیادہ 21000 اور کم از کم 17000 روپے مزدور کو دیے جانے کا فیصلہ ہوا۔

معاشرتی تحفظات: کارخانہ دار کو پابند کیا گیا کہ وہ تنخواہ کا 6 فیصد فنڈ طبی سہولتوں کے لیے فراہم کرے۔ مزدور کی وفات کی صورت میں تجہیز و تکفین کی رقم 50 سے 500 روپے تک بڑھا دی گئی۔ مزدوروں کی اتفاقی چھٹیوں میں اضافہ کیا گیا اور تہواروں پر مزدوروں کو

چھٹی ہو گی۔ مزدوروں کے بچوں کے تعلیمی مصارف کے لیے کارخانہ دار کو پابند کیا گیا کہ وہ فی بچہ سو روپیہ سالانہ ادا کرے۔ بڑے صنعتی اداروں میں بڑھاپے کی پنشن کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ صنعتی ادارے کی عارضی بندش کی صورت میں بے روزگاری الاؤنس دینے کا اصول بھی طے پا گیا۔

تعلیمی اصلاحات (Educational Reforms)

تعلیمی شعبے میں اصلاحات کی ضرورت 1947ء سے محسوس کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ آزادی سے پہلے لارڈ میکالے کا تجویز کردہ نظام تعلیم انگریز حکومت کی ضرورتوں کے پیش نظر نافذ کیا گیا تھا۔ تعلیمی نظام کو قومی امنگوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے قائداعظم کی زندگی میں ایک تعلیمی کانفرنس 1947ء میں بلائی گئی۔ تجاویز مرتب کی گئیں لیکن ان پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا۔ ایوب خان نے ایک تعلیمی کمیشن قائم کیا جس کی رپورٹ تو منظرعام پر آئی لیکن ملک کے سیاسی حالات اور طلبہ کی ایوب حکومت کے خلاف سرگرمیوں کی وجہ سے سفارشات کو عملی شکل نہ دی جا سکی۔ چند اصلاحات نافذ بھی ہوئیں لیکن طلبہ کے ردعمل کے تحت انہیں واپس لینا پڑا۔ جنرل یحیٰی خان نے ایر مارشل نور خان کی قیادت میں ایک خصوصی تعلیمی کمیٹی کو تعلیمی نظام بہتر بنانے کے لیے تجاویز مرتب کرنے کا کام سونپا۔ کمیٹی نے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ تمام مکاتیب فکر کے لوگوں سے تجاویز مانگیں۔ ابھی کام جاری تھا کہ یحیٰی خاں دور کا خاتمہ ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عنان حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد تعلیمی اصلاحات کی تیاری کی طرف توجہ دی۔ مارچ 1972ء میں حکومت نے تعلیمی نظام میں درج ذیل اصلاحات رائج کرنے کا اعلان کر دیا۔

تعلیمی اداروں کا قومیانہ : تعلیمی معیار بلند کرنے اور اساتذہ کے لیے بہتر حالات کار پیدا کرنے کے لیے فیصلہ ہوا کہ پرائیویٹ سطح پر چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں کو 1972ء میں اور بلدیات کے تحت قائم شدہ اداروں کو 1973ء میں قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ تعلیمی اداروں کے حکومتی تحویل میں آ جانے سے اساتذہ کو ملازمتی تحفظ حاصل ہوا۔ وہ استحصال سے بچ گئے۔ قومیانے کی پالیسی کی وجہ سے ملک میں تعلیم کے یکساں معیار کے قیام میں مدد ملی۔ حکومت نے بعض تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں نہ لیا کیونکہ وہ غیر تجارتی اور خدمت خلق کے جذبے کے تحت چلائے جا رہے تھے اور ان کی کارکردگی تسلی بخش تھی۔

مفت تعلیم کی سہولت: 1972ء میں فیصلہ کیا گیا کہ مڈل تک اور 1974ء میں میٹرک تک کی تعلیم مفت مہیا کی جائے گی۔ غریب اور متوسط طبقے کے بچوں کے لیے میٹرک تک تعلیم کا حصول ممکن بنا دیا گیا۔ یہ بھی عہد کیا گیا کہ 1980ء تک شرح خواندگی کو بڑھا کر 100 فیصد کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دے دیا گیا۔

یونیورسٹی آرڈیننس کا خاتمہ: ایوب خان کے دور میں طلبہ کی منفی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے یونیورسٹی آرڈیننس رائج کیا گیا تھا۔ اس آرڈیننس کے خلاف طلبہ برادری نے ملک گیر ہنگامے کیے تھے۔ 1972ء کی اصلاحات میں اس آرڈیننس کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ نئے اور متوازن قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔

تعلیمی اخراجات میں اضافہ: پاکستان میں 1972ء تک تعلیمی مقاصد کے لیے خرچ ہونے والی سالانہ رقم 2 فیصد تھی۔ حکومت نے تعلیمی شعبے کی اہمیت کے پیش نظر یہ رقم بڑھا کر دوگنا کر دی۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ تعلیم پر آئندہ سالوں میں مزید روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اور تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے کثیر رقوم مختص کی جائیں گی۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن: یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھا کر دوگنا کر دینے کا فیصلہ بھی ہوا نیز ان کے حالات کار کو بہتر بنانے اور یکساں معیار قائم کرنے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یونیورسٹیاں متعدد مسائل کا شکار چلی آ رہی تھیں۔ ان کے مالیاتی معاملات کو سدھارنے کے لیے کمیشن کو خصوصی درجہ دیا گیا۔ یہ نیم خود مختار ادارہ حکومت اور یونیورسٹیوں کے درمیان رابطے کے فرائض ادا کرتا ہے۔

تعلیمی اداروں کا قیام: اصلاحات کے تحت ملک بھر میں تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں، لائبریریاں اور تعلیمی بورڈ قائم کرنے کے اقدامات اٹھائے گئے۔ درج ذیل ادارے وجود میں آئے یا پہلے سے موجود اداروں کا درجہ بڑھا دیا گیا۔

1- ٹنڈو جام میں زرعی کالج کا قیام
2- جامشورو میں انجینئرنگ کالج کا قیام
3- سکھر، ملتان اور سیدو شریف میں یونیورسٹیوں کا قیام
4- جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے لیے مکمل یونیورسٹی کا درجہ
5- انجینئرنگ کالج پشاور اور زرعی کالج پشاور کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے

صوبائی حکومت کو سفارشات مرتب کرنے کے لیے کہا گیا۔

6- نیشنل بک فاؤنڈیشن کا قیام

7- 20,000 لائبریریوں کا قیام

8- 10,000 مراکز برائے تعلیم بالغاں کا قیام

9- کوئٹہ میں میڈیکل کالج کا قیام

تعلیم بالغاں: اصلاحات کے تحت تعلیم بالغاں کے 10,000 مراکز کے فوری قیام کا فیصلہ ہوا اور یہ بھی طے پایا کہ آٹھ سال کے اندر تعداد بڑھا کر 20,000 کر دی جائے گی۔

شرح خواندگی کو سو فیصد تک بڑھانے کے لیے تعلیم بالغاں ایک اہم ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے فیصلہ ہوا کہ ایک نیشنل سروس کور قائم کی جائے گی۔ جس میں 17 سے 23 سال کی عمر کے ایسے نوجوانوں کو شریک کیا جائے گا' جو اعلیٰ ثانوی تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔

اساتذہ کے لیے سہولتیں: تعلیمی ترقی کے لیے سب سے نمایاں کردار اساتذہ ہی ادا کر سکتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ انہیں معقول حالات کار مہیا کیے جائیں تاکہ وہ اپنے فرائض دلجمعی سے ادا کر سکیں۔ 1972ء کی اصلاحات کے تحت اساتذہ کے لیے درج ذیل سہولتوں کا اعلان کیا گیا۔

1- اساتذہ کو پانچ پیشگی ترقیاں دینے کا فیصلہ ہوا۔

2- اساتذہ کے لیے تنخواہوں کے نئے سکیل بنانے کا کام شروع ہو گیا۔

3- اساتذہ کی رہائشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے منصوبہ بندی کرنے کا اعلان ہوا۔

4- اساتذہ کے لیے عمدہ حالات کار پیدا کرنے کا اعلان ہوا تاکہ بہتر لوگ شعبہ تعلیم کی طرف رجوع کر سکیں۔

5- پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لے کر اساتذہ کو تحفظ مہیا کیا گیا۔

جسمانی تعلیم اور کھیل: ملک میں کھیلوں کی ترقی کے لیے قومی سپورٹس ٹرسٹ بنا دیا گیا۔ اساتذہ کے تربیتی مراکز میں کھیلوں اور جسمانی تعلیم کے فروغ کے لیے خصوصی اقدامات اٹھائے گئے۔ عورتوں کے لیے کھیلوں کے علیحدہ اداروں کے قیام کی تجویز منظور کر لی گئی۔

طلبہ کے لیے سہولتیں:

1- پرائمری تعلیم مفت فراہم کیے جانے کا فیصلہ ہوا۔
2- طلبہ کے لیے وظائف کی رقوم میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا۔
3- طلبہ کو آمدورفت کی سستی سہولتیں فراہم کی گئیں۔
4- طلبہ کے طبی معائنہ کا مفت انتظام کیا گیا۔
5- غریب اور متوسط طبقے کے طلبہ کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی۔
6- بک بنک قائم کر کے غریب طلبہ کو کتابیں مفت مہیا کی گئیں۔

نئے نصاب کی تیاری: پاکستان بھر میں مختلف تعلیمی مدارج کے لیے قومی ضرورتوں اور امنگوں سے ہم آہنگ نصاب بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ نظریہ پاکستان اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں نصاب کی تیاری کا کام متعدد کمیٹیوں کے حوالے کیا گیا۔

فنی تعلیم: وقت کی اہم ضرورت محسوس کرتے ہوئے فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم کی طرف خصوصی دھیان دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے خصوصی رقوم مختص کرنے کا اعلان ہوا۔ اور ملک بھر میں تمام پولی ٹیکنیک اداروں کو ٹیکنیکل کالج بنا دیا گیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ انٹرمیڈیٹ سطح پر بیالوجی اور حساب کا مربوط کورس متعارف کرایا جائے گا۔

مذہبی تعلیم: اسلامی تعلیم کے فروغ کے لیے درج ذیل اقدامات اٹھائے گئے۔

1- نصاب سے غیر اسلامی نوعیت کا تمام مواد حذف کر دینے کا اعلان کیا گیا۔
2- اسلامیات کو میٹرک تک لازمی مضمون قرار دے دیا گیا۔
3- ابلاغ عامہ کے ذرائع کو دینی تعلیم کے لیے خصوصی پروگرام پیش کرنے کی ترغیب دی گئی۔
4- ایسے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کی گئی جہاں مذہبی علوم پڑھائے جاتے تھے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کا قیام ایسے طلبہ و طالبات کے لیے عمل میں لایا گیا جو روایتی تعلیمی اداروں میں بوجوہ تعلیم حاصل نہ کر پا رہے تھے۔ اس یونیورسٹی نے

خط و کتابت اور ریڈیو و ٹیلی ویژن کے ذریعے تعلیم دینے کا جدید انداز اپنایا۔ یونیورسٹی کے ذیلی مراکز ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کھولے گئے۔

نیشنل کیڈٹ کور

تعلیمی اداروں میں نیشنل کیڈٹ کور اور ویمن گارڈز جیسی تنظیمیں قائم کی گئی تاکہ طلبہ و طالبات کو فوجی تربیت دے کر قوم کی دفاعی ضروریات کے لیے تیار کیا جا سکے۔ تربیت دینے کے لیے افواج پاکستان کے انسٹرکٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔

1979ء کی تعلیمی اصلاحات

1979ء میں صدر ضیاء الحق نے مزید تعلیمی اصلاحات رائج کرنے کے لیے ایک نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا۔ جس کی رو سے درج ذیل اقدامات اٹھائے گئے۔

1- لاہور اور کراچی میں نئی یونیورسٹیوں کے قیام کا فیصلہ ہوا۔
2- اسلامیات اور مطالعہ پاکستان' ہر دو مضامین کو ڈگری اور پوسٹ گرایجویٹ سطح کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔
3- تعلیمات اسلامیہ اور نظریہ پاکستان کو اجاگر کرنے پر زور دیا گیا۔
4- انگلش میڈیم سکولوں میں بھی اردو ذریعہ تعلیم کو متعارف کرایا گیا۔
5- انٹر اور ڈگری کی سطح پر تعلیمی اداروں کے داخلی امتحانات میں حاصل کردہ نمبروں کی بنیاد پر طلبہ و طالبات کو گریڈ دیے جانے کا فیصلہ ہوا۔

انتظامی اصلاحات (Administrative Reforms)

پاکستان میں سیاسی و منتخب انتظامیہ کی مدد کے لیے ملازمین پر مشتمل مستقل انتظامیہ موجود ہے۔ جس کا ڈھانچہ تقسیم سے قبل دور انگلشیہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا۔ انتظامیہ کا یہ ڈھانچہ 1947ء کے بعد مسلسل عوامی تنقید کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ اسے افسر شاہی یا نوکر شاہی کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے۔ پاکستان بنا تو بابائے قوم نے افسروں کو اپنے رویے میں تبدیلی لانے کی تلقین کی۔ انہیں عوام کی خدمت کا جذبہ اپنانے کے لیے کہا لیکن مطلوبہ تبدیلیاں نہ آ سکیں۔ 1947ء سے 1972ء تک سول انتظامیہ نے حقیقی حاکموں کا سا انداز اپنائے رکھا۔

1972ء میں دیگر اصلاحات کے ساتھ ساتھ انتظامی شعبے میں بھی اصلاحات لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1973ء میں ایک تقریر کے دوران میں اعلیٰ انتظامی عہدیداروں پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

"مملکت میں کسی ادارے نے ہماری زندگی کے معیار کو اتنا نہیں گرایا" جتنا نوکر شاہی نے کیا ہے۔ افسروں کا طبقہ عوام سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ یہ صورت غیر ملکی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ عوامی حکومت ایسے نظام سے چشم پوشی نہیں کر سکتی جہاں ایک افسر کو سائنس دان، استاد اور فنی ماہر سے زیادہ مرتبہ حاصل ہو، ہمیں افسروں اور عوام کے درمیان قریبی رابطوں کے قیام کی ضرورت ہے۔

اصلاحات کے لیے تجاویز تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی کمیٹی کی سفارشات کو پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔

یکساں کیڈر: مختلف محکموں کے لیے الگ الگ کیڈر بنائے گئے تھے۔ ایک سے دوسرے کیڈر میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ 1972ء کی اصلاحات میں مختلف کیڈروں کو باہم ملا دیا گیا۔ افسروں کو یکساں درجہ دے کر ضم کر دیا گیا۔ پیشہ وارانہ مہارت کی بنیاد پر یکساں مواقع فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ملازمتوں میں پہلے سے موجود تفریق کو ختم کر دیا گیا۔

سروسز کے لیبلوں کا خاتمہ: تمام سرکاری ملازمتوں کا باہم ادغام عمل میں لایا گیا۔ ملازمتوں کے لیبل ختم کر کے ایک ملازمت، سے دوسری ہم پلہ ملازمت میں تبدیلی کا راستہ کھول دیا گیا۔ ملازمتوں کی نئی سرے سے درجہ بندی کی گئی۔ ہر ملازمت کی پیشہ وارانہ پہچان برقرار رکھی گئی لیکن اسے علیحدہ ملازمت کا درجہ حاصل نہ رہا مثلاً" سول سروس آف پاکستان اور پولیس سروس آف پاکستان جیسے نام ختم کر دیئے گئے۔ سروسز کے لیبل ختم ہو جانے کے بعد مختلف سروسز سے وابستہ یکساں گریڈ کے افسروں کی حیثیت مساوی ہو گئی۔ باہم تبادلوں کے اصول نے کسی ایک سروس کی برتری کو ختم کر دیا۔

تنخواہ کا نیا نظام: تمام ملازمتوں کے لیے تنخواہوں کا ایک جیسا نظام ترتیب دیا گیا اس سے پہلے مختلف محکموں میں سکیلوں کے اپنے اپنے نظام تھے۔ پرانے سکیلوں کی جگہ نئے بائیس سکیل متعارف کرائے گئے۔

موو اوور کا نظام: ایک سکیل کی انتہا کو پہنچ جانے والے ملازمین کے لیے اگر اگلے گریڈ میں ترقی کا موقع موجود نہ ہو تو انہیں تنخواہ کا اگلا سکیل دینے کا نظام موواوور کہلاتا ہے۔

ترقی کے مواقع: معاشرے میں یکساں اہلیت کے حامل افراد کو ملازمتوں کے حصول اور بہتر گریڈ میں ترقی کے لیے مواقع دیئے گئے۔ اگرچہ درجہ بندیاں ختم کر کے مختلف اعلیٰ ملازمتوں کو مساوی درجہ دیا گیا لیکن اہلیت و قابلیت کا اصول مانتے ہوئے زیادہ ترقی پانے کا حق محفوظ بنا دیا گیا۔

سمن کی تعمیل: مقدمہ کے فریقین اور گواہوں سے سمن کی تعمیل میں تاخیر سے عدالتی کارروائی اور انصاف کی فراہمی میں تاخیر ہوتی رہتی ہے اس خامی کو دور کرنے کے لیے سمن کی تعمیل کا بہتر طریق کار اپنانے کی تجویز منظور ہوئی۔

ڈسٹرکٹ و سیشن جج کے اختیارات: نچلی سطح پر مقدمات کا فیصلہ جلد کروانے کے لیے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے اختیارات بڑھا دیئے گئے اسے اپنے ہی فیصلوں پر نظرثانی کا اختیار بھی دیا گیا نیز ہائی کورٹ میں اپیل کا حق بھی محدود کر دیا گیا ہائی کورٹ میں جانے والے مقدمات کے لیے مالیت کی حد بھی بڑھا دی گئی۔

بار کونسل ایکٹ میں ترمیم: 1965ء کے بار کونسل اور لیگل پریکٹشنرز ایکٹ میں تبدیلی لائی گئی وکلا پر پابندی عائد کی گئی کہ وہ وکالت نامے میں اپنی فیس کی وضاحت بھی کریں گے۔

ججوں کی تعداد: زیر سماعت مقدمات کی بھرمار کی وجہ سے ججوں اور مجسٹریٹوں کی تعداد میں اضافہ کا فیصلہ کیا گیا نیز ضمانت کا طریق کار آسان بنایا گیا لازم قرار پایا کہ ملزم کے خلاف مقدمہ کی سماعت چھ ماہ کے اندر شروع کر دی جائے۔

صنعتی اصلاحات (Industrial Reforms)

1972ء میں حکومت نے ایک آرڈیننس جاری کر کے کئی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا جن کی تعداد 31 تھی۔ ستمبر 1973ء میں گھی ملیں بھی قومیا لی گئیں۔ چند اہم صنعتیں یہ تھیں۔

1- بھاری مشینری کی صنعت، 2- فولاد سازی اور لوہے کی صنعت،
3- پیٹرو کیمیکل کی صنعت، 4- سیمنٹ کی صنعت،

5- بھاری اور بنیادی کیمیکل کی صنعت،
6- ٹریکٹر سازی کی صنعت،
7- چاول چھڑنے کی صنعت،
8- بجلی کے بھاری سامان کی صنعت،
9- بناسپتی گھی کی صنعت،
10- گیس کمپنی،
11- موٹر گاڑیوں کی صنعت

ایوب خان کے دور میں دولت سمٹ کر 22 خاندانوں تک محدود ہو گئی تھی- پاکستان پیپلز پارٹی نے صنعتوں کو قومی تحویل میں لیے جانے کا نعرہ الیکشن کے دوران لگایا تھا- کامیابی کے بعد اس پر عمل کیا-

پی آئی ڈی سی یعنی پاکستان انڈسیریل ترقیاتی کارپوریشن سرکاری شعبے میں صنعتی سرمایہ کاری کرتی تھی اور کارخانے تعمیر کر کے نجی شعبے کو فروخت کر دیتی تھی- اس کارپوریشن کے علاوہ صنعتی نظام چلانے کے لیے ایک بورڈ آف صنعتی مینجمنٹ بھی 1972ء میں تشکیل دیا گیا اور صنعتوں کو چلانے والی دس کارپوریشنوں کی نگرانی کا کام اس کے سپرد کیا گیا-

مزدوروں کی بہبود کے لیے درج ذیل اصلاحات کی گئیں-

1- مزدوروں کے لیے بہتر تنخواہوں اور مراعات کا تعین کیا گیا-
2- مزدوروں کو صنعتوں سے حاصل ہونے والے منافع میں سے حصہ ملنے لگا-
3- رہائش، تعلیم، صحت اور خوراک کی سہولتوں کی فراہمی کا بندوبست کیا گیا-

صنعتوں کو قومیانے اور مزدوروں کو بہتر حالات کار مہیا کرنے سے نئی صنعتوں کے قیام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی- نجی سرمایہ کاروں نے صنعتوں کی بجائے زرعی زمینوں اور رہائشی پلاٹوں کی خرید میں دلچسپی لینا شروع کر دی- مزدوروں نے مراعات تو حاصل کر لیں لیکن فرائض کی ادائیگی کی طرف مناسب توجہ نہ دی- یہ حالات صنعت میں بحران پیدا کرنے کا باعث بنے-

1977ء میں فوجی حکومت کے قیام کے بعد صنعتی شعبے میں نمایاں تبدیلیاں لائی گئیں-

1- بورڈ آف صنعتی مینجمنٹ ختم کر دیا گیا اور وزارت پیداوار کو اختیارات دے دیئے گئے-
2- قومی ملکیت میں لی گئی صنعتوں کو ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے حوالے کیا گیا-
3- ٹریڈ یونینوں پر پابندی عائد کر دی گئی-
4- غیر ضروری اخراجات کو ختم کر دیا گیا-
5- صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی کئی اقدام اٹھائے گئے-

سوالات

-1 1972ء کے بعد پاکستان میں کی جانے والی زرعی اصلاحات کی تفصیل بیان کریں۔

-2 مندرجہ ذیل پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

(i) لیبر اصلاحات 1972ء (ii) انتظامی اصلاحات 1972ء

-3 1972ء کے بعد پاکستان میں تعلیمی پہلو میں ہونے والی اصلاحات کا جائزہ لیں۔

-4 1979ء کی تعلیمی اصلاحات پر روشنی ڈالیے۔

-5 1972ء کے بعد ہونے والی صنعتی اصلاحات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

باب ششم

معاشرتی خدمات اور ادارے

Social Services and Institutions

صحت (Health)

صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ صحت مند انسانوں پر مشتمل معاشرہ ہی صحت مند بنتا ہے۔ ایک فلاحی ریاست میں عوام کی صحت کے لیے خصوصی انتظامات کرنا حکومت کے اہم فرائض میں شامل ہیں۔ صحت عامہ، اجتماعی ترقی، کام کی رفتار میں تیزی اور دفاعی استحکام کے لیے ضروری ہے۔ جسمانی ہو یا ذہنی ہر قسم کا کام کرنے والے شہریوں کے لیے اچھی صحت بنیادی شرط ہے۔ کمزور اور بیمار افراد کی کارکردگی پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ بچہ ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد، ہر ایک کے لیے اچھی صحت ایک بنیادی ضرورت ہے۔ صحت مند ماں صحت مند بچوں کو جنم دیتی اور پرورش کرتی ہے۔ آج کا بچہ کل کا شہری ہو گا۔ اس لیے بچوں کی صحت پر دھیان دینے والی حکومت اپنے ملک کے مستقبل کو محفوظ بناتی ہے۔

پاکستان میں صحت کے شعبہ پر کل سالانہ بجٹ کا صرف ایک فیصد خرچ کیا جاتا ہے۔ دو ہزار افراد کے لیے صرف ایک ڈاکٹر موجود ہے۔ بہت سے ایسے علاقے بھی ہیں جہاں صحت کی بنیادی سہولتیں ناپید ہیں لوگوں کو علاج کے لیے کسی مناسب طبی مرکز یا ہسپتال تک پہنچنے کے لیے لمبا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یاد رہے کہ سری لنکا میں 5 فیصد اور بھارت میں 2.5 فیصد بجٹ صحت کے شعبہ کے لیے مخصوص ہے۔ پاکستان میں بھی صحت کی بہتری کے لیے ہر سال زیادہ رقوم مختص ہونی چاہییں۔

محکمہ صحت کا ڈھانچہ

Structure and Facilities

صحت کا شعبہ صوبائی حکومت کے کنٹرول میں ہے مرکزی حکومت بھی صحت کے لیے ہر

سال رقوم مختص کرتی ہے نیز اقوام متحدہ کی ایجنسیوں سے صحت کے حوالے سے امداد حاصل کرنے کے لیے رابطے قائم کرتی ہے۔ صوبے میں محکمہ صحت کا سربراہ "وزیر صحت" ہوتا ہے۔ محکمہ صحت کا اعلیٰ ترین افسر سیکرٹری ہے جس کے ماتحت ایڈیشنل سیکرٹری، ڈپٹی سیکرٹری اور انڈر سیکرٹری ہوتے ہیں۔ یہ عملہ سیکرٹری کی نگرانی میں صوبائی سول سیکرٹریٹ میں اپنے فرائض ادا کرتا ہے۔ وزیر صحت صوبائی کابینہ کے ساتھ مل کر صوبہ بھر کے لیے پالیسیاں طے کرتا ہے اور سیکرٹری سمیت سارا عملہ پالیسیوں پر عملدرآمد کراتا ہے۔ صوبے میں تمام ہسپتالوں پر کنٹرول کے لیے ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز ہے جس کے ماتحت متعدد ڈپٹی ڈائریکٹر اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوتے ہیں۔ صوبے کو انتظامی ضرورت کے لیے مختلف ریجنوں (Regions) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ریجن میں ڈپٹی ڈائریکٹر نگران اعلیٰ ہوتا ہے۔ ہر ریجن کو مزید یونٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر یونٹ کی نگرانی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کرتا ہے۔ ضلعی صدر مقام میں ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر نظام سنبھالے ہوئے ہے۔

صحت عامہ کے لیے سہولتیں

ایک فلاحی مملکت میں عوام کی صحت کی حفاظت کے لیے خصوصی منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور سرکاری خزانے سے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے کثیر رقوم صرف کی جاتی ہیں۔ صحت کا شعبہ صوبائی حکومت کی نگرانی میں کام کرتا ہے اس کے باوجود وفاقی حکومت نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے صحت عامہ کو بہتر بنانے کے کئی اقدام وقتاً فوقتاً اٹھائے ہیں۔

1- **صحت کانفرنسیں :** 56-1947ء کے دوران حکومت پاکستان نے تین کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔ جن میں کئی ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ مقالے پڑھے گئے اور صحت کے حوالے سے مسائل اور ان کے حل تلاش کیے گئے۔

2- **طبی کمیشن :** ایوب خان نے 1959ء میں صحت کے بارے میں مربوط پالیسی وضع کرنے کے لیے ایک طبی کمیشن قائم کیا۔ کمیشن نے طبی تعلیم، طبی سہولتوں اور تحقیقی عمل کے متعلق رپورٹ تیار کر کے صدر کو پیش کر دی۔ اس کی سفارشات کی روشنی میں کارکردگی کو بہتر بنایا گیا۔

3- **طبی منصوبوں کی تشکیل :** پاکستان کے سارے پانچ سالہ منصوبوں میں صحت کے شعبے کے لیے رقوم مختص کی گئیں۔ ایک بیس سالہ طویل منصوبہ بھی ترتیب دیا گیا تاکہ

بیماریوں کی مکمل روک تھام کے لیے مناسب اقدام اٹھائے جا سکیں۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی تربیت، نئے ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کے قیام اور وبائی امراض کو ختم کرنے کے لیے جامع حل ڈھونڈے گئے۔

4- **میڈیکل کالجوں کا قیام:** پاکستان وجود میں آیا تو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج پاکستان کا اکلوتا میڈیکل کالج تھا۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے درج ذیل میڈیکل کالج قائم کیے۔
1- فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور 2- علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور 3- خیبر میڈیکل کالج پشاور 4- بولان میڈیکل کالج کوئٹہ 5- نشتر میڈیکل کالج ملتان 6- پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد 7- ایوب میڈیکل کالج ہزارہ 8- آرمی میڈیکل کالج راولپنڈی 9- قائد اعظم میڈیکل کالج بہاولپور 10- لیاقت میڈیکل کالج حیدر آباد 11- چانڈیو میڈیکل کالج لاڑکانہ 12- ڈاؤ (DAW) میڈیکل کالج کراچی 13- آغا خان میڈیکل کالج کراچی

5- **نرسنگ کونسل کا قیام:** 1949ء میں پاکستان نرسنگ کونسل بنائی گئی۔ تمام میڈیکل کالجوں اور بڑے ہسپتالوں کے ساتھ نرسنگ کے تربیتی ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں۔

6- **بیماریوں کی روک تھام:** چیچک، ملیریا، تپ دق، جزام، ہیضہ اور ایڈز جیسی بیماریوں کی روک تھام کے لیے حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ اور اس کی ایجنسیوں کے تعاون سے منصوبے بنائے ہیں۔ چیچک کی روک تھام کے لیے عالمی ادارہ صحت نے فنڈز اور فنی سہولتیں مہیا کر کے 1974ء میں اس موذی مرض کو سرے سے ختم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ملیریا کے خاتمے کی ادویات دی گئیں اور ملیریا کے جراثیم ختم کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ 1948ء سے ملیریا پر تحقیق کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ کراچی میں کام کر رہا ہے۔ تپ دق سے مرنے والوں کی سالانہ اوسط تعداد دو لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ حکومت نے ملک میں بھی بی سی جی کے ٹیکے لگانے اور غریبوں میں ادویات مفت تقسیم کرنے کے لیے کئی منصوبے مکمل کیے ہیں۔ حکومت نے کئی سینی ٹوریم بنائے ہیں اور نجی طور پر قائم ہونے والے کئی سینی ٹوریم کی مدد کی ہے۔ حکومت ہلال احمر سوسائٹی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے تاکہ تپ دق کے مرض کی روک تھام کر سکے۔ برسات میں ہیضے کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں جزام اور ایڈز کے خلاف بھی حکومت پوری طرح فعال ہے۔ ایڈز کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے حکومت نے خاص بندوبست کیا ہے۔

7- **صحت پالیسی:** حکومت پاکستان نے صحت عامہ کو بہتر بنانے کے لیے ایک جامع پالیسی

بنائی ہوئی ہے۔ گندے پانی کی نکاسی، پینے کے صاف پانی کی فراہمی، ماحول کو آلودگی سے پاک کرنے، بیماریوں کی روک تھام کے لیے ٹیکے لگانے، ادویات کی مناسب قیمتوں پر فراہمی اور فنی ماہرین کی تعلیم و تربیت کے اداروں کے قیام کی طرف خاص توجہ دی ہے۔

8- **آبادی کی منصوبہ بندی :** پاکستان میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی صحت کے مسائل میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ حکومت نے آبادی میں اضافے پر کنٹرول کے لیے منصوبے بنائے ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں مفت مشورے دینے کے مراکز موجود ہیں۔ ہر صوبے میں پاپولیشن پلاننگ کا محکمہ قائم ہے جس کے تحت ہر ضلع میں دفاتر کام کر رہے ہیں۔

9- **زچہ و بچہ کے مراکز :** ملک بھر میں سرکاری نگرانی میں زچہ و بچہ کے مخصوص مراکز چل رہے ہیں۔ تمام ہسپتالوں میں زچہ و بچہ کی بہبود کے لیے خاص شعبے موجود ہیں جہاں تربیت یافتہ نرسوں کی خدمات مہیا کی گئی ہیں۔ یونیسف (Unicef) زچہ و بچہ کے مراکز کے لیے فنڈز اور فنی امداد فراہم کرتا ہے۔

10- **غذائیت کا سروے :** ایک مخصوص ڈائریکٹوریٹ غذائیت کے بارے میں تحقیق اور سروے کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہ ادارہ غذائیت کی موجودہ سہولتوں کا جائزہ لیتا ہے۔ غذا کی کمی اور عوامی ضرورتوں کا اندازہ لگا کر رپورٹ پیش کرتا ہے۔ غذائیت کا معیار بہتر بنانے کے لیے تجاویز بھی مرتب کرتا ہے۔

ہسپتالوں کی اقسام

ملک بھر میں ہسپتالوں کی کئی اقسام ہیں۔ بعض ہسپتال براہ راست مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ نجی شعبے میں بھی ہسپتال قائم کیے گئے ہیں۔ ایسے ہسپتالوں کی حکومت مالی معاونت کرتی ہے۔

1- **عام ہسپتال :** مثلاً" میو ہسپتال، گنگا رام ہسپتال لاہور، ہولی فیملی ہسپتال، سروسز ہسپتال راولپنڈی، نشتر ہسپتال ملتان، لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور اور جناح ہسپتال کراچی۔

2- **زچہ و بچہ کے ہسپتال :** مثلاً" لیڈی ولنگڈن ہسپتال لاہور، فاطمہ میموریل ہسپتال لاہور۔

3- **کمبائنڈ ملٹری ہسپتال :** دفاعی افواج کے لیے یہ ہسپتال تمام بڑی چھاؤنیوں میں قائم

گئے ہیں۔

4- **میڈیکل کالجوں سے ملحق ہسپتال:** ہر میڈیکل کالج سے ملحق بڑا ہسپتال ہے جہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والوں کو عملی تربیت دینے کا بندوبست موجود ہے۔ لاہور میں ایسے ہسپتال میو ہسپتال، گنگا رام ہسپتال اور جناح ہسپتال ہیں۔

5- **ہلال احمر کے ہسپتال:** پاکستان کے کئی چھوٹے بڑے شہروں میں ہلال احمر سوسائٹی نے ہسپتال اور ڈسپنسریاں بنا رکھی ہیں۔ یہاں عام امراض کے علاوہ تپ دق کا علاج بالخصوص کیا جاتا ہے۔

6- **فلاحی اداروں کے ہسپتال:** مخیر افراد نے انسانی خدمت کے لیے ہسپتال بنائے ہوئے ہیں جہاں غریبوں کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ مثلاً" شیخ زید ہسپتال، لیٹن رحمت اللہ ہسپتال، ایدھی ٹرسٹ ہسپتال، شوکت خانم میموریل ٹرسٹ ہسپتال اور ممتاز بختاور ہسپتال۔

7- مندرجہ بالا ہسپتالوں کے علاوہ ریلوے ہسپتال، تپ دق کے ہسپتال، دماغی امراض کے ہسپتال، آنکھوں کے ہسپتال اور دانتوں کے ہسپتال بھی ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔

8- جوہری توانائی سے علاج کرنے کا بندوبست مخصوص ہسپتالوں میں کیا گیا ہے لاہور، کراچی ملتان، اسلام آباد اور پشاور میں ریڈیو آئیسوٹوپ کام کر رہے ہیں۔

سماجی بہبود (Social Welfare)

مفہوم: معاشرتی زندگی میں شہریوں کو خوشگوار ماحول مہیا کرنا حکومت کی اہم ذمہ داری ہے۔ حکومت معاشرے میں زیادہ سے زیادہ افراد کی بہبود کے انتظامات اور انسانی مسائل حل کرنے پر توجہ دے تو اسے سماجی بہبود کہتے ہیں۔ حکومت کے اس کام میں عوامی فلاحی ادارے بھی مدد دیتے ہیں۔ عوامی بہبود کے لیے کام کرنے والی انجمنوں کو حکومت مالی امداد مہیا کرتی ہے۔ اجتماعی بہبود کا تقاضا ہے کہ معاشرے کا خوش حال طبقہ ایسے افراد کی اعانت کرے جو پیچھے رہ گئے ہوں۔ یتیموں، بیواؤں، محتاجوں، بے روزگاروں اور بیماروں کو معاشرتی تحفظ ملنا چاہیے حکومت اور سماجی خدمات انجام دینے والے ادارے اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ پسماندہ عوام کا دھیان نہ رکھا جائے تو بے اطمینانی اور جرائم جنم لیتے ہیں۔

سماجی بہبود کا پس منظر: مغرب میں سماجی بہبود کا تصور بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ پچھلی صدی تک حکومت یا معاشرے کی طرف سے ضرورت مند افراد کی مدد کے لیے

کوئی مربوط اور منظم نظام موجود نہیں تھا۔ امیر لوگ انفرادی طور پر ضرورت مندوں اور بے کسوں کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ یہ جذبہ زیادہ تر مذہبی اثرات کے تحت پایا جاتا تھا۔ بیسویں صدی میں فلاحی ریاست کا تصور پھیلا نیز انجمنوں نے سماجی بہبود کو ایک باقاعدہ اور منظم عمل بنا دیا۔ ریاست بھی فلاحی انجمنوں کی مدد کرنے لگی۔ نئے معاشی، صنعتی اور معاشرتی مسائل نے سماجی بہبود کی ضرورت کو مزید بڑھایا۔

سماجی بہبود کو خیرات نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ اجتماعی کوششوں کے ساتھ ضرورت مندوں کو باعزت طور پر مدد دینے کا نام ہے۔ یہ مدد کرنے کا عمل (Helping Process) ہے تاکہ ضرورت مند کی ضروریات پوری ہو جائیں اور وہ اپنی روز مرہ زندگی باعزت طور پر گزارنے کے قابل بن جائے۔

اسلام نے سماجی بہبود کا تصور اپنے ابتدائی دور میں ہی متعارف کرا دیا تھا۔ غریبوں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کی امداد اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار پائی اور ہر فرد کو باوقار انداز میں جینے کے لیے تمام لوازمات فراہم کیے جانے لگے۔ زکوٰۃ کا سرکاری نظام رائج کیا گیا اور ناداروں تک ان کا حق پہنچانے کے لیے ادارے قائم کیے گئے۔

سماجی بہبود کی تعریف: اقوام متحدہ نے سماجی بہبود کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"سماجی بہبود کا مقصد صرف سماجی خرابیوں کا خاتمہ نہیں بلکہ ایسے حالات پیدا کرنا ہے جو افراد کی ذہنی، جسمانی اور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہیں۔"

ہربرٹ سٹروپ نے سماجی بہبود کی درج ذیل تعریف پیش کی ہے۔

"سماجی بہبود ایک فن ہے جس کے ذریعے عوامی گروہوں کے وسائل کو باقاعدگی سے اور اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت استعمال کیا جاتا ہے تاکہ عوام کی بنیادی ضرورتوں کو سائنٹیفک انداز میں پورا کیا جا سکے۔"

سماجی بہبود کے تقاضے: ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنے کے لیے یہ اقدامات ضروری ہیں:

1- **بنیادی ضروریات کی تکمیل:** روٹی، کپڑا اور مکان ہر انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ حکومت ان کی بہم رسانی کی ذمہ دار ہے۔ وہ منصوبہ بندی کرتی ہے روزگار کے مواقع پیدا کرتی ہے۔ محتاجوں، ضرورت مندوں اور بے روزگاروں کی کفالت کرتی ہے۔

2- **تعلیم و صحت:** انسان کی یہ دو اہم ضرورتیں ہیں۔ حکومت ان کی تکمیل کے لیے

ادارے بناتی ہے۔ تعلیم کے فروغ کے لیے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں، صحت کے تحفظ کے لیے ہسپتال، ڈسپنسریاں، میڈیکل کالج اور نرسوں کے تربیتی ادارے قائم کرتی ہے۔

3- **روزگار کی فراہمی:** فلاحی ریاست عوام کو ان کی صلاحیتوں اور علم و ہنر کے مطابق روزگار کی فراہمی کے لیے منصوبے ترتیب دیتی ہے۔ زراعت، صنعت و حرفت اور معدنیات جیسے وسائل کو ترقی دے کر روزگار کے مواقع پیدا کرتی ہے۔

4- **معیار زندگی:** انسان کا زندگی گزارنا ہی کافی نہیں، خوشگوار اور معیاری زندگی کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ حکومت عمدہ معیار زندگی کے لیے ماحول تخلیق کرتی ہے۔

5- **جان، مال اور عزت کا تحفظ:** عوام کی جان، مال اور عزت کی حفاظت فلاحی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ریاست میں جرائم کی روک تھام کے لیے پولیس اور عدلیہ کا مربوط نظام ہوتا ہے۔ سستا اور فوری انصاف ملتا ہے اور قانون کی حاکمیت ہوتی ہے۔

6- **بنیادی سہولتیں:** ڈاک، تار، فون، گیس، پانی، سیوریج، اور بجلی جیسی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں اور ذرائع آمدورفت کو بہتر بنایا جاتا ہے۔

7- **محنت کشوں کا تحفظ:** مزدوروں کو محفوظ اور منصفانہ ماحول ملتا ہے۔ ان کے اوقات کار اور مناسب اجرتوں کا تعین ہوتا ہے۔

پاکستان میں سماجی بہبود کے لیے اقدامات: سرکاری و غیر سرکاری سطح پر عوامی بہبود کے لیے بہت کام ہو رہا ہے۔ فلاحی مقاصد کے حصول کے لیے نجی اداروں کی مدد کی جاتی ہے۔

1- وزارت سماجی بہبود پاکستان، محنت کشوں اور ضرورت مندوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ افرادی قوت کا ڈویژن اس وزارت کے تحت محنت کشوں کی رجسٹریشن کرتا ہے اور غیر ممالک میں روزگار تلاش کرتا ہے نیز مزدوروں کے حالات کار بہتر بناتا ہے۔

2- ہر صوبہ میں سماجی بہبود کو وزارت صحت سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ہسپتالوں میں سوشل ورکرز مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ سوشل ویلفیئر آفیسر مریضوں سے ہر ممکن تعاون کرتے ہیں سماجی بہبود کا شعبہ عوامی بھلائی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

3- انجمن ہائے امداد باہمی حکومت کی سرپرستی میں رضاکارانہ طور پر کام کر رہی ہیں

دیہاتوں میں زرعی قرضے، تعمیر مکانات کے قرضے اور اجتماعی منصوبوں کی تکمیل کے لیے قرضے دیتی ہیں۔ یہ انجمنیں تعلیمی ادارے اور تفریحی مراکز بھی قائم کرتی ہیں۔

4- 1956ء میں سماجی بہبود کی قومی کونسل بنائی گئی۔ کونسل میں سرکاری اور غیر سرکاری ارکان شامل کیے گئے۔ کونسل کو ماہرین کی مدد بھی حاصل رہی ہے۔ کونسل ملک بھر میں رضاکارانہ بنیادوں پر کام کرنے والی انجمنوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ان میں باہم رابطہ قائم کرتی ہے۔

5- قومی کونسل کی مدد کے لیے چاروں صوبوں میں سماجی بہبود کی کونسلیں موجود ہیں۔ ہر کونسل اپنے اپنے صوبے میں خدمات انجام دینے والی فلاحی تنظیموں کو مالی اور فنی امداد دیتی ہے۔

6- مرکزی اور صوبائی سطح پر سیمینار اور کنونشن بلائے جاتے ہیں۔ کانفرنسوں میں مخیر اور درد دل رکھنے والے افراد کو مدعو کیا جاتا ہے اور فنڈز کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

7- پاکستان میں دیہی علاقوں کی ترقی اور دیہی عوام کے مسائل حل کرنے کے لیے ویلج ایڈ پروگرام 1953ء میں بنایا گیا۔ 1973ء میں پیپلز ورکس پروگرام اور جونیجو دور میں پانچ نکاتی پروگرام پر عمل کیا گیا۔ دیہی مسائل کو حل کرنے میں ان پروگراموں سے بڑی مدد ملی۔

8- تعلیم بالغاں کے لیے ہر پانچ سالہ منصوبے میں رقوم مختص کی گئیں۔ ریڈیو اور ٹی-وی -کے خصوصی پروگراموں کے ذریعے بالغوں کے لیے تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ نئی روشنی سکولز کھولے گئے اور حال ہی میں دیہی علاقوں میں ان پڑھ بالغوں کو پڑھانے کے لیے خصوصی ٹیمیں بھیجیں گئیں۔

9- رضاکار اداروں کی اعانت کے لیے حکومت کثیر رقوم خرچ کرتی ہے۔ ایدھی ٹرسٹ، شوکت خانم میموریل ہسپتال اور انصار برنی ٹرسٹ جیسے کئی ادارے انسانی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حکومت بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے کئی فلاحی ادارے مثلاً" عافیت، غنچہ، دارالامان، دارالفلاح، دارالشفقت، کاشانہ اور چمن اپنے خرچ پر چلا رہی ہے۔

ایمپلائز سوشل سکیورٹی سکیم

(Employees Social Security Scheme)

مفہوم : سکیم کا نفاذ مزدوروں کی بہبود کے لیے 1965ء میں عمل میں آیا۔ کراچی' حیدر آباد اور فیصل آباد میں مقامی شاخیں 1966ء میں وجود میں آئیں۔ سکیم کے لیے وسائل ٹیکسٹائل ملوں سے حاصل کیے گئے۔ ابتداء میں صرف ٹیکسٹائل اور بعد میں دوسری صنعتوں تک سکیم کا دائرہ بڑھا دیا گیا۔ آغاز میں صرف کارکنوں کو تحفظ ملا۔ 1969ء میں لواحقین کو بھی سہولتیں دے کی گئیں۔ حکومتی گزٹ میں نام کے اندراج کے 30 دنوں کے اندر ہر آجر حکومت کو ملازمین کی تعداد سے آگاہ کرتا ہے۔ اور فی ملازم 7 فیصد چندہ دفتر سوشل سکیورٹی میں جمع کراتا ہے۔ تاخیر کی صورت میں نصف فیصد فی یوم اضافی رقم وصول کی جاتی ہے۔ ہر آجر ملازم کا مکمل ریکارڈ رکھتا ہے۔ اور سکیم کے تحت دی گئی رقوم کا حساب دینے کا پابند ہے۔ نادھندہ کو صوبائی حکومت گرفتار کر سکتی ہے۔ اور اس کی جائداد بھی قرق کی جا سکتی ہے۔ سکیم کا اطلاق 3000 روپے سے کم تنخواہ پانے والے ملازمین پر ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ ہفتہ وار کم از کم 24 گھنٹے کام کرتا ہو۔ مہنگائی الاؤنس' یونیفارم الاؤنس' مکان کا کرایہ وغیرہ اجرت میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ 1994ء تک 1900 سے زیادہ اداروں میں یہ سکیم نافذ کر دی گئی' 375000 کارکن سکیم کی سہولتیں حاصل کر رہے ہیں۔

طبی مراکز و سہولتیں : پنجاب میں اس سکیم کے تحت درج ذیل مراکز قائم کیے گئے ہیں۔

بہاولپور-- 11' لاہور-- 34' شاہدرہ-- 18' سرگودھا-- 14' ملتان-- 14' راولپنڈی-- 26' گوجرانوالہ-- 24 اور فیصل آباد-- 22

1- لاہور اور راولپنڈی میں بالترتیب 400 اور 150 بستروں کے ہسپتال تعمیر کیے گئے ہیں۔ راولپنڈی کے ہسپتال میں بستروں کی تعداد 300 تک بڑھا دی گئی۔

2- سکیم سے پنجاب میں پونے چار لاکھ کارکن اور 12لاکھ سے زیادہ لواحقین استفادہ کر رہے ہیں۔

3- صنعتی ادارے میں آجر ڈسپنسری چلاتا ہے۔ محنت کشوں اور لواحقین کا مفت علاج ہوتا ہے بیماری کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے صوبائی حکومت کے ہسپتالوں میں موجود ماہرین

سے بھی علاج کروایا جا سکتا ہے۔ ادویات مفت مہیا کی جاتی ہیں۔

4- مریض کو ایمبولینس کی سہولت دی جاتی ہے۔ ایمبولینس نہ مل سکے تو دو طرفہ کرایہ دیا جاتا ہے۔

5- سوشل سکیورٹی ہسپتال میں داخل عام مریض کو خوراک کے لیے 50 اور تپ دق کے مریض کو 55 روپے ملتے ہیں۔ کام کے دوران میں اپاہج یا زخمی ہونے والے مزدور کو مصنوعی اعضاء مفت دیے جاتے ہیں۔ کام کے دوران میں موت کی صورت میں مزدور کی بیوہ اور اولاد کو علاج کی مفت سہولتیں ملتی ہیں۔

پنشن کی سہولتیں: معذوری کی صورت میں پنشن دی جاتی ہے۔ زخمی ہونے کی صورت میں گریجویٹی کی سہولت بھی حاصل ہے۔ دوران کار وفات پانے والے مزدور کے لواحقین کو پنشن کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ بیوہ کو پنشن کا 3/5 اور ہر بچے کو 1/5 حصہ دیا جاتا ہے۔ ہر بچے کو 21 سال تک پنشن ملتی ہے۔ اگر بیوہ یا اولاد نہ ہو تو ماں باپ کو 1/5 حصہ دیا جاتا ہے۔ والدین زندہ نہ ہوں تو بہن بھائیوں کو 1/2 حصہ ملتا ہے۔

مالیاتی سہولتیں: 1- کارکن بیمار ہو تو آخری اجرت کا 75 فیصد مالی معاوضہ دیا جاتا ہے۔

2- تپ دق اور کینسر کا مریض ہو تو یہ معاوضہ 100 فیصد مقرر کیا گیا ہے۔

3- دوران کار زخمی ہونے والے مزدور کو بھی 100 فیصد معاوضہ دیا جاتا ہے۔

4- 1993ء سے تپ دق اور کینسر میں مبتلا مزدوروں کو 365 دن مالیاتی سہولتیں ملتی ہیں۔

5- کوئی کارکن فوت ہو جائے تو تجہیز و تکفین کے اخراجات ادارہ برداشت کرتا ہے۔

اضافی اقدامات: بڑے شہروں میں مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے سوشل سکیورٹی ماڈل سکول بنائے گئے ہیں۔ بچوں کی یونیفارم' کاپیوں اور سٹیشنری کے اخراجات ادارہ اٹھاتا ہے۔ صنعتی علاقوں میں کارکنوں کے بچوں کے لیے نرسری سے انٹرمیڈیٹ تک معیاری تعلیم کی مفت سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔

1- شارٹ ہینڈ' اکاؤنٹس اور ٹائپ کی تربیت کے لیے مزدوروں کے بچوں کو وظائف دیے جاتے ہیں۔

2- سوشل سکیورٹی آرڈیننس میں ترمیم کر کے والدین کو بھی طبی تحفظ دیا گیا ہے۔

3- کارکن اپنی تعلیمی استعداد بڑھانا چاہے تو اسے ادارہ 1000 روپے فی سال دیتا ہے۔ فنی استعداد بڑھائے تو 1500 روپے سالانہ مدد ملتی ہے۔

4. مکان کی تعمیر کے لیے مزدور کر 10'000 روپے بطور امداد دیے جاتے ہیں۔
5. ہر بچی کی شادی پر 5000 کی رقم مہیا کی جاتی ہے۔

تعلیم (Education)

تعلیم کو ہر معاشرے کی ترقی کے لیے سب سے اہم عنصر تسلیم کیا گیا ہے۔ ترقی یافتہ اور تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنے والی اقوام نے تعلیم کی بدولت ہی سائنس' ٹیکنالوجی' ادب اور تہذیب میں بلند تر مقام پایا ہے۔ خالق کائنات کی صحیح پہچان کے لیے بھی علم کا حصول ضروری ہے۔ دنیاوی مقاصد بھی تعلیم کی مدد سے ہی بہتر طور پر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

پاکستان میں شرح خواندگی : پاکستان وجود میں آیا تو خواندگی کی شرح صرف 12 فیصد تھی۔ 1971ء میں مشرقی حصے کی علیحدگی کے بعد پاکستان میں صرف 21.7 فیصد پڑھے لکھے افراد تھے۔ 1981ء میں خواندگی کی شرح بڑھ کر 26.2 تک پہنچ گئی۔ یہ شرح بھی کسی طور تسلی ب[illegible] نہیں۔ پاکستان میں شرح خواندگی بہت سے ایشیائی ممالک سے بھی کم ہے۔ بعض مغربی اور ایشیائی ممالک سے موازنہ کچھ یوں ہے :-

1. جرمن' سوئٹزرلینڈ' جنوبی کوریا' ڈنمارک' سنگاپور......100 فیصد
2. جاپان......99.3 فیصد......ملائشیا......78 فیصد
3. چین' سری لنکا' تھائی لینڈ......85 فیصد
4. ایران......50.8 فیصد' بھارت......43 فیصد
5. بنگلہ دیش 33 فیصد' پاکستان......26.2 فیصد' نیپال......26 فیصد

بعض ماہرین کی تحقیق ہے کہ 1988ء میں پاکستان کی شرح خواندگی 30 فیصد تک پہنچ گئی اور اکنامک سروے آف پاکستان کے مطابق 1994ء میں 39 فیصد کو چھو رہی تھی۔ ملک میں انقلاب لانا ہے۔ تو شرح خواندگی کا معیار اور تناسب بڑھانے کے لیے کوشاں ہے اور اپنے داخلی مسائل کے علاوہ بیرونی امداد کے حصول کی بھی کوشش جاری ہے۔

تیسری دنیا کے نو ممالک کی تعلیمی کانفرنس 1994ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ "تعلیم [illegible]ب کے لیے" کانفرنس کا نعرہ تھا۔ یونیسکو اور یونیسف کے نمائندوں نے بھی شرکت کی پاکستان تعلیمی تناسب کو بڑھا کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ تاحال

پرائمری تعلیمی اداروں میں داخل ہونے والوں کا تناسب 71 فیصد ہے۔ داخلہ لینے والے بچوں کی آدھی تعداد پرائمری تعلیم کو ادھورا چھوڑ جاتی ہے کیونکہ والدین کی غربت اور جہالت آڑے آتی ہے۔ حکومت پنجاب نے تعلیم عام کرنے کے منصوبے بنائے ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ رقوم مختص کی ہیں۔ صوبہ پنجاب کے 1994ء کے بجٹ کا 18.5 فی صد یعنی 16 ارب 70 کروڑ اور 9 لاکھ روپے تعلیم کے لیے دیے گئے۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبوں میں کثیر رقوم خرچ کی جا رہی ہیں۔ حکومت پنجاب نے اسمبلی سے پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دیے جانے کا قانون منظور کروا کے آئندہ دو تین سالوں میں پرائمری سطح پر داخل ہونے والوں کا تناسب 100 فیصد تک پہنچانے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ وفاقی حکومت عالمی بنک اور دیگر عالمی اداروں کے تعاون سے ایک جامع تعلیمی منصوبہ متعارف کرا رہی ہے۔ 97-1994ء کے دوران نصابی تبدیلیوں کے علاوہ تحقیق کے عنصر کو بھی اہمیت دی جائے گی۔ یونیسکو نے حکومت پاکستان سے سفارش کی ہے کہ وہ اپنی قومی آمدن کا 4 فیصد تعلیم کے فروغ کے لیے مخصوص کر دے۔ یاد رہے کہ پاکستان تاحال 2.1 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔ ہم اس اعتبار سے چند ممالک سے پاکستان کا موازنہ کرتے ہیں۔

پاکستان...... 2.1 فیصد، بھارت...... 3.4 فیصد، کینیڈا...... 7.2 فیصد

سری لنکا...... 3.8 فیصد، فرانس...... 5.7 فیصد، امریکہ..... 6.7 فیصد

تعلیم کی اہمیت اور مقاصد : تعلیم معاشرتی بہبود اور ترقی کے لیے لازم ہے۔ اسی لیے فلسفیوں اور ماہرین نے تعلیم کے حصول پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ ہمارے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے بھی ہمیں تعلیم کی اہمیت کا علم ہوتا ہے۔ فرمایا! "علم حاصل کرنا ہر مرد و زن پر فرض ہے۔" یہ بھی فرمایا "عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے" افلاطون نے تعلیم کو سب سے بڑی نیکی سے موسوم کیا ایک چینی فلسفی نے لکھا، "آپ ایک سالہ منصوبہ بنانا چاہتے ہوں تو فصل کاشت کریں، دس سالہ منصوبہ ہو تو شجرکاری کریں اور اگر تاحال منصوبہ بندی ہے تو عوام کو تعلیم دیں۔ تعلیم کی اہمیت کا اندازہ لگائیں کہ خدائے بزرگ و برتر کے پیغام کے اولین الفاظ ہیں "پڑھ! اپنے رب کے نام سے" الغرض تعلیم ہی وہ زینہ ہے جس کی مدد سے ہم پاکستانی اکیسویں صدی کے تقاضے پورے کر سکیں گے۔

سچائی کی تلاش : صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کے لیے علم ضروری ہے۔ تعلیم انسان کو حق اور سچائی کی تلاش میں مدد دیتی ہے۔ خدائے عظیم کی وحدانیت اور عظمت کا پتہ بھی

تعلیم ہی دیتی ہے۔ علم انسانی ذہن کو حقیقت سے روشناس کراتا ہے وہ تو ہمات اور غلط رسموں سے چھٹکارا پاتا ہے اور خدائے واحد کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکتا۔

انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما: تعلیم انسان کے اندر چھپی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ قدرت نے انسانوں کو بڑی صلاحیتیں عطا کی ہیں علم انہیں بروئے کار لانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ تعلیم کے بغیر صلاحیتوں کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ اگر کسی فرد کو سائنس دان، فنکار یا انجینئر بننے کی صلاحیت بخشی ہو تو زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے بغیر یہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا۔

جمہوریت کا فروغ: جدید دور جموری دور ہے اور جموریت کو بہترین طرز حکومت مانا گیا ہے لیکن طرز جمہوریت کو کامیابی سے چلانا تعلیم اور سیاسی شعور سے مشروط ہے۔ اگر رائے دہندگان علم و شعور سے عاری ہوں تو وہ اپنے ووٹ کا مناسب استعمال نہیں کر سکتے۔ تعلیم احساس ذمہ داری کو ابھارتی ہے۔ تعلیم کی بدولت انسان علاقائی قومی اور بین الاقوامی مسائل سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہ آگہی جمہوریت کو کامیاب بنانے میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ جہالت اور جمہوریت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حقوق و فرائض: تعلیم شہری کو حقوق و فرائض سے آشنا کرتی ہے اور وہ اجتماعی زندگی گزارنے کے طور طریقے سیکھ لیتا ہے۔ انسان کی روزمرہ زندگی کو خوبصورت بنانے اور رواداری کا جذبہ پیدا کرنے میں تعلیم کا ہاتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ حقوق و فرائض کے باہمی تعلق سے آگہی معاشرہ کو خوش گوار بنا دیتی ہے۔

اعلیٰ قدروں کا فروغ: اعلیٰ قدروں کو اپنانے، رواداری، خلوص اور بھائی چارے سے کام لینے کا جذبہ تعلیم کی مدد سے فروغ پاتا ہے۔ تعلیم یافتہ افراد میں دوسروں کو خوشیوں اور مسائل کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی انسانوں کو سکون کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

مادی پہلو: تعلیم مادی پہلو میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ ملازمت کی تلاش اور کاروبار کے فروغ میں مدد دیتی ہے۔ تعلیم اعلیٰ قدروں کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ روزگار کا ایک اہم ذریعہ بھی سمجھی جاتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے لوگ صنعت و حرفت، زراعت اور معدنی وسائل سے زیادہ بہتر انداز میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تعلیمی نظام کا ڈھانچہ

(Educational Structure)

پاکستان میں تعلیم کے درج ذیل مدارج ہیں۔

پرائمری تعلیم : پرائمری تعلیم اول سے پنجم تک محدود ہے۔ ابتدائی کلاسوں میں معمولی پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ حکومت نے 1994ء میں پرائمری تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دے دیا ہے۔ بچوں کو سکول نہ بھیجنے والے والدین قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ آدھے بچوں کو سکول میں داخل ہی نہیں کرایا جاتا۔ داخل ہونے والے طلبہ میں سے آدھے بچے تعلیم ادھوری چھوڑ جاتے ہیں۔ لازمی تعلیم کے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت نے سوشل ایکشن پروگرام کے تحت 2986 نئے پرائمری سکول کھولنے اور 1000 مسجد سکولوں کو باقاعدہ پرائمری سکولوں کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ پرائمری سطح پر انگریزی کو تمام سکولوں میں لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ پرائمری تعلیم کے مسائل درج ذیل ہیں۔

1- اساتذہ کی تنخواہیں کم اور معاشرتی درجہ ناموزوں ہے۔
2- تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی، بنیادی سہولتوں کی عدم موجودگی اور عمارتوں کا فقدان ہے۔
3- پرائمری تعلیم کے لیے رقوم کم مختص کی جاتی ہیں جس سے بنیاد کمزور رہ جاتی ہے۔
4- سمعی و بصری اعانات (A.V.Aids) سے پوری طرح کام نہیں لیا جا رہا۔

ثانوی تعلیم : ششم سے دہم تک کلاسیں ثانوی درجہ میں شمار ہوتی ہیں ششم سے ہشتم تک مڈل اور نہم و دہم کی کلاسوں کو میٹرک کی تعلیم کا نام دیا گیا ہے۔ پاکستان میں مڈل سکول قریباً 8000 اور ہائی سکول 4000 سے زیادہ ہیں۔ 1994ء میں مزید 468 پرائمری سکولوں کو مڈل سکول کا درجہ دیا گیا ہے۔

اعلیٰ ثانوی تعلیم : اس سطح پر آرٹس، سائنس اور کامرس کی تعلیم کے لیے دو سال کا کورس ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کا امتحان "بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن" لیتا ہے۔ عام طور پر اعلیٰ ثانوی تعلیم کالجوں میں دی جاتی ہے۔ کالجوں کی کمی کے پیش نظر بعض سکولوں میں بھی اعلیٰ ثانوی کلاسوں کا اجرا کر دیا گیا ہے۔

اعلیٰ تعلیم : ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ بی اے، بی ایس

سی بی کام، ایم اے، ایم ایس سی، ایم کام، ایم بی بی ایس، انجینئرنگ، قانون اور زراعت کی اعلیٰ ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی کرایا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے تمام شعبوں کے امتحانات یونیورسٹیاں خود لیتی ہیں۔ یونیورسٹیاں سرکاری کنٹرول میں کام کرتی ہیں۔ اب حکومت نجی یونیورسٹیوں کے قیام کی حوصلہ افزائی بھی کر رہی ہے۔ تاحال پاکستان میں 23 یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں تین زرعی، پانچ انجینئرنگ اور ایک میڈیکل یونیورسٹی ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد مواصلاتی طریقے سے تعلیم دیتی ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا ہے۔ ہر یونیورسٹی کا چانسلر صوبہ کا گورنر ہوتا ہے۔ انتظامی امور کا عملاً ذمہ دار وائس چانسلر ہے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن یونیورسٹیوں کو رقوم فراہم کرتا ہے۔

پاکستان میں تعلیمی سہولتیں

(Educational Facilities in Pakistan)

پاکستان میں سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ حکومت تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ مختلف اقسام کی تعلیم کے لیے ادارے موجود ہیں۔ نئے ادارے کھولے جا رہے ہیں۔ نجی سطح پر بھی تعلیمی اداروں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ جدید طریقہ ہائے تعلیم بھی متعارف کرائے جا رہے ہیں۔

روایتی تعلیم : پرائمری، مڈل، ہائی سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں روایتی تعلیم دی جاتی ہے۔ میٹرک، انٹر اور ڈگری کے درجات ہیں۔ پوسٹ گریجوایشن کا بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اہتمام کیا گیا ہے۔

طبی تعلیم : پاکستان میں 1947 میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج واحد میڈیکل گریجوایشن کالج تھا۔ گزشتہ 50 سالوں میں تمام بڑے شہروں میں میڈیکل کالج بنا دیے گئے ہیں۔ صرف لاہور میں تین کالج ہیں۔ راولپنڈی میں آرمی میڈیکل کالج فوج کے لیے ڈاکٹر تیار کرتا ہے۔

انجینئرنگ کی تعلیم : ہر ضلع میں ٹیکنیکل کالج ہے۔ لاہور کراچی اور جام شورو میں انجینئرنگ یونیورسٹیاں ہیں۔ میرین اکیڈمی اور داؤد انجینئرنگ کالج کراچی میں انجینئرز تیار کر

رہے ہیں۔ ٹیکسلا میں انجینئرنگ یونیورسٹی قائم کر دی گئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں کیمیکل ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ اور فیصل آباد میں زرعی یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

قانون کی تعلیم : لاہور، کراچی، پشاور، کوئٹہ، ملتان اور حیدر آباد میں لا کالج موجود ہیں۔ نجی سطح پر لاء کالجوں کے قیام کی اجازت ہے، جس طرح پنجاب لاء کالج، جناح لاء کالج اور انجمن حمایت اسلام لاء کالج کا قیام کیا گیا۔ ان اداروں میں اسلامی قانون کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔

تجارتی تعلیم : ملک بھر میں کامرس کالج، کمرشل انسٹی ٹیوٹس اور ووکیشنل انسٹی ٹیوٹس کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ ملک کی کئی یونیورسٹیوں میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری دی جاتی ہے۔ آغا خان فاؤنڈیشن نے تجارت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور میں ایک ادارہ بنایا ہے۔

زرعی تعلیم : فیصل آباد اور ٹنڈو جام میں زرعی یونیورسٹیاں بنائی گئی ہیں راولپنڈی میں بارانی زرعی کالج اور فیصل آباد میں زرعی تحقیق کا انسٹی ٹیوٹ موجود ہیں۔

تعلیم برائے اساتذہ : اساتذہ کی تعلیم کے لیے پاکستان بھر میں ورنیکلر سکول، نارمل سکول، ایجوکیشن کالج اور فنی تعلیم کے کالج موجود ہیں۔ اسلام آباد میں ایک اکیڈمی بنی ہے۔

تعلیم بالغاں : وفاقی حکومت کے علاوہ چاروں صوبائی حکومتوں نے بھی بالغوں کی تعلیم کے لیے خصوصی پروگرام ترتیب دیے ہیں۔ "تعلیم سب کے لیے" کا نعرہ لگایا جا رہا ہے۔

مواصلاتی تعلیم : خط و کتابت کے ذریعے تعلیم دینے والا ادارہ اسلام آباد کی علامہ اقبال اوپن یونورسٹی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی اس ادارہ کی معاونت کر رہے ہیں۔

تعلیمی مسائل

(Educational Problems)

ناخواندگی (Illiteracy) : علم انسانوں کو دیگر جانداروں سے ممتاز مقام دلاتا ہے۔ قدیم وجدید تہذیبوں نے علم کی بدولت ہی عروج پایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کو عالموں اور دانشوروں کی وجہ سے برتر حیثیت ملی۔ پاکستان کی پسماندگی، غربت اور کم تر معیار کا بنیادی

سبب ناخواندگی ہی ہے۔ شہریوں کی بڑی اکثریت ناخواندہ ہونے کی وجہ سے قومی تعمیر میں پوری طرح حصہ نہیں لے رہی۔ صنعت و حرفت، زراعت، تجارت اور دیگر شعبوں میں پاکستان ناخواندگی کی وجہ سے ہی پسماندہ ہے۔ جمہوریت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے حوالے سے بھی ناخواندگی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ ناخواندگی نے بے روزگاری، منشیات، غربت، فرقہ واریت، آلودگی اور افراط آبادی جیسے مسائل کو مزید الجھایا ہوا ہے۔ 1981ء میں ناخواندہ افراد کی تعداد 73.8 فیصد تھی۔ آبادی میں 3.1 فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر رفتار یہی رہی تو صدی کے خاتمے تک ان پڑھ پاکستانیوں کی تعداد 83 ملین تک پہنچ جائے گی۔ ہر دیہات میں پرائمری سکول ہونا چاہیے۔ پاکستان میں 45 ہزار دیہات ہیں۔ شہری علاقوں میں بھی سب بچوں کو تعلیم کے مواقع نہیں مل رہے۔ ہمیں تعلیم کی شرح سو فیصد بنانے کے لیے خاص منصوبہ بندی کرنی ہو گی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی (Science and Technology): مغربی دنیا نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ پاکستان سمیت اکثر مشرقی ممالک نے اس جانب بہت بعد میں توجہ دی ہے سائنس اور تیکنیکی علوم پر مغرب کی دسترس نے اسے سمندر کی گہرائیوں سے لے کر چاند کی سطح تک غالب بنا دیا ہے۔ پاکستان میں اگر ہم غربت، بے روزگاری اور ذلتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تمام تر قوتیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے صرف کرنا ہوں گی۔ جدید ٹیکنالوجی کے علوم سے نئی نسل کو بہرہ ور کرنا ضروری ہے۔

آبادی میں اضافہ (Population Growth): حکومت زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے لیے کوشاں ہے۔ نئے تعلیمی ادارے کھولے جا رہے ہیں ان تمام اقدامات کے باوجود آبادی میں تیزی سے ہونے والا اضافہ مسائل کو بڑھا رہا ہے۔ ہر منٹ میں 11 بچے جنم لے رہے ہیں۔ حکومتی اقدامات بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کے متحمل نہیں ہو پا رہے۔ مطلوبہ شرح خواندگی کے لیے آبادی کی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ آبادی موجودہ رفتار سے بڑھتی رہی تو تمام ترقیاتی اور تعلیمی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

اعلیٰ تعلیم میں مہارت (Specialization in Higher Education):
موجودہ دور مہارت کا دور ہے۔ یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف موزوں افراد کو مواقع

دیے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے شعبوں میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ معمول کی تعلیم کے بعد پاکستان میں بھی اعلیٰ تعلیم موزوں ترین افراد تک محدود ہو اور وہ صرف خصوصی شعبے میں مہارت حاصل کریں۔ ٹیکنالوجی کے شعبے میں حکومت کو کثیر رقوم مہارت حاصل کرنے پر خرچ کرنی چاہیں۔ امریکہ اپنی قومی آمدن کا 2.7 فیصد، جاپان 2.27 فیصد، جنوبی کوریا 1.22 اور بھارت 0.81 ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کر رہا ہے پاکستان میں 0.21 فیصد رقوم اس مد پر خرچ ہو رہی ہیں پاکستان میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد 1988ء میں 1048 تھی جو توقع ہے کہ 1997ء تک بڑھ کر 1300 تک پہنچ جائے گی۔ سائنسی تحقیق سے وابستہ پی ایچ ڈی افراد کی کل تعداد 1990ء میں 148 تھی جب کہ بھارت میں یہ تعداد 1943 تک پہنچ چکی تھی۔ حکومت پاکستان کو اس شعبے میں خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں عدم توازن:
(Imbalance between Public and Private Sector) :

پاکستان میں تعلیمی اداروں کے 1972ء میں قومیائے جانے کے بعد نجی سطح پر کام کرنے والے اداروں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ 1992ء تک پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں میں نمایاں فرق ہے۔ 1992ء میں تعلیمی پالیسی کی رو سے نجی سطح پر ہونے والے کام کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ ہوا۔ 1991ء تک نجی اور سرکاری اداروں کا تناسب 30 : 70 تھا۔ گزشتہ چار سالوں میں نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں یہ تناسب 50:50 ہو گیا۔ روایتی تعلیمی اداروں کے علاوہ نجی سطح پر قانون، تجارت اور طب کے ادارے بھی قائم ہوئے ہیں حکومت نے پرائیویٹ سیکٹر میں 16 یونیورسٹیاں اور متعدد سکول اور کالج قائم کرنے کی منظور دے دی ہے۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں توازن ضرور پیدا کرنا چاہیے لیکن یہ بھی ضرروری ہے کہ پرائیویٹ ادارے فیس مناسب رکھیں تاکہ عام لوگ بھی مستفید ہو سکیں۔

بے روزگاری طلب اور رسد:
Unemployment Demand and Supply

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قومی اقتصادی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے فنی تعلیم کو زیادہ رواج دیں تاکہ فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ و طالبات کو روزگار کے مواقع میسر آئیں۔ سادہ آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ملک میں بے روزگاری کا باعث بنی ہوئی ہے۔ طلب اور رسد میں یہ تضاد متعدد الجھنوں کا سبب بنا ہے۔ ملک میں مذید پولی

ٹیکنیک اور کمرشل ادارے کھولے جانے چاہیں۔ حکومت نے اس جانب توجہ دینا شروع کی اور 2002ء تک ایسے اداروں کی تعداد 66 سے بڑھ کر 99 ہو جائے گی۔ یوں قومی ضرورت کے مطابق افرادی قوت موجود ہوگی اور بے روزگاری کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔

طلبہ میں بے چینی (Students unrest) : پاکستان ہی نہیں، دنیا کے بہت سے خطوں میں نوجوان طلبہ بے چین و مضطرب نظر آتے ہیں۔ وہ موجودہ معاشرتی و معاشی نظام سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے منفی رویے اختیار کرلیتے ہیں۔ نوجوان نسل میں بے چینی کے محرکات یہ ہیں۔

1- تعلیمی سہولتیں بہت محدود ہیں۔ حکومت تعلیمی شعبے پر نسبتاً کم خرچ کرتی ہیں۔

2- معاشرے میں موجود تضادات طلبہ کو مایوس کر رہے ہیں۔ وہ کتابوں میں زندگی کے روشن پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن عملی صورت بالکل متضاد نظر آتی ہے۔ سماج دشمنوں کی کامیابی انہیں مایوس کر رہی ہیں۔

3- نااہل افراد رشوت اور سفارش کے بل بوتے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

معاشرے میں مادیت پرستی کی دوڑ نے غلط اثرات طلبہ پر بھی مرتب کیے ہیں۔

5- سیاسی مداخلت نے طلبہ کو منفی راہوں پر ڈال دیا ہے۔

6 دولت کی نامنصفانہ تقسیم طلبہ کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔

7 تعلیم کی بے مقصدیت بھی مایوسی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

8- نوجوان نسل کو فارغ اوقات گزارنے کے لیے تفریحی سہولتوں کا فقدان ہے۔ صحت مند ذرائع بہت کم ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلبہ غلط سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔

سوالات

1- حکومت پاکستان نے صحت عامہ کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات اٹھائے ہیں؟

2- پاکستان میں ہسپتالوں کی اقسام بیان کریں۔

3- سماجی بہبود سے کیا مراد ہے؟ حکومت پاکستان نے سماجی بہبود کے لیے کیا اقدامات اٹھائے ہیں؟

4- ایمپلائز سوشل سیکورٹی سکیم کا مفہوم اور فرائض کی تفصیل بیان کریں۔
5- تعلیم کی اہمیت اور مقاصد بیان کریں۔
6- پاکستان میں تعلیم کے مسائل اور ان کا حل لکھیں۔
7- حکومت پاکستان نے تعلیمی شعبے میں عوام کے لیے کون کون سی سہولتیں مہیا کی ہیں؟

باب ہفتم

پولیس نظم و ضبط اور ادارے

Police Order and Institutions

مفہوم اور تنظیم (Meaning and Organization) : برصغیر میں مسلمانوں کے دور حکومت میں پولیس کا نظام موجود تھا۔ مغلوں نے پولیس اور عدالت کے فرائض بالترتیب کوتوال اور قاضی کے سپرد کیے ہوئے تھے۔ تاہم جدید پولیس نظام کی بنیاد دور انگلشیہ میں پڑی۔ پولیس کی تشکیل فوج کی معاونت کے لیے کی گئی۔ لارڈ کار نوالیس نے کلکتہ میں 1791ء میں پہلا ایس پی مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ پولیس نظام تمام شہروں اور صوبوں میں پھیلا دیا گیا۔ 1849ء میں پنجاب برطانوی عملداری میں آیا تو یہاں بھی پولیس نظام متعارف ہوا۔ 1861ء میں پولیس کمیشن کی سفارشات پر پنجاب سمیت تمام صوبوں میں آئی جی اور ڈی آئی جی کے عہدے تخلیق ہوئے اور ضلع کا پولیس سربراہ ایس پی کو بنایا گیا۔ 1861ء کے ایکٹ کی رو سے ہی پاکستان بھر میں پولیس نظام قائم ہے۔ پولیس ضلعی انتظامیہ کی نگرانی میں کام کرتی ہے۔ ایس پی ضلعی انتظامیہ کے احکام بجا لاتا ہے جس کا سربراہ ڈپٹی کمشنر ہے۔ 1861ء کا ایکٹ نوآبادی کو پوری طرح سامراجی شکنجے میں جکڑنے کے لیے بنایا گیا تھا تاکہ استعمار کے تجارتی مقاصد کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ 1934ء میں بنائے گئے پنجاب پولیس رولز کے مطابق بھی ڈپٹی کمشنر کو جرائم پر کنٹرول کے لیے قائم کی گئی انتظامی مشینری کا سربراہ تسلیم کیا گیا۔

1953ء میں پولیس نظام کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کے لیے شہاب الدین رپورٹ مرتب ہوئی لیکن اقتدار کی رسہ کشی میں مصروف سیاستدانوں کی بدولت رپورٹ پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ 1955ء میں وحدت مغربی پاکستان کے بعد ہوم ڈیپارٹمنٹ کو پولیس پر کنٹرول کے تمام اختیارات سونپے گئے۔ 1958ء کے مارشل لا کے نفاذ کے بعد پولیس نظام کو پولیس پر کنٹرول کے تمام اختیارات سونپے گئے۔ پولیس نظام کو جدید خطوط پر ڈالنے کے لیے ایوب خاں نے 61-1960ء میں جسٹس کانسٹائن کی قیادت میں پولیس کمیشن قائم کیا۔ کمیشن کی سفارشات کی رو سے پولیس سروس آف پاکستان' کے علاوہ صوبائی پولیس سروس'

اور ماتحت پولیس سروس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ محکمہ پولیس سمیت دیگر کئی محکموں کو سول سروس کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔ حتیٰ کہ انجینئرنگ، صحت اور تعلیم کے امور کے فیصلے بھی سول سروس سے متعلقہ اعلیٰ افسران کرنے لگے۔

1970ء میں وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر کے چار صوبے بحال کر دیے گئے اور جنرل یحییٰ خاں نے جنرل مٹھا کی سربراہی میں پولیس کمیشن بٹھایا۔ کمیشن کی سفارشات پر نئے قواعد بنائے گے۔ حالات کار بہتر بنانے اور تنخواہ میں اضافہ کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن محکمہ پولیس میں عدم اطمینان کی فضا برقرار رہی حتیٰ کہ پولیس ملازمین نے لاہور، فیصل آباد اور ساہیوال میں ہڑتال کر دی اور برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1973ء میں جی احمد کی سربراہی میں اصلاح احوال کے لیے سفارشات مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اصلاحات کے نتیجے میں تمام اعلیٰ سروسز کو مساوی حیثیت دی گئی تاہم پہچان کے لیے پولیس گروپ الگ ترتیب دیا گیا۔ فوجی افسروں کو محکمہ پولیس میں لیے جانے کی پالیسی بھی اپنائی گئی۔

جرائم پر کنٹرول کے لیے پنجاب میں 1982ء میں کرائمز کنٹرول کمیٹیاں بنائی گئیں ضلعی سطح پر کمیٹی کا سربراہ ڈی سی اور سب ڈویژن کی سطح پر اے سی کو بنایا گیا۔ پولیس کے خلاف شکایات کی سماعت کر کے کمیٹی پولیس انتظامیہ کو ہدایت جاری کرتی ہے۔ پولیس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے مسٹر اسلم حیات کی سربراہی میں ایک کمیٹی 1985ء میں تشکیل دی گئی جس کی سفارشات کی روشنی میں مزید اصلاحات کی گئیں۔

پنجاب پولیس کی تنظیم (Organization)

دستور پاکستان کے آرٹیکل 70 کے تحت جرائم پر کنٹرول اور نظم و ضبط کے قیام کا فریضہ صوبائی حکومتوں کے سپرد ہے۔ وفاقی حکومت داخلی گڑبڑ کو رفع کرنے کے لیے صوبے کی اعانت کرنے کی ذمہ دار ہے۔ کسی صوبے میں نظم و ضبط کے قیام میں دشواریاں ہوں تو وفاقی حکومت مداخلت کا اختیار رکھتی ہے۔ دستور کے تحت وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں کو جرائم روکنے کے لیے قانون سازی کا اختیار حاصل ہے۔ محکمہ پولیس کے گزٹیڈ پولیس افسران درج ذیل ہیں۔

آئی۔جی، ایڈیشنل آئی۔جی، ڈی۔آئی۔جی، اے۔آئی۔جی، ایس۔پی، اے۔ایس پی، ڈی۔ایس۔پی، ماتحت عہدیدار یہ ہیں۔ انسپکٹر، ایس۔آئی، اے۔ایس۔آئی، ہیڈ کانسٹیبل اور

فٹ کانسٹیبل۔ پولیس اور سول انتظامیہ میں ہر سطح پر کوآرڈی نیشن قائم کی گئی ہے۔ ہوم سیکرٹری، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، اسسٹنٹ کمشنر، سب ڈویژنل مجسٹریٹ اور علاقہ مجسٹریٹ سول افسران ہیں جو بالترتیب آئی۔جی، ڈی۔آئی۔جی، ایس۔پی اور ایس۔ایچ۔او سے رابطہ قائم رکھتے ہے۔ ہر تحصیل ہیڈکوارٹر میں اے۔ایس۔پی یا ڈی۔ایس۔پی تعینات ہے جسے سب ڈویژنل پولیس آفیسر کہتے ہیں۔ تحصیل میں تین سے سات تھانے ہوتے ہیں۔

انسپکٹر جنرل آف پولیس (.I. G)

صوبائی پولیس کا سربراہ انسپکٹر جنرل ہے جو صوبائی حکومت کی منظوری کے ساتھ محکمانہ تنظیم، کارکردگی اور تقسیم اختیارات کے متعلق احکامات صادر کرتا ہے۔وہ محکمے کے اہل کاروں کو ضروری سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ تاکہ وہ فرائض منصبی صحیح طور پر ادا کر سکیں۔ آئی جی کے ماتحت پنجاب میں 50,000 سے زیادہ نفری کام کرتی ہے۔ اپنے جملہ فرائض کی بجا آوری کے لیے آئی جی وزیر اعلیٰ سے مسلسل رابطہ رکھتا ہے۔ معمول کے فرائض کے لیے وہ ہوم سیکرٹری سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے جو ہوم ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہے۔ پنجاب کے تمام محکموں کا سربراہ چیف سیکرٹری ہے جو آئی جی کی سالانہ خفیہ رپورٹ بھی لکھتا ہے۔ آئی جی کی مدد کے لیے سنٹرل پولیس آفس موجود ہے جس میں ایڈیشنل آئی جی، ایک ڈپٹی انسپکٹر جنرل (ہیڈکوارٹرز) اور کئی اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل تعینات ہیں جو دفتر کی مختلف برانچوں کا کام سنبھالتے ہیں۔

ڈپٹی انسپکٹر جنرل (.D. I. G)

ہر ڈویژن میں انتظامی سربراہ کمشنر ہے اور ڈویژن کے تمام علاقوں میں پولیس فورس کا انچارج ڈی آئی جی کہلاتا ہے۔ ڈویژن کے تمام اضلاع کے پولیس ہیڈکوارٹرز میں باہم رابطہ قائم رکھنا اور عمومی نگرانی کرنا ڈی آئی جی کی ذمہ داری ہے۔ وہ اپنے رینج (Range) میں شامل اضلاع کی کارکردگی کا جائزہ لیتا رہتا ہے تاہم ایس پی کی طرح روز مرہ امور میں زیادہ گہرائی میں نہیں جاتا۔ اس کا کام ضلعی پولیس سربراہوں کی راہنمائی اور نگرانی تک ہی محدود ہوتا ہے، کمشنر ڈویژن کی رابطہ کمیٹیوں کے اجلاس طلب کرتا ہے۔ ڈی آئی جی، ڈی سی اور ایس پی ایسے اجلاسوں میں شرکت کرتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (S. P.)

ایس پی پولیس نظام کا بڑا اہم عہدیدار ہے جو آئی جی اور ڈی آئی جی کی نگرانی میں اپنے فرائض نبھاتا ہے نیز ضلعی انتظامیہ سے تعاون کرتے ہوئے وہ شہریوں کی جان، مال اور عزت کا محافظ ہوتا ہے۔ ضلعی پولیس کے تمام شعبے ایس پی کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ وہ پولیس اہل کاروں کو ضروری سہولتیں بہم پہنچاتا ہے اور ان کی مدد سے ضلع میں نظم و ضبط قائم رکھتا ہے۔ چھوٹے اضلاع میں ایس پی کی تمام تر توجہ جرائم روکنے پر مرکوز رہتی ہے۔ بڑے اضلاع میں معمول کی ذمہ داریاں کے علاوہ وہ وی آئی پی شخصیتوں کے تحفظ اور انہیں پروٹوکول فراہم کرنے کی اضافی ذمہ داریاں بھی پوری کرتا ہے۔ ٹریفک، لائسنس، ڈرگ کنٹرول اور صنعتی امن کے قیام جیسی ذمہ داریاں بھی نبھاتا ہے۔ ایس پی کی مدد کے لیے ایڈیشنل ایس پی اور اے ایس پی یا ڈی ایس پی ہیڈکوارٹرز موجود ہوتے ہیں۔ ہر ضلع میں شامل تحصیلوں میں سب ڈویژنل پولیس آفیسرز اپنے اپنے علاقوں کے تھانوں کی نگرانی کرتے ہیں اور جرائم پر کنٹرول کے امور میں ایس پی کے معاون ہوتے ہیں۔

سٹیشن ہاؤس آفیسر (S.H.O)

سٹیشن ہاؤس آفیسر پولیس مشینری کا موثر ترین پرزہ ہے۔ 1861ء کے ضابطہ فوجداری کے مطابق ایس ایچ او کے اختیارات بڑے وسیع ہیں۔ عوام سے اس کا براہ راست رابطہ ہوتا ہے۔ وہ عوام کو تحفظات مہیا کرنے اور قانون کی عملداری کے لیے ذمہ داری نبھاتا ہے۔ ٹریفک حادثات، فسادات اور دیگر ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ علاقہ مجسٹریٹ سے ہمہ وقت رابطہ رکھتا ہے۔

ایس ایچ او کے ماتحت سب انسپکٹر، اے ایس آئی، ہیڈکانسٹیبل اور کانسٹیبل کام کرتے ہیں۔ خواتین کو بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ پولیس ملازمت میں لیا جا رہا ہے۔ حکومت نے خواتین کے لیے علیحدہ تھانے قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

بھرتی: فٹ کانسٹیبل، اے ایس آئی اور اے ایس پی پولیس سروس کے بنیادی عہدے ہیں جن کا چناؤ براہ راست کیا جاتا ہے۔ باقی عہدوں پر محکمانہ رپورٹوں کی روشنی میں ملازمین کو ترقی دی جاتی ہے۔ اے ایس پی کا تقرر وفاقی پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر مرکزی حکومت کرتی ہے۔ کمیشن مقابلے کا امتحان منعقد کرکے میرٹ کی بنیاد پر امیدواروں

کی سفارش کرتا ہے۔ اے ایس آئی کے عہدے پر نچلے رینک سے بھی ترقی دی جاتی ہے اور براہ راست بھی چناؤ ہوتا ہے۔ ہر رینج میں ڈی آئی جی کی نگرانی میں امتحان لیا جاتا ہے۔ تحریری اور زبانی امتحان کے علاوہ جسمانی موزونیت کا بھی دھیان رکھا جاتا ہے۔ کانسٹیبل کے عہدہ کے لیے چناؤ سپرنٹنڈنٹ پولیس، ایڈیشنل ایس پی، اے ایس پی ہیڈکوارٹرز اور ایک گزیٹڈ پولیس افسر پر مشتمل کمیٹی کرتی ہے میٹرک پاس اور جسمانی وطبی طور پر موزوں جوان امتحان میں شریک ہو سکتے ہیں۔

تربیت : تمام اے ایس پی اپنے حتمی چناؤ کے بعد پولیس ٹریننگ کالج سہالہ میں 25 ماہ کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ وہاں نظری و عملی دونوں اعتبار سے بنیادی علوم سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اسلام آباد نیشنل پولیس اکیڈیمی میں اعلیٰ پولیس افسروں کے لیے متعدد کورسز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ماہرین اپنے اپنے شعبوں کے حوالے سے لیکچر دیتے ہیں۔ بیسویں سکیل میں ترقی کے امیدوار پولیس افسروں کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن لاہور میں چار ماہ کا کورس مکمل کروایا جاتا ہے۔ یہاں اکاؤنٹس، کمپیوٹر، دیہی ترقی، انتظامی امور اور قانون کی خصوصی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ ترین پولیس عہدوں پر فائز افراد کو قانون کی خصوصی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ ترین پولیس عہدوں پر فائز افراد کو ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج لاہور اور نیشنل ڈیفنس کالج کوئٹہ میں کورسز کروائے جاتے ہیں۔ پنجاب پولیس کے تربیتی مراکز میں دیگر صوبوں کے افسروں کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ناردرن ایریا پولیس ریلوے پولیس، ایف آئی اے کے افسروں کو بھی تربیتی سہولتیں حاصل ہیں۔

اے ایس آئی کے عہدہ پر تعینات ہونے والے افراد کو بنیادی تربیت سہالہ پولیس ٹریننگ کالج میں دی جاتی ہے۔ وہ ایک سال کے لیے قانون، تفتیشی طریقہ ہائے کار، اسلحہ، گھڑ سواری اور سماجی پہلوؤں کے متعلق تربیت پاتے ہیں۔ ڈی ایس پی کے عہدہ تک کے افسروں کو محکمانہ کورسز کروائے جاتے ہیں۔

کانسٹیبلوں کے لیے پنجاب میں آٹھ تربیتی مراکز لاہور، سرگودھا، فاروق آباد، بہاولپور، ملتان، راولپنڈی اور ڈیرہ غازی خان میں قائم ہیں۔ ہر مرکز کا کمانڈنٹ ڈی۔ایس۔پی ہوتا ہے۔ چھ ماہ کی ابتدائی تربیت کے بعد کانسٹیبلوں کو پولیس سٹیشنوں میں باقاعدہ تعینات کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ موزوں امیدواروں کو بعد ازاں سہالہ پولیس ٹریننگ کالج میں مزید کورسز کروائے جاتے ہیں۔

پولیس کی کارکردگی اور اہمیت

Functions and Importance of Police

پولیس کے فرائض مختلف قسم کے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں امن و امان کے قیام اور عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لیے پولیس دن رات مصروف عمل رہتی ہے۔ پولیس کے اہم فرائض درج ذیل ہیں جن سے اس محکمے کی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

1- **جرائم پر کنٹرول :** چوری، ڈکیتی، راہ زنی، اغوا، نقب زنی، جوا، فراڈ اور آتش زنی جیسے جرائم کی روک تھام کے لیے پولیس ہر وقت چوکس رہتی ہے۔ پولیس سٹیشنوں میں عادی مجرموں کا ریکارڈ، تصاویر اور فنگر پرنٹس موجود ہوتے ہیں۔ پولیس مجرموں کو پکڑنے، ان کے اڈے تلاش کرنے اور سماج دشمن گروہوں کا کھوج لگانے میں مصروف رہتی ہے۔

2- **مقدمات کی تیاری :** پولیس ملزموں کے خلاف مقدمات تیار کرتی ہے، ثبوت ڈھونڈتی ہے اور عدلیہ کے کام کو آسان بناتی ہے۔ مظلوم شہریوں سے ایف آئی آر وصول کرتی ہے اور حقائق کی تلاش میں مصروف عمل رہتی ہے۔ پراسیکیوٹنگ (Prosecuting) عملہ پولیس سے تعاون کرتا ہے۔ یہ پولیس کی جانب سے عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرتا ہے۔

3- **ٹریفک کنٹرول :** پولیس کا شعبہ ٹریفک کو سڑکوں پر کنٹرول اور ٹریفک کے اژدہام پر قابو پاتا ہے۔ پولیس اہل کار چوراہوں اور سڑکوں پر ڈیوٹی دیتے ہیں۔ وہ ٹرکوں، بسوں، کاروں، ویگنوں اور موٹر سائیکلوں کو ترتیب کے ساتھ رواں دواں رکھتے ہیں۔ ٹریفک اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کا چالان کیا جاتا ہے۔ مقدمات تیار کرکے عدالتوں میں پیش کرنا پولیس کا ہی کام ہے۔

4- **پروٹوکول ڈیوٹی :** صدر، وزیراعظم، گورنر اور وزیراعلیٰ سمیت اہم شخصیتوں کو پولیس پروٹوکول مہیا کرتا ہے۔ انہیں دوران سفر محفوظ رکھتی ہے۔ اور ان کی رہائش گاہوں و دفاتر کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

5- **جلسوں اور جلوسوں میں امن :** سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور دیگر اجتماعات میں امن کا قیام اور مخالفانہ تخریبی سرگرمیوں کی روک تھام پولیس کی اہم ذمہ داری ہے۔ محرم کے جلوس میں پولیس پر امن ماحول قائم رکھنے کی خصوصی کوشش کرتی ہے۔ جلسے اور جلوس منظم کرنا شہریوں کا بنیادی حق ہے۔ پولیس اس حق کی حفاظت کرتی ہے۔

6- دہشت گردی کی روک تھام: سماج دشمن عناصر اپنے مذموم مقاصد کے لیے دہشت گردی سے کام لیتے ہیں' بموں کے دھماکے' فائرنگ اور مخالف تنظیموں پر حملے کرتے ہیں- پولیس نے دہشت گردوں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے اینٹی ٹیررسٹ سیل (Anti..Terrorist..Cell) بنا رکھا ہے- اس کا انچارج ڈی آئی جی ہے-

7- ہائی وے پٹرولنگ: بڑی چھوٹی تمام سڑکوں پر پولیس کے اہلکار گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر گشت کرتے رہتے ہیں- تاکہ راہ زنی اور ڈکیتی کی وارداتوں کو روکا جا سکے- ضرورت پڑنے تو وہ حادثات کا شکار ہونے والے شہریوں کو ہسپتال تک پہنچاتے ہیں ہر ریجن میں ڈرائیونگ سکولز کھولے گئے ہیں- صوبائی سطح پر ڈی آئی جی اور ڈویژنل سطح پر ایس پی انچارج ہوتا ہے-

8- کرائم کنٹرول کمیٹی: 1982ء میں حکومت پنجاب نے ہر ضلع اور سب ڈویژن میں کرائم کنٹرول کمیٹی تشکیل دی جس کا سربراہ بالترتیب ڈی سی اور اے سی کو بنایا گیا- ضلعی کمیٹی میں ایس پی' قومی اسمبلی کے دو اور صوبائی اسمبلی کے تین ارکان' چیرمین ڈسٹرکٹ کونسل اور چیرمین میونسپل کمیٹی کو شامل کیا گیا- سب ڈویژن میں اے ایس پی' ڈی ایس پی' ایک ایک ممبر قومی و صوبائی اسمبلی' ڈسٹرکٹ کونسل کا ایک رکن اور چیرمین میونسپل کمیٹی کو کمیٹی میں شریک کیا جاتا ہے- کرائم کنٹرول کمیٹی علاقے میں جرائم کی رفتار اور ان کی روک تھام کے طریقوں پر بحث کرتی ہے- کمیٹی عوام کی شکایات سن کر مناسب اقدامات اٹھاتی ہے-

9- دیگر محکموں سے تعاون: وفاقی' صوبائی اور نیم سرکاری ادارے اپنے قواعد وضوابط پر محکموں کو عمل کرانے کے لیے پولیس فورس کا تعاون حاصل کرتے ہیں- ریونیو' آبپاشی' کسٹم اور ایکسائز کے محکموں کو محصول کی وصولی میں مشکلات ہوں تو پولیس کی مدد حاصل کر سکتے ہیں- ریلوے سے پولیس کا ایک مستقل ادارہ وابستہ ہے- محکمہ جیل سے بھی پولیس کا روز کا رشتہ ہے- میونسپل کارپوریشن اور ترقیاتی ادارے بھی مدد لیتے ہیں-

10- سمگلنگ' ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکیٹنگ: سماج دشمن عناصر غیر قانونی طریقوں سے منافع حاصل کرتے ہیں تو پولیس حرکت میں آ جاتی ہے- سمگلروں' ذخیرہ اندوزوں' منافع خوروں اور بلیک مارکیٹ میں اشیا فروخت کرنے والوں کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی

جاتی ہے۔ ناکہ بندیاں کر کے چھاپے مارے جاتے ہیں۔

11- **کرائم برانچ:** اہم اور پیچیدہ کیس اسی برانچ میں تفتیش کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ برانچ کا سربراہ ڈی آئی جی ہے جس کے ماتحت چھ ایس پی، چودہ ڈی ایس پی اور باقی عملہ کام کرتا ہے۔ برانچ میں فنگر پرنٹس بیورو اور سائنس لیبارٹری بھی موجود ہے جو مجرموں کو تلاش کرنے میں مدد دیتی ہے۔ 1985ء میں کرائم برانچ میں جائنٹ ٹاسک فورس بنائی گئی جس میں کسٹمز، ایکسائز، نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے نمائندے لیے گئے۔ اب یہ فورس ختم کر دی گئی ہے۔ اور جملہ فرائض مرکزی نارکوٹکس بورڈ کو سونپ دیے گئے ہیں۔ کرائم برانچ بینک ڈکیتی، کار لفٹنگ اور غنڈہ گردی جیسے جرائم کا سراغ لگاتی ہے۔

محکمہ پولیس کی کارکردگی بہتر بنانے کی تجاویز

1- **بہتر حالات کار:** پولیس کے نچلے طبقے کی تنخواہ اور سہولتیں کم ہیں جب کہ کام دن رات لیا جاتا ہے۔ اس کو ذہنی و جسمانی طور پر بہت بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ کانسٹیبل کو عوامی ستائش کی بجائے مذاق اور تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لازم ہے کہ کانسٹیبل کی تنخواہ، الاؤنس اور سہولتوں میں اضافہ کیا جائے۔

2- **سیاسی دباؤ کا خاتمہ:** پولیس پر سیاسی دباؤ اسے غلط کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ تبادلے کروائے اور رکوائے جاتے ہیں اور بااثر افراد کی طرف سے جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی کی جاتی ہے۔ یوں پولیس مجرموں کو پکڑنے اور سزا دلوانے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ نامناسب سیاسی مداخلت کا تدارک ضروری ہے۔

3- **پولیس سٹیشنوں کی حدود:** پولیس سٹیشن کی حدود بہت وسیع ہیں جس سے کنٹرول میں دشواری پیش آتی ہے۔ حدود کم کر کے نفری بڑھا دی جائے تو بہتر نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں 1500 سے 1850 تک کی آبادی کے لیے ایک پولیس اہلکار ہے۔ یہ تناسب بہتر ہونا چاہیے اور فورس کو جدید اسلحے سے لیس کیا جانا چاہیے۔

4- **سول سروس کا کنٹرول:** پولیس کو ہر سطح پر سول سروس کے تابع رکھا گیا ہے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کمشنر، ڈی سی اور اے سی بالترتیب آئی جی، ڈی آئی جی، ایس پی اور اے ایس پی پر انتظامی کنٹرول رکھتے ہیں۔ دوہرا نظام پیچیدگیوں کا باعث ہے۔ نیز اس میں عدم

اعتماد اور رقابت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ پولیس کو اپنا نظام خود چلانے کا موقع دیا جائے تو بہتر ہو گا۔

5- تربیتی اداروں کی کارکردگی: پولیس کے تربیتی اداروں کے اساتذہ حالات کار سے مطمئن نہیں۔ وہ خوش دلی سے ذمہ داریاں قبول نہیں کرتے۔ پولیس کمیشن 1969ء نے انسٹرکٹروں کے متعلق لکھا کہ پرنسپل سے نیچے تک تمام انسٹرکٹرز پولیس سروس کے "پرابلم چلڈرن" ہیں جنہیں مختلف برانچوں سے ناپسندیدہ قرار دے کر نکالا گیا اور تربیتی اداروں میں بھیج دیا گیا۔ ایسے مایوس اور عدم دلچسپی کا شکار اساتذہ سے بہتر کارکردگی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

6- عوامی رابطے: عوام کو پولیس افسروں تک اپنے مسائل پہنچانے میں سہولت حاصل ہو ایس پی اور دیگر آفیسر کھلی کچہریاں لگائیں۔ افسر عوام کے معاشرتی و معاشی پس منظر سے آگاہ ہوں۔ سزا بھگت کر معاشرہ میں واپس آنے والوں کی بحالی کے لیے پولیس ان کی نگرانی کرے۔ پولیس عوامی جذبوں کا دھیان رکھے تو بہتر صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

7- پولیس کی جواب دہی: پولیس کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مختلف ادارے بہت مفید کردار ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بے لاگ اور مثبت انداز میں اپنے فرائض ادا کریں۔ ان اداروں میں ابلاغ عامہ کے ذرائع خصوصاً" قابل ذکر ہیں۔ عوامی نمائندے اور خود عوام پولیس پر کنٹرول کر کے اسے اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے روک سکتے ہیں۔

8- انتظامیہ اور عدلیہ کی علیحدگی: 1973ء کا دستور دونوں شعبوں کے علیحدہ علیحدہ کردار کا حامی ہے۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا جائے اور انتظامی عہدیداروں کو عدالتی اختیارات حاصل نہیں ہونے چاہییں۔

پنجاب میں جیلوں کا نظام

معاشرتی زندگی کو خرابیوں سے پاک کرنے اور قانون کی عمل داری کو یقینی بنانے کے لیے مجرموں اور سماج دشمن عناصر کے خلاف موزوں اقدامات کا اٹھایا جانا ضروری ہے۔ پولیس ایسے عناصر کا سراغ لگا کر گرفتار کرتی ہے اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انہیں ملکی عدالتوں کے روبرو پیش کر کے سزا دلواتی ہے۔ سزاؤں پر عمل درآمد کرنے

کے لیے جیلوں کا نظام ہر معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ پاکستان کے دستور کی رو سے محکمہ جیل کو صوبائی تحویل میں دیا گیا ہے۔ چاروں صوبوں میں یہ محکمہ منظم انداز میں چلایا جا رہا ہے۔ صوبہ پنجاب میں مرکزی دفتر فیروز پور روڈ لاہور پر واقع ہے۔

محکمہ جیل خانہ جات کا ڈھانچہ

پنجاب میں تاحال 28 جیلیں ہیں' ان کی تفصیل یہ ہے۔

1- صوبہ بھر میں دس سنٹرل جیلیں درج ذیل شہروں میں کام کر رہی ہیں۔
لاہور' راولپنڈی' بہاول پور' ساہیوال' گوجرانوالہ' بہاول نگر' ڈیرہ غازی خان' میانوالی' فیصل آباد اور ملتان

2- ڈسٹرکٹ جیلوں کی کل تعداد 15 ہے۔
لاہور' ملتان' فیصل آباد' سیالکوٹ' جھنگ' شیخوپورہ' رحیم یار خان' گجرات' قصور' مظفر گڑھ' شاہ پور' اٹک' جہلم' سرگودھا اور راجن پور

3- خواتین کے لیے ملتان میں علیحدہ جیل بنائی گئی ہے۔

4- نوعمر مجرموں کے لیے بہاولپور میں ایک بورسٹل جیل موجود ہے۔

پاکستان میں وسائل کی کمی کے باعث جیلوں میں قیدی گنجائش سے زیادہ رکھے جاتے ہیں۔

جیل قوانین کا ارتقا

برصغیر میں جیلوں کا باقاعدہ تصور 1750ء میں ابھرا۔ ابتدا میں جیلوں کا نظام کافی سخت تھا اور مجرموں کو غیر انسانی ماحول میں رکھا جاتا تھا۔ 1777ء میں کمیشن بنایا گیا۔ سماجی برائیوں کی روک تھام اور مجرموں کی اصلاح کے لیے مناسب اقدام اٹھائے گئے۔ 1894ء میں جیل ایکٹ اور 1900ء میں قیدیوں کا ایکٹ نافذ کیا گیا۔ بعد ازاں 1926ء اور 1955ء میں ترامیم کر کے مندرجہ بالا قوانین کو نئی شکل دی گئی۔ تخلیق پاکستان کے بعد 1955ء میں جیل قوانین کو حالات کے مطابق ڈھالا گیا۔ 1978ء میں نیا جیل مینوئل تیار ہوا جس کے مطابق آج کل جیلوں کا نظام جاری و ساری ہے۔

محکمہ جیل خانہ جات (Jail Department)

مرکزی دفتر: پنجاب میں جیلوں کے نظام کو کنٹرول کرنے کے لیے لاہور میں مرکزی دفتر فیروز پور روڈ پر موجود ہے۔ اس دفتر کا تنظیمی ڈھانچہ درج ذیل ہے۔

1- انسپکٹر جنرل

محکمے کا اعلیٰ ترین افسر انسپکٹر جنرل ہے جو اپنی کارکردگی کے لیے حکومت پنجاب کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کو جواب دہ ہے۔ آئی جی تمام جیلوں اور ان میں تعینات عملے کی نگرانی کرتا ہے۔ اس کا چناؤ براہ راست بھی ہو سکتا ہے اور محکمے کے اعلیٰ افسروں میں سے بھی کسی کو ترقی بھی دی جا سکتی ہے۔ مرکزی دفتر میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل اپنے انسپکٹر جنرل کی راہنمائی میں جملہ فرائض ادا کرتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل ماتحت ملازمین کی ترقی اور تبادلہ کے فیصلے کرتا ہے۔ ان کے خلاف محکمانہ کاروائی کا حکم دیتا ہے۔ انہیں قانون کے مطابق معطل یا برطرف کرسکتا ہے۔ انسپکٹر جنرل تمام جیلوں میں اشیائے ضروریہ کی فراہمی کا بندوبست کرتا ہے اور تمام ترقیاتی کاموں کا اعلیٰ ترین نگران ہوتا ہے۔ بجٹ کے مطابق جیلوں کے لیے رقوم کی فراہمی انسپکٹر جنرل کے دفتر سے ہی کی جاتی ہے۔ ہر جیل کا سال میں کم از کم ایک بار معائنہ کیا جانا لازم ہے۔ انسپکٹر جنرل جیل کے کھیتوں، ورکس شاپس، کچن، رہائشی بارکوں، واٹر سپلائی، ہسپتال، ریکارڈ اور دفتری کارکردگی کا جائزہ لیتا ہے۔ تمام جیلوں کے متعلق سالانہ رپورٹ ہوم ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی جاتی ہے۔

2- ڈپٹی انسپکٹر جنرل (ہیڈ کوارٹرز)

آئی جی آفس میں ڈی آئی جی ہیڈ کوارٹرز 19 ویں گریڈ کا آفیسر ہے۔ جو مختلف شعبوں میں آئی جی کی معاونت کرتا ہے۔ مثلاً

1- جیلوں کا معائنہ، 2- دفتری عملہ کی نگرانی، 3- بجٹ کی تیاری، 4- ترقیاتی منصوبوں کی تیاری، 5- قیدیوں کی خوراک کی فراہمی اور ٹھیکوں کا تعین، 6- زرعی منصوبوں کی تشکیل، 7- جیلوں کی انتظامیہ پر کنٹرول، 8- سٹاف ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی نگرانی

3- ڈپٹی انسپکٹر جنرل (انسپکشن)

یہ بھی 19 ویں گریڈ کا آفیسر ہے اور درج ذیل شعبوں میں آئی جی کی معاونت کرتا ہے۔

1- جیلوں کا معائنہ، 2- جیل میں صنعتوں کی نگرانی، 3- آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ، 4- سالانہ انتظامی رپورٹ کی تیاری، 5- جیل سٹاف کی اپیلوں کی سماعت، 6- قیدیوں اور حوالاتیوں کے امور کی نگرانی، 7- جیل مصنوعات کی فروخت

4- اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل

18 ویں گریڈ کا افسر ہے اور درج ذیل فرائض ادا کرتا ہے۔

1- فیکٹریوں کا معائنہ، 2- مختلف جیلوں میں مصنوعات کی نگرانی، 3- مختلف فرموں کے ساتھ جیلوں کے اندر صنعتوں کے قیام کے لیے رابطہ، 4- آئی جی کی طرف سے سپرد کردہ دیگر احکامات کی بجا آوری

5- آفیسر انچارج (تربیت)

17 ویں گریڈ کا افسر ہے اور محکمانہ تربیتی امور کی نگرانی کرتا ہے۔

1- وارڈوں کی تربیت کے پروگراموں کی تشکیل اور نگرانی، 2- ماتحت عملہ میں ماہر نفسیات، مذہبی امور کا استاد، ڈرل کا انچارج اور کلرکس وغیرہ شامل ہیں۔

جیل عملہ کی تفصیل: پنجاب میں تا حال 28 جیلیں ہیں۔ ہر جیل میں عملہ کی تفصیل یوں ہے۔

1- سپرنٹنڈنٹ

سپرنٹنڈنٹ جیل کا اعلیٰ ترین افسر ہوتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کا تقرر براہ راست بھی ہوتا ہے۔ اور یہ عہدہ ترقی پانے والے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو بھی دیا جاتا ہے۔ براہ راست تقرر پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر ہوتا ہے۔ اور ان کا کوٹہ 50 فیصد ہے۔ ایم بی بی ایس یا سائیکالوجی کی ڈگری یافتہ افراد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ تقرر کے بعد دو سال کا تربیتی کورس

مکمل کروایا جاتا ہے- تربیت کی تکمیل پر بطور سپرنٹنڈنٹ تقرر عمل میں آتا ہے- سپرنٹنڈنٹ درج ذیل فرائض ادا کرتا ہے-

1- انسپکٹر جنرل کے احکامات پر عمل درآمد' 2- جیل میں نظم و ضبط اور مالیات پر کنٹرول' 3- قیدیوں کی سزاؤں پر عمل درآمد' 4- جیل کا مکمل ریکارڈ رکھنا' 5- ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایات پر عمل درآمد' 6- انسپکٹر جنرل کو رپورٹیں بھیجنا' 7- پرژن ایکٹ 1894ء اور دیگر قواعد و ضوابط پر عمل درآمد' 8- جیل کا روزانہ معائنہ' 9- قیدیوں کی دیکھ بھال' خوراک کا معائنہ' ہسپتال کی نگرانی' 10- نگران عملہ میں ذمہ داریوں کی تقسیم' 11- سٹور' اسلحہ اور کھیتوں کا معائنہ

2- میڈیکل آفیسر / اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر

عموما" ہر جیل میں ایک میڈیکل آفیسر ضرور ہوتا ہے بیشتر سنٹرل جیلوں میں دو میڈیکل آفیسر مقرر کیے گئے ہیں- میڈیکل آفیسر ضلعی ہیلتھ آفیسر کے ماتحت ہوتا ہے اور جیل کے اندر صحت کے امور میں سپرنٹنڈنٹ جیل سے تعاون کرتا ہے- ڈسٹرکٹ جیلوں میں اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر مقرر کیا جاتا ہے- میڈیکل آفسر درج ذیل ذمہ داریاں ادا کرتا ہے-

1- اتوار اور دیگر تعطیلات کے علاوہ ہر روز جیل میں راؤنڈ لگاتا ہے-
2- قیدیوں کی جسمانی و ذہنی صحت کا دھیان رکھتا ہے- ہسپتال ہر جیل کے اندر قائم ہے-
3- جیل کے اندر حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کراتا ہے-
4- ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایات پر عمل کرتا ہے-
5- کچن کا معائنہ کرتا ہے- راشن کی مقدار دیکھتا ہے-
6- وبائی امراض کی روک تھام کے لیے مناسب اقدام اٹھاتا ہے-

3- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا تقرر براہ راست اور ترقی' ہر دو طریقے سے کیا جاتا ہے براہ راست تقرر کے لیے سفارشات پبلک سروس کمیشن سے طلب کی جاتی ہیں- حکومت پنجاب تقرر کا پروانہ جاری کرتی ہے- دو سال کے تربیتی کورس کے بعد باقاعدہ ذمہ داریاں سونپ دی جاتی ہیں- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ درج ذیل فرائض ادا کرتا ہے-

1- سپرنٹنڈنٹ کے معاونت اور تمام ہدایات پر عمل در آمد کرنا۔
2- ماتحت عملے کے ارکان اور قیدیوں میں نظم و ضبط برقرار رکھنا۔
3- جیل کے تمام شعبوں کا روزانہ معائنہ اور ہر قیدی کی پڑتال کرنا۔
4- کچن، سٹور، ورک شاپ، کھیتوں، ہسپتال اور دیگر جگہوں کا معائنہ کرنا۔
5- قواعد و ضوابط پر عمل در آمد کے بارے میں رپورٹ بک تیار رکھنا۔
6- روزانہ لاک اپ کا کھولنا اور بند کروانا۔
7- قیدیوں کی مشقت کا روزانہ تعین کرنا۔
8- نئے قیدیوں کا داخلہ اور قید پوری کرنے والے افراد کو فارغ کرنا۔
9- قیدیوں سے ملنے کے لیے آنے والے افراد کی ملاقات کا بندوبست کرنا۔
10- دفتری عملے کے کاموں کی نگرانی کرنا اور ملازمین کی ذمہ داری کا تعین کرنا۔

4- اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ

سنٹرل جیل میں سات سے گیارہ تک اور ڈسٹرکٹ جیل میں پانچ سے سات اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہیں۔ نان گزٹیڈ پوسٹ ہے۔ بھرتی براہ راست کی جاتی ہے۔ البتہ انسپکٹر جنرل کو اختیار ہے کہ وہ سٹور کیپروں اور اکاؤنٹ کلرکوں میں سے اہل افراد کو بھی اس عہدے پر مقرر کر سکتا ہے۔ پبلک سروس کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں حکومت پنجاب تقرر عمل میں لاتی ہے۔ کامیاب امیدواروں کو لاہور کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں چار ماہ تربیت دی جاتی ہے۔

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کی اہم ذمہ داریاں درج ذیل ہیں۔

1- سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی ہدایات اور احکامات پر عمل در آمد کرنا۔
2- قیدیوں کا داخلہ، تبدیلی اور خروج
3- فیکٹریوں، کچن، کھیت اور دیگر جگہوں کا معائنہ
4- گارڈز کی تبدیلی اور وارڈنوں میں کام کی تقسیم
5- قیدیوں کو روزانہ لاک اپ میں بند کرنا اور کھولنا، رات کو جیل کا راؤنڈ لگانا۔
6- ملاقاتیوں سے قیدیوں کی ملاقات کروانا۔
7- قیدیوں کی اپیلوں اور پٹیشن کے بارے میں ضروری کارروائی کرنا۔

5- ماتحت عملہ

ماتحت عملے میں چیف وارڈن، ہیڈ وارڈن، وارڈن اور سٹور کیپر شامل ہیں۔

تربیت : سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ اور دیگر جیل ملازمین کی تربیت کے لیے مختلف کورسز کا اہتمام محکمہ جیل کی جانب سے کیا جاتا ہے تربیتی کورسز کی میعاد مختلف ہے۔ آغاز میں بنیادی کورسز کرائے جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے ریفریشر کورسز کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ لاہور میں ڈسٹرکٹ جیل کے قریب ایک مستقل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ موجود ہے جہاں پنجاب کے علاوہ صوبہ جات سرحد، بلوچستان اور سندھ کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر کے جیل ملازمین کو تربیتی کورسز کرائے جاتے ہیں۔ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں پرنسپل اور وائس پرنسپل سمیت ماہرین پر مشتمل عملہ موجود ہے۔ ماہرین نفسیات و معاشرتی بہبود زیر تربیت ملازمین کو لیکچرز دیتے ہیں۔

محکمہ جیل خانہ جات کے فرائض اور کارکردگی

1- سزاؤں پر عمل درآمد : ملکی عدالتوں سے سزا پانے والے مجرموں کو جیلوں میں سزا دی جاتی ہے۔ محکمہ سزاؤں پر عمل درآمد کا پورا ریکارڈ رکھتا ہے اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کو حقائق سے باخبر رکھتا ہے۔ کسی مجرم کی اپیل کی سماعت یا قومی و ملی دنوں کی خوشی میں سزا کم کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے تو جیل کا عملہ اطلاع پاتے ہی عمل درآمد کرتا ہے۔

2- قیدیوں کی نگرانی : مجرم اور حوالاتی جیل میں رکھے جاتے ہیں۔ عملہ ان کی صحت کا دھیان رکھتا ہے۔ انہیں ایک سے دوسری جیل بھیجنے کے احکامات پر عمل درآمد کرتا ہے اور انہیں جیل گیٹ پر پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ قیدیوں کی نگرانی کی ذمہ داری جیل کی حدود کے اندر تک کے لیے ہوتی ہے۔ قیدیوں کے فرار کی صورت میں عملہ جواب دہ ہوتا ہے۔

3- نظم و ضبط کا قیام : جیل کے اندر محبوس افراد کو نظم و ضبط کا پابند بنایا جاتا ہے۔ اگر کوئی فرد جیل کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ جیلوں میں جرائم پیشہ اور قانون شکن عناصر سزا بھگتنے آتے ہیں اس لیے نظم و ضبط کا ماحول استوار رکھنے میں کافی ہوش اور ذمہ داری سے کام لینا پڑتا ہے۔

4- اخراجات پر کنٹرول : سالانہ بجٹ میں جیل کے نظم و نسق کے لیے رقوم مختص کی

جاتی ہیں قیدیوں کی روزمرہ کی ضروریات کی فراہمی محکمے کی ذمہ داری ہے۔ خوراک' لباس رہائش' ادویات اور دیگر احتیاجات کے لیے صوبائی حکومت سالانہ بجٹ ترتیب دیتی ہے۔ جیلوں کو خود کفیل بنانے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ سبزیاں اگائی جاتی ہیں اور مختلف مصنوعات کی تیاری سے بھی جیلوں کو خاصی آمدن ملتی ہے۔

5- **قوانین پر عمل درآمد:** 1894ء کے جیل ایکٹ سمیت تمام جیل رولز پر محکمے کے افسران عمل کرتے ہیں۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ مسلسل ہدایات جاری کرتا رہتا ہے۔ جیل حکام سالانہ اور ماہانہ رپورٹیں بھیجتے ہیں۔

6- **سزا یافتگان کی بحالی:** جیل انتظامیہ قیدیوں کی سزاؤں کا ریکارڈ رکھتی ہے سزا کی تکمیل پر قیدی کو رہا کیا جاتا ہے۔ جیل کے اندر ایسے اقدام اٹھائے جاتے ہیں کہ مجرم جیل سے فارغ ہونے کے بعد معاشرے میں معمول کی زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ انہیں قالین' دریاں' فرنیچر' ریڈیو' ٹی وی اور دیگر مصنوعات تیار کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

جیل کا نظام بہتر بنانے کے لیے تجاویز

1- جیلوں میں قیدیوں کی تعداد موجودہ گنجائش سے بہت زیادہ ہے۔ عموماً" چار سے پانچ گنا زیادہ قیدی ہر جیل میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال متعدد مسائل کو جنم دے رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ جیلوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

2- حوالاتیوں کے مقدمات جلد طے نہیں ہو پاتے جس سے جیلوں میں افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جلد فیصلوں کا نظام عدالتوں میں رائج ہو جائے تو بہت سی مشکلات دور کی جا سکتی ہیں۔

3- جیلوں میں منشیات کے عادی افراد کو باقی قیدیوں سے الگ رکھا جانا ضروری ہے۔ ان کے لیے الگ جیلوں کا بندوبست ہو تاکہ نشہ کی عادت کے پھیلاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔

4- مجرموں کی درجہ بندی ہونی چاہیے عادی مجرموں اور نئے یا پہلی بار جرم کرنے والے افراد کو الگ الگ رکھا جائے تو نتائج صحت مند ہو سکتے ہیں۔ عادی مجرموں کے ہمراہ رہنے والے غیرعادی مجرم غلط رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ مجرموں کو جرم' نفسیات اور رویوں کی بنیاد پر الگ الگ رکھنا ضروری ہے۔

5- دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کاشتکاری پیشہ سے منسلک افراد سے صرف کاشتکاری کا کام لیا جائے۔ دیگر کام کرنے سے وہ نفسیاتی طور پر اجتناب کرتے ہیں اور اسے حکم عدولی سمجھتے ہوئے انہیں مزید سزاؤں کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے جس سے ماحول منفی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

6- جیلوں میں صحت مند سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ کھیلوں اور پڑھائی میں دلچسپی رکھنے والے قیدیوں کو مواقع میسر آئیں تو جیل میں نظم و ضبط کی بہتر شکل ابھرتی ہے۔

7- آزاد جیل کے تصور کو اپنانا چاہیے۔ آج کل پاکستان میں صرف بدین میں آزاد جیل ہے۔ جہاں قیدی دیواروں کے اندر محبوس نہیں کیے جاتے۔ بہتر کردار اور رویوں کا مظاہرہ کرنے والے اور سزا کا بیشتر حصہ کاٹ لینے والے مجرموں کو انگلینڈ اور جاپان کی طرح کھلی جیلوں میں رکھ کر بہت سے اخراجات گھٹائے جا سکتے ہیں اور قیدیوں کو نفسیاتی طور پر بہتر ماحول مہیا کیا جا سکتا ہے۔

8- ملاقات کے بارے میں قوانین کو نرم بنانا چاہیے تاکہ قیدی ذہنی طور پر بہتر کیفیت میں اپنے آپ کو محسوس کر سکیں۔ 1932ء تک دو ماہ میں صرف ایک بار ملاقات کی اجازت تھی۔ 1955ء سے پندرہ دنوں تک کی مدت مقرر کی گئی ہے۔ یہ مدت مزید کم ہونی چاہیے۔

9- مجرموں کو سزا دینے کا مقصد محض بدلہ لینا نہیں بلکہ ان کی اصلاح ہونا چاہیے۔ جیلوں میں قیدیوں سے ذلت آمیز سلوک سے پرہیز ضروری ہے۔ ورنہ وہ قانون کا احترام بالکل ترک کر دیتے ہیں۔ مجرموں کے نفسیاتی پہلوؤں پر توجہ کرنے کے لیے ماہرین کی جیلوں میں موجودگی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو سپرنٹنڈنٹ اور دیگر افسران کا چناؤ ماہرین نفسیات میں سے کیا جائے۔

10- جیلوں کو اخراجات کے حوالے سے خودکفیل بنانے کے لیے منصوبہ بندی ہو تو قومی خزانے پر کافی بوجھ کم کیا جا سکتا ہے۔ افرادی قوت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ قیدیوں کو قومی ترقی کے کاموں میں شریک کرنا چاہیے۔ اور خاص طور پر غیر آباد رقبے کو قابل کاشت بنانے کے لیے ان سے کام لینا چاہیے۔ شجرکاری' ڈیری فارمنگ' پولٹری فارمنگ اور پبلک ورکس میں قیدیوں سے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔

11- جیل رولز کو نئے حالات کے مطابق ترتیب دیا جانا ضروری ہے۔ پاکستان میں

1894ء کے ایکٹ کا بیشتر حصہ ابھی تک مستعمل ہے۔

سوالات

1- پنجاب پولیس کی تنظیم اور تربیت کے نظام کی وضاحت کریں۔
2- پولیس کی کارکردگی اور اہمیت پر سیر حاصل تبصرہ کریں۔
3- محکمہ پولیس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز دیں۔
4- پنجاب میں جیلوں کے نظام پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیں۔
5- محکمہ جیل خانہ جات پنجاب کے فرائض اور کارکردگی کا مکمل جائزہ لیں۔
6- جیل نظام کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز پیش کریں۔

باب ہشتم

قومی دفاع اور اس کے ادارے

National Security and Institutions

اپنی سرحدوں اور علاقے کے دفاع کا فریضہ ہر ریاست میں حکومت کے اہم ترین فرائض میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ حکومت پاکستان بھی اپنے اس مقدس فریضے سے بخوبی آشنا ہے اور ریاست کے طول و عرض کے دفاع کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھا رہی ہے۔ جدید دور میں دفاع کے لیے باقاعدہ افواج منظم کی جاتی ہیں۔ اور انہیں جدید ترین اسلحہ سے لیس کیا جاتا ہے۔ پاکستان کو اپنے سالانہ بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاعی مقاصد کے لیے خرچ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہمارا پیارا وطن اپنے قیام کے دور سے آج تک خطرات میں گھرا رہا ہے۔ ہر دور کی وفاقی حکومت نے پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کی جانب پوری توجہ دی ہے۔ افواج کی جدید ترین تربیت کا بندوبست کیا ہے۔ اور انہیں بہترین ہتھیار مہیا کیے ہیں۔ دفاعی مقاصد کے لیے عمدہ منصوبہ بندی کرتے ہوئے بری، بحری اور ہوائی افواج دشمن کے عزائم ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن اقدام اٹھاتی ہے۔ افواج پاکستان کا شمار دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے۔

دفاعی افواج کی اہمیت (Importance)

پاکستان کے وجود کو بھارت کے حکمرانوں نے کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والوں کے دانت کھٹے کرنے کے لیے لازم ہے کہ پاکستان اپنے آپ کو دفاعی اعتبار سے مضبوط بنائے رکھے۔ پاکستان کو مشرقی جانب سے بھارت اور شمال مغربی جانب سے سابقہ سوویت یونین سے خطرات دامن گیر رہے ہیں۔ گرم پانیوں تک پہنچنے کا روسی ارادہ پاکستان کی آزادی اور سالمیت کے لیے ہمیشہ خطرہ رہا ہے۔ اسی لیے پاکستان نے اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ابتدائی ربع صدی میں سیٹو اور سنٹو جیسے دفاعی معاہدوں کا سہارا لیا اور بعد ازاں ایٹمی توانائی کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ روس اور بھارت نے افغانوں کے ذریعے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی غرض

سے پختونستان کے مسئلہ کو ہوا دیے رکھی- بھارت کی عددی قوت اور کئی گنا زیادہ وسائل
کی وجہ سے پاکستان کو اپنے دفاع پر ہر سال کثیر رقم خرچ کرنا پڑتی ہے- قوم اپنی آزادی اور
سلامتی کے لیے زبردست قربانیاں دے رہی ہے- پاکستانی افواج کو 1948ء، 1965ء اور
1971ء میں تین بڑی جنگوں کے علاوہ چھوٹی موٹی کئی جھڑپوں کا سامنا رہا- 1948ء کی جنگ
کشمیر تک محدود رہی 1965ء میں بھارتی عزائم کو ناکام بنا دیا گیا اور 1971ء کی جنگ میں بے
حد نامساعد حالات، بین الاقوامی سازش اور محدود وسائل کے باوجود پاک افواج اپنا کردار
اچھی طرح نبھا رہی تھی کہ نا اہل قیادت شکست کا باعث بن گئی- اگر 1971ء کی جنگ کو صحیح
منصوبے کے ساتھ لڑا جاتا تو ایک نئی تاریخ جنم لیتی- حکومت سفارتی سطح پر ناکام ہوئی اور
1971ء کی جنگ میں ہماری افواج کو زبردست صلاحیتوں کے باوجود ناکامی کا سامنا کرنا پڑا-
آج کے دور کا تقاضا ہے کہ حکومت اور عوام باہمی تعاون سے دفاعی طور پر ملک کو مضبوط
بنائیں- افواج کے لیے موزوں ترین اسلحہ کا بندوبست ہو اور جوانوں کی تربیت اعلیٰ خطوط پر
کی جائے- عوام کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ افواج کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے منظم
ہوں، شہری دفاع کے اصولوں سے آشنائی حاصل کریں اور ضرورت پڑے تو دشمن کے
خلاف اپنی مسلح افواج کے شانہ بشانہ حصہ لینے کے قابل بنیں-

پاکستان جغرافیائی اور فوجی اعتبار سے ایک بے حد حساس خطے میں واقع ہے- چین،
روس اور بھارت جیسے بڑے پڑوسی اور تیل سے مالا مال عرب ریاستوں کے قریب ہونے کی
وجہ سے پاکستان کی بے پناہ اہمیت ہے- اسی اہمیت کا تقاضا ہے کہ پاکستان کی افواج مضبوط
اور پوری طرح تربیت یافتہ ہوں- افواج پاکستان ملکی دفاع کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ
ساتھ دوران امن بھی نمایاں خدمات ادا کرتی ہیں- سیلاب اور قدرتی آفات سے شہریوں کو
بچاتی ہے نیز داخلی امن و امان کے قیام میں سول انتظامیہ سے تعاون کرتی ہے-

دفاعی افواج کی تنظیم (Structure/Organization)

پاکستان کی تینوں مسلح افواج یعنی بری، بحری اور ہوائی افواج کا سپریم کمانڈر صدر
پاکستان ہے جس کی معاونت کے لیے دستور پاکستان کے تحت جائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی
تشکیل دی گئی ہے- جو چیرمین کے علاوہ چیف آف آرمی سٹاف، چیف آف نیول سٹاف اور
چیف آف ائیر سٹاف پر مشتمل ہے- کمیٹی کے ارکان کا چناؤ اور ان کی تنخواہوں اور الاؤنس
کا تعین صدر مملکت کرتا ہے- دفاعی نوعیت کے تمام فیصلے اور حکمت عملی کمیٹی ترتیب دیتی

ہے۔ چیرمین تینوں میں سے کسی بھی فوج سے لیا جا سکتا ہے۔ مدت کار تین سال رکھی گئی ہے۔ اس کمیٹی کا وفاقی حکومت سے مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ وزارت دفاع کا سیکرٹری کمیٹی کا اجلاسوں میں شریک ہوتا ہے۔ اور کمیٹی کی سفارشات وفاقی حکومت تک پہنچاتا ہے۔

پاکستان کی دفاعی افواج کو جدید ترین خطوط پر منظم کیا گیا ہے ان کی تربیت کا مثالی نظام ہے اور انہیں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے قابل اعتماد انداز میں مسلح کیا گیا ہے۔ پاکستان وجود میں آیا تو بھارت نے پاکستان کے حصے کا فوجی ساز و سامان ہڑپ کر لیا۔ ملک میں ایک بھی اسلحہ ساز فیکٹری نہیں تھی۔ تربیتی مراکز نہ تھے اور سامان حرب نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے برعکس بھارتی علاقے میں 1947ء میں 17 اسلحہ ساز فیکٹریاں باقاعدہ کام کر رہی تھیں۔ بھارت کے مکروہ عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے افواج کی تنظیم نو کی گئی۔ امریکہ سے دفاعی معاہدے ہوئے اور عصری تقاضوں کے مطابق جدید اسلحہ سے افواج کو لیس کیا گیا۔ تینوں افواج کے لیے تربیتی ادارے قائم کیے گئے۔ آج پاکستان میں افواج کی ایک مضبوط اور قابل اعتماد تنظیم عمل میں آ چکی ہے۔ تربیتی اداروں کا جال بچھا دیا گیا ہے اور ہماری افواج اب کسی اعتبار سے بھی کسی سے کم نہیں۔ مختلف جنگوں میں افواج پاکستان نے اپنی عسکری قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ 1948ء میں واہ کے مقام پر ایک بہت بڑی اسلحہ ساز فیکٹری بنائی گئی۔ بعد ازاں حویلیاں میں بھی ایک اور فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

ذیل میں ہم تینوں افواج کی تنظیم اور تربیتی مراکز کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

بری افواج

پاکستان کی بری افواج کا جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں ہے۔ برطانوی دور کے فوجی ڈھانچے کو ضرورت کے مطابق بدلا گیا۔ افواج کی نقل و حرکت کو تیز تر کرنے کے لیے اقدام اٹھائے گئے۔ تربیتی مراکز ترتیب دیے گئے اور پاکستان کے طول و عرض میں چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ فوجی رجمنٹوں کی ترتیب نو کی گئی اور پانچ رجمنٹوں کے اپنے الگ الگ مراکز قائم کیے گئے۔

1- فرنٹیر فورس..... مرکز ایبٹ آباد
2- پنجاب رجمنٹ..... مرکز مردان
3- سندھ رجمنٹ..... مرکز حیدر آباد
4- بلوچ رجمنٹ..... مرکز ایبٹ آباد
5- آزاد کشمیر رجمنٹ..... مرکز مانسہرہ (اٹک)

بری افواج کو بنیادی طور پر دو حصوں میں منظم کیا گیا ہے۔ 1- انٹر سروسز، 2- لڑاکا

دستے

1- انٹر سروسز: سروسز میں آرڈیننس‘ میڈیکل کور‘ الیکٹریکل و مکینیکل کور‘ ایجوکیشن کور‘ ملٹری پولیس اور سپلائی کور وغیرہ شامل ہیں۔ سروسز سے تعلق رکھنے والے یہ ادارے جنگ میں براہ راست شرکت نہیں کرتے۔ یہ افواج کو ضروریات جنگ اسلحہ‘ وردی اور خورد و نوش کی اشیا بہم پہنچاتے ہیں نیز ان کے لیے صحت اور تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں۔

2- لڑاکا دستے: انہیں آرمز کہا جاتا ہے۔ یہ براہ راست جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔ توپ خانہ‘ پیدل فوج اور بکتر بند دستے دشمن سے نبرد آزما ہوتے ہیں‘ سگنلز اور انجینئرز کے دستے لڑاکا دستوں کی معاونت کرتے ہیں اور میدان جنگ میں ان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

فوج کی تشکیل

پاکستان میں بری افواج کو کور‘ ڈویژن‘ بریگیڈ‘ بٹالین کمپنی‘ پلاٹون اور سیکشن میں بانٹا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل کور کی سربراہی کرتا ہے۔ کور تین ڈویژنوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر ڈویژن کا سربراہ میجر جنرل کہلاتا ہے۔ ہر کور کا اپنا ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے۔ بریگیڈ کی کمان بریگیڈیئر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ایک بریگیڈ تین بٹالین پر مشتمل ہوتا ہے۔ بٹالین کی کمان کرنل کرتا ہے۔ ہر بٹالین میں ٹینک‘ بکتر بند دستے‘ انجینئرز‘ توپ خانہ اور انفنٹری یعنی پیدل فوج شامل ہوتی ہے۔ بٹالین کو کمپنیوں‘ کمپنی کو پلاٹونوں اور پلاٹون کو سیکشنوں میں مزید تقسیم کیا گیا ہے۔ بری افواج کے عہدے درج ذیل ہیں۔

سپاہی‘ لانس نائیک‘ حوالدار‘ نائب صوبیدار‘ صوبیدار میجر‘ سیکنڈ لیفٹننٹ‘ لیفٹیننٹ‘ کیپٹن‘ میجر‘ لیفٹننٹ کرنل‘ کرنل بریگیڈیئر‘ میجر جنرل‘ لیفٹننٹ جنرل‘ جنرل اور فیلڈ مارشل۔

بری فوج کے تربیتی ادارے

پاکستان کو اپنی افواج کی تربیت کی طرف بہت زیادہ توجہ دینا پڑ رہی ہے۔ کیونکہ اسے کئی گنا بڑے دشمن سے مقابلہ کرنا ہے۔ تعداد اور وسائل کی کمی کو تربیتی معیار کے ذریعے پورا کیا گیا ہے۔ پاکستان جس خطے میں واقع ہے اسے جنگ جوؤں کی سرزمین سمجھا جاتا ہے۔ دونوں عالمی جنگوں میں اس خطے کے مسلمانوں نے شجاعت کے عظیم کارنامے انجام دیے تھے۔ اس سرزمین کے بہادر اور دلیر سپوتوں کو بہترین تربیت دے کر ناقابل شکست بنا دیا گیا

ب- حکومت پاکستان نے نوجوانوں کی تربیت کے لیے درج ذیل ادارے قائم کیے ہوئے ہیں-

1- **کیڈٹ کالجز:** سرائے عالمگیر' پٹارو' رزمک' کوہاٹ' حسن ابدال' لاڑکانہ اور ڈیرہ غازی خان میں کیڈٹ کالجز ہیں جہاں روایتی تعلیم کے علاوہ فوجی تربیت بھی دی جاتی ہے- ان کالجوں کے پڑھے ہوئے زیادہ تر طلبہ افواج پاکستان میں کمیشن حاصل کرتے ہیں- یوں کیڈٹ کالج دفاعی افواج کے لیے نرسری کا کام کر رہے ہیں-

2- **این سی سی:** عام کالجوں میں اعلیٰ ثانوی درجہ کے طلبہ و طالبات کو ملٹری ٹریننگ دینے کا اہتمام نیشنل کیڈٹ کور' کے نام سے قائم ہونے والی تنظیم کے تحت کیا گیا ہے- اگر وطن کو بیرونی حملے کا خدشہ ہو تو این سی سی' کے تحت تربیت یافتہ نوجوان افواج پاکستان میں شامل ہونے کے قابل بنتے ہیں-

3- **انفنٹری سکول کوئٹہ:** انفنٹری یعنی پیادہ فوج میں بھرتی ہونے والے فوجی افسروں کی مزید تربیت کے لیے انفنٹری سکول کوئٹہ میں کورسز کرائے جاتے ہیں- اس سکول میں روایتی ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دی جاتی ہے-

4- **محکمانہ تربیتی ادارے:** ہر شعبہ سے منسلک فوجیوں کی تربیت کے لیے محکمانہ کورسز کا اہتمام کیا جاتا ہے- ان کورسز کے علاوہ سالانہ اور ششماہی جنگی مشقوں کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے- مشقیں پہاڑوں' ریگستانوں اور دریاؤں میں کرائی جاتی ہیں تاکہ فوجی ہر قسم کی جنگ کے لیے تیار کیے جاسکیں- افسروں کی ترقی کا دارومدار کورسز اور مشقوں میں ان کی کارکردگی پر ہوتا ہے-

5- **پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول:** بری افواج میں کمیشن حاصل کرنے کے خواہش نوجوانوں کا چناؤ انٹر سروسز سلیکشن بورڈ (آئی ایس ایس بی) کرتا ہے- بورڈ کی شاخیں کوہاٹ اور گوجرانوالہ میں قائم ہیں- چناؤ کے بعد کیڈٹوں کو ملٹری اکیڈمی کاکول میں کورس مکمل کرنا پڑتا ہے- یہ اکیڈمی 1948ء میں ایبٹ آباد کے قریب قائم کی گئی- اکیڈمی کا دو سالہ کورس برطانوی سینڈ ہرسٹ اکیڈمی کے انداز میں ترتیب دیا گیا- اکیڈمی میں فوجی تربیت کے علاوہ روایتی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹوں کو بی-اے یا بی-ایس-سی کی ڈگریاں ملتی ہیں-

6- سٹاف کالج کوئٹہ : بری افواج کے منتخب اور زیادہ باصلاحیت افسروں کی اعلیٰ تربیت سٹاف کالج کوئٹہ میں کی جاتی ہے- اس کالج کے تعلیمی و تربیتی معیار کا موازنہ کسی بھی دوسرے ملک کے اعلیٰ تربیتی ادارے سے کیا جا سکتا ہے- دوست ممالک کے فوجی افسروں کو بھی سٹاف کالج میں تربیت کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں- فوج میں بڑے عہدوں پر ترقی کے لیے سٹاف کالج سے فارغ التحصیل ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے-

7- نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی : یہ فوجی تربیت کا سب سے اہم ادارہ ہے جسے 1970ء میں قائم کیا گیا- کالج کا الحاق قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ہے- اور یہاں سے کامیاب ہونے والے افسروں کو ایم-ایس-سی کی ڈگری دی جاتی ہے- کالج میں پیشہ وارانہ نوعیت کے دو کورس کروائے جاتے ہیں- نیشنل ڈیفنس کورس میں کامیاب ہونے والے افسروں کو ایم-ایس-سی ڈیفنس سٹرٹیجک سٹڈیز اور آرمڈ فورسز (Armed forces) کورس مکمل کرنے والے افسروں کو ایم-ایس-سی وار سٹڈیز کی ڈگریاں دی جاتی ہیں- غیر ملکی اعلیٰ فوجی افسروں کو بھی نیشنل ڈیفنس کالج میں تعلیم و تربیت مہیا کی جاتی ہے-

اعلیٰ فوجی افسروں کو برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں مختلف کورسز کے لیے بھیجا جاتا ہے-

فضائی افواج

پاکستان کی فضائیہ کا ہیڈکوارٹرز چکلالہ میں بنایا گیا ہے- پاکستان وجود میں آیا تو فضائیہ نہ ہونے کے برابر تھی- حکومت پاکستان نے مضبوط فضائیہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس جانب پوری توجہ دی اور پاک فضائیہ کو جدید ترین شکل دے دی- آج پاکستان کے پاس مگ، میراج، سیبر، ایف 104 اور ایف 16 طیارے موجود ہیں- اواکس بھی خریدے جا رہے ہیں- پشاور، سرگودھا، ماڑی پور کراچی، رسالپور، سکیسر، شورکوٹ اور کامرہ میں فضائیہ کے بڑے مراکز ہیں- پاک فضائیہ دشمن کے ٹھکانوں پر حملے کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بحری اور بری افواج کی بھی مدد کرتی ہے- پاک فضائیہ کی پیشہ ورانہ مہارت مسلمہ ہے اور جنگوں میں اس کی کارکردگی بہت عمدہ رہی ہے- فضائیہ سے تعلق رکھنے والے افسروں، راشد منہاس شہید، رفیقی شہید اور یونس شہید نے اپنے خون سے بہادری کی نہ بھولنے والی تاریخ رقم کی ہے- بھارت کے مقابلے میں عددی قوت اور اسلحہ کی کمی کے باوجود مجاہدوں

نے اعلیٰ تربیت اور اسلامی جذبے سے کام لیتے ہوئے ناقابل یقین کارنامے انجام دیے ہیں۔

فضائیہ کی تشکیل : فضائیہ کے سربراہ کو چیف آف ایئر سٹاف کہا جاتا ہے۔ ایئر ہیڈ کوارٹرز میں سربراہ کی معاونت درج ذیل آفیسرز کرتے ہیں۔

☆ ڈپٹی چیف آف ایئر سٹاف، ☆ اسسٹنٹ چیف آف ایئر سٹاف (آپریشن)

☆ اسسٹنٹ چیف آف ایئر سٹاف (ٹریننگ)، ☆ اسسٹنٹ چیف آف ایئر سٹاف (ایڈمنسٹریشن)

☆ اسسٹنٹ چیف آف ایئر سٹاف (مینٹی نینس)

پاک فضائیہ کے عام سپاہی کو ایئرمین کہا جاتا ہے۔ جو ترقی کر کے کارپول اور سارجنٹ بنتا ہے۔

اعلیٰ عہدے درج ذیل ہیں۔

پائیلٹ آفیسر، فلائنگ آفیسر، فلائیٹ لیفٹیننٹ، سکواڈرن لیڈر، ونگ کمانڈر، گروپ کیپٹن، ایئر کموڈور، ایئر وائس مارشل، ایئر مارشل، مارشل آف دی ایئر فورس

ہر ایئر بیس پر ایک سٹیشن فلائنگ ونگ ہوتا ہے۔ ونگ کا سربراہ ونگ کمانڈر کہلاتا ہے۔ ونگ میں کئی سکواڈرن ہوتے ہیں۔ ہر سکواڈرن کم از کم چھ طیاروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کی قیادت سکواڈرن لیڈر کرتا ہے۔ بنیادی یونٹ سکواڈرن ہی ہوتا ہے۔ فلائنگ اور ٹیکنیکل سکواڈرن الگ الگ ہوتے ہیں۔

فضائیہ کے تربیتی ادارے

1- ابتدائی تربیتی ادارے : پی اے ایف کالج سرگودھا، پی اے ایف سکول سرگودھا اور پبلک سکول لوئر ٹوپہ مری ابتدائی تربیت دینے والے ادارے ہیں جہاں نو عمر لڑکوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ روایتی تعلیم کے علاوہ فضائیہ کے بارے میں بھی بنیادی تربیت کا بندوبست ہوتا ہے۔ ان اداروں سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو عموماً" ایئر فورس میں بطور کیڈٹ چن لیا جاتا ہے۔

2- پری کیڈٹ سکول : پبلک سکولز کی طرز پر قائم یہ ادارے فضائی تربیت کے لیے بنائے گئے ہیں۔ طلبہ کو ہوا بازی کی ابتدائی تربیت دی جاتی ہے۔ سکولوں میں فضائیہ کے بارے میں خصوصی کورسز کروائے جاتے ہیں۔

3- فضائی انسٹرکٹروں کے سکول: فضائیہ کے افسروں کو فضائی اور تیکنیکی تربیت دینے کے لیے ماہرین تیار کیے جاتے ہیں- ایسے انسٹرکٹروں کی تربیت کے لیے سکول بنائے گئے ہیں- تربیت یافتہ ماہرین افسروں کو کورسز کرواتے ہیں- یہ ماہرین فلائنگ کے علاوہ جہازوں کی مشینری کے بارے میں بھی علم رکھتے ہیں اور فنی تربیت بھی دیتے ہیں-

4- پی اے ایف سکول کوہاٹ: اس ادارے میں فضائیہ کے نوجوانوں کو طیاروں کی مرمت اور دیکھ بھال کا ہنر سکھایا جاتا ہے- تمام تیکنیکی سٹاف اسی سکول میں تعلیم حاصل کرتا ہے-

5- پی اے ایف اکیڈمی رسالپور: ائیر فورس میں کمیشن حاصل کرنے والے کیڈٹوں کو تربیت دینے کے لیے یہ اکیڈمی قائم ہے- اکیڈمی میں روایتی تعلیم کے علاوہ ائیر فورس کے ہر شعبے کے بارے میں علم سکھایا جاتا ہے- ہوا بازوں کی تیاری کا یہ عظیم ادارہ ایشیا بھر میں اپنی مثال آپ ہے- دوست ممالک کے کیڈٹوں کو بھی اکیڈمی میں تربیت دی جاتی ہے-

6- سٹاف کالج کراچی: بری افواج کے لیے کوئٹہ میں سٹاف کالج بنایا گیا- کراچی کا سٹاف کالج اسی انداز میں فضائیہ کے افسروں کی تربیت کے لیے سٹاف کالج میں بھیجا جاتا ہے- اعلیٰ ترین عہدوں کے لیے وہی افسر موزوں سمجھے جاتے ہیں جو سٹاف کالج سے فارق التحصیل ہو چکے ہوں- کالج میں امریکہ' برطانیہ اور دوسرے بڑے ممالک سے ماہرین کو لیکچرز دینے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے- مذاکرے سمپوزیم اور سیمینار کروائے جاتے ہیں- سٹاف کالج میں کامیاب کورس کے بعد افسروں کو غیر ممالک میں بھی مزید تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے- پاک فضائیہ کے افسروں کو دوسرے ممالک کے افسروں کے ساتھ مشترکہ مشقوں میں حصہ لینے کے مواقع بھی فراہم کیے جاتے ہیں-

بحری افواج

پاک بحریہ کا وجود 1947ء میں نہ ہونے کے برابر تھا- کوئی تنظیم تھی نہ کوئی تربیتی ادارہ' صرف تیں افسروں نے پاک بحریہ میں شرکت کی تھی- محدود وسائل' گودیاں عدم موجود اور افرادی قوت بہت محدود تھی' پاکستان کی جغرافیائی صورتحال کا تقاضا تھا کہ مضبوط بحریہ کی تنظیم کی جاتی- پاکستان کے دو حصے ایک دوسرے سے سینکڑوں کلومیٹر دور تھے اور

درمیان میں بھارت کا علاقہ تھا۔ جس کے پاس شروع سے ہی بحری قوت موجود تھی۔ حکومت پاکستان نے دفاعی ضروریات محسوس کرتے ہوئے تباہ کن جہاز خریدے' علاقائی سمندروں کی دیکھ بھال کے لیے خاص ہوائی جہاز حاصل کیے' آبدوزیں خریدیں اور جہازوں کی مرمت کے لیے ورکشاپیں قائم کیں۔ بحریہ کے جوانوں اور افسروں کی تربیت کا ایک مربوط نظام بنایا گیا اور جہازوں کو ساحل تک لانے کے لیے گودیوں کا بندوبست بھی ہوا۔ امریکہ سے دفاعی معاہدوں پر دستخط ہوئے تو بحریہ کو جدید ترین بنانے کے لیے کافی مدد ملی۔ افسروں کو ترقی یافتہ ممالک میں تربیتی کورسز کے لیے بھیجا گیا اور مغربی حلیفوں کے ساتھ مشترکہ بحری مشقیں بھی کی گئی۔ اس طرح بتدریج بحریہ کو جدید اسلحہ سے لیس کیا جانے لگا۔

بحریہ کی تشکیل: پاک بحری کا ہیڈکوارٹر کراچی میں ہے۔ بحریہ کے سربراہ کو چیف آف نیول سٹاف کہتے ہیں۔ جس کا تقرر صدر پاکستان کرتا ہے۔ بحری فوج کے سپاہی کو Rating پکارا جاتا ہے۔ اعلیٰ کمیشنڈ آفیسرز کے عہدے درج ذیل ہیں۔ ایکٹنگ سب لیفٹنٹ' سب لیفٹنٹ' لیفٹنٹ کمانڈر' کمانڈر' کیپٹن' کموڈور' وائس ایڈمرل' ریئر ایڈمرل' ایڈمرل' ایڈمرل آف دی فلیٹ (Fleat)۔

پاک بحریہ کے مشہور جہاز یہ ہیں۔ ٹیپو' طغرل' جہانگیر' خیبر' ذوالفقار' بابر اور عالمگیر۔

بحریہ کے تربیتی ادارے

1- پی این ایس ہمالیہ: یہ تربیتی مرکز جوانوں کو بحری امور کی تربیت کے لیے بنایا گیا۔ یہاں آبدوزوں' تارپیڈو' مواصلات' توپ خانے اور بحرپیمائی جیسے امور کے بارے میں تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمالیہ کی تربیت گاہ میں دوست ممالک کے افسر اور نوجوان بھی تربیت پاتے ہیں۔

2- پی این ایس بہادر: بحریہ میں شرکت کے خواہش مند نوجوانوں کو پی این ایس بہادر نامی تربیت گاہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ بعدازاں انٹر سروسز سلیکشن بورڈ ان کا امتحان لیتا ہے اور موزوں امیدواروں کو بحریہ میں کمیشن دیا جاتا ہے۔ "بہادر" میں کیڈٹ کالجوں کی طرح روایتی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اور بحری جنگ کے بنیادی اصول بھی بتائے جاتے ہیں۔

3- پی این ایس شمشیر: بحریہ میں کمیشن پانے والے افسروں کو شمشیر میں اعلیٰ تربیت دی جاتی ہے افسروں کو بحریہ کے تمام شعبوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ پی این ایس شمشیر

میں بنیادی طور پر انتظامی امور کے بارے میں افسروں کو پڑھایا جاتا ہے۔ بنیادی امور سے آگاہ ہونے کے بعد افسروں کو دوسرے شعبوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

4- **پی این ایس بابو :** آبدوزوں، تارپیڈو اور بحری جنگ کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے لیے بحریہ کے افسروں کو پی این ایس بابو میں تعینات کیا جاتا ہے۔ پی این ایس بابو میں ٹریننگ حاصل کرنے والے افسروں کو دوسرے ممالک کے افسروں کے ہمراہ مشترکہ مشقوں میں شریک کیا جاتا ہے۔

5- **پی این ایس کارساز :** کارساز کا تعلق شعبہ انجینئرنگ سے ہے۔ پی این ایس کارساز میں انجینئرز اور دیگر فنی ماہرین کو پڑھایا جاتا ہے۔ اس ادارے میں جہاز سازی، جہاز کی مرمت اور بحریہ سے متعلق مشینوں کے استعمال کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ 1952ء میں قائم ہونے والا یہ ادارہ اب کافی ترقی کر گیا ہے۔

مندرجہ بالا تربیتی اداروں کے علاوہ درج ذیل ادارے بھی تربیتی فرائض ادا کرتے ہیں۔

پی این ایس مددگار، پی این ایس جوہر، پی این ایس اٹک

دفاعی افواج کے فرائض اور کارکردگی

Functions and Performances of Armed Forces of Pakistan

مسلح افواج کی بنیادی ذمہ داری وطن کا دفاع ہے۔ اس کے علاوہ وہ داخلی امن و امان میں سول انتظامیہ سے تعاون کرتی ہیں اور اگر قوم کو ارضی و سماوی آفات کا سامنا ہو تو یہ میدان عمل میں نکل آتی ہیں۔ 1947ء سے افواج نے مختلف شعبوں میں قوم کے لیے خدمات انجام دی ہیں۔

1- **دفاعی ذمہ داریاں :** دفاعی افواج نے پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تین بڑی جنگیں لڑی ہیں اور چھوٹی بڑی کئی جھڑپوں میں حصہ لیا ہے۔ 1948ء میں ریاست جموں و کشمیر میں بھارتی افواج کی آمد پر افواج پاکستان نے حریت پسند کشمیریوں کی مدد کی اور کشمیر کا ایک حصہ آزاد کرا لیا۔ بھارتی افواج دباؤ میں آگئیں تو بھارتی حکومت نے اقوام متحدہ کو پکارا۔ اقوام متحدہ نے کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت کرتے ہوئے استصواب رائے

کرانے کے لیے قرار داد منظور کی تو جنگ بند ہو گئی۔ افواج پاکستان کو یقیناً" 1948ء کی جنگ میں برتری حاصل رہی۔ 1965ء میں مسئلہ کشمیر پر ایک اور بڑی جنگ سترہ دنوں تک لڑی گئی۔ مسلح افواج نے نہ صرف کامیابی سے اپنے علاقوں کا دفاع کیا بلکہ کشمیر میں اہم علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پنجاب اور سندھ کی سرحدوں پر بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ تعداد اور اسلحہ کی کمی کے باوجود پاکستانی جوانوں کی کارکردگی بہتر رہی۔ 1971ء میں تیسری جنگ میں پاکستان اور بھارت ایک بار پھر آمنے سامنے ہوئے۔ پاکستانی افواج مشرقی پاکستان کا دفاع کرتی رہیں لیکن مقامی آبادی کی مخالفت، کمزور قومی قیادت اور بین الاقوامی سطح پر ڈپلومیٹک ناکامیوں کی وجہ سے افواج پر شدید دباؤ پڑا اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ماہرین متفق ہیں کہ 1971ء کی شکست سفارتی کمزوریوں کی وجہ سے ہوئی۔ پاکستان قریب قریب تنہا رہ گیا اور بالخصوص بڑی قوتوں نے پاکستان کا ساتھ نہ دیا۔ بھارتی پراپیگنڈے نے کام کر دکھایا اور تاریخ میں ایک سیاہ باب رقم ہوا۔ تین بڑی جنگوں کے علاوہ افواج پاکستان کو رن کچھ، بیروباڑی یونین سمیت کئی جھڑپوں میں حصہ لینا پڑا اور نتائج پاکستان کے حق میں نکلتے رہے۔ سیاچین گلیشیر پر افواج پاکستان کئی سال سے بھارتی افواج سے نبرد آزما ہے۔ سخت نامساعد حالات کے باوجود بھارت کی شدید مزاحمت کر رہی ہیں۔

2۔ **اقوام متحدہ سے تعاون:** دنیا کے مختلف خطوں میں امن کے قیام کے لیے پاکستان دستوں کو اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے فرائض ادا کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ دستوں نے عمدگی سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ انڈونیشیا، کانگو، قبرص اور صومالیہ میں پاکستانی دستوں کی کارکردگی کو عالمی سطح پر سراہا گیا۔ بوسینیا اور دیگر علاقوں میں فوجی دستے بھیجنے کی پیش کش حکومت پاکستان کی طرف سے کی گئی۔ عالمی امن کے لیے اقوام متحدہ سے مکمل تعاون پاکستان کی پالیسی ہے۔

3۔ **سول انتظامیہ کی امداد:** افواج نے عام شہری زندگی میں بدنظمی اور لاقانونیت پر قابو پانے کے لیے متعدد بار موثر کردار ادا کیا ہے۔ ملک کے اندر لسانی، قبائلی اور مذہبی بنیادوں پر اختلاف رائے نے بے چینی کی صورت اختیار کی تو افواج کی خدمات حاصل کی گئیں۔

1۔ 1947ء میں مسلمانوں کو محفوظ مقامات تک پہنچایا اور فسادات کے دوران نقل مکانی میں مدد دی۔

2۔ 1952ء میں لسانی مسئلہ مشرقی حصے میں ابھرا تو شرپسندوں نے قومی املاک کو نقصان پہنچانا چاہا۔ افواج نے سول انتظامیہ کی مدد کرتے ہوئے حالات پر قابو پا لیا۔

3- 1953ء میں تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا۔ پنجاب میں فسادات پھیل گئے تو افواج کو بلایا گیا۔ سول انتظامیہ سے تعاون کرتے ہوئے فوج نے امن و امان بحال کر دیا۔

4- 1954ء میں آدم جی جیوٹ ملز میں بنگالی اور بہاری عوام کے درمیان فسادات ہو گئے تو بھی فوج نے حالات کو کنٹرول کیا۔

5- سندھ اور بلوچستان میں حالات کو معمول پر لانے کے لیے فوج نے سول انتظامیہ کی مدد کی۔ کراچی' حیدر آباد اور اندرون سندھ میں جب انتشار اور بدنظمی کی کیفیت پیدا ہوئی تو فوج نے حکومت کے ایما پر مناسب اقدام اٹھائے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے میں مدد دی۔

4- افواج پاکستان اور سیاست: 1958ء' 1969ء اور 1977ء میں افواج پاکستان نے مارشل لا نافذ کرتے ہوئے ملک کا انتظامی کنٹرول براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دستور پاکستان کو پہلے دو مواقع پر منسوخ اور 1977ء میں معطل کر دیا گیا۔ افواج کا سیاست میں براہ راست عمل دخل اچھا ثابت نہ ہوا۔ ہر بار جمہوریت کو بحال کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مارشل لا کے نفاذ نے فوج کی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو بھی متاثر کیا۔ اگرچہ ہر فوجی حکومت کے ابتدائی دور میں بظاہر امن و امان بھی رہا اور حالات بھی بہتر ہوئے لیکن انجام تینوں بار حوصلہ شکن تھا۔ پاکستان کی مسلح افواج ایک مضبوط' مربوط اور منظم ادارہ ہے۔ یہ ادارہ اپنی اعلیٰ قدروں کی وجہ سے اپنی پہچان رکھتا ہے۔ اسے سول سے الگ رہتے ہوئے اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں پر تمام تر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

5- قدرتی آفات اور افواج کا کردار: پاکستان میں بڑے بڑے سیلاب آتے رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے عام انسانی زندگی بری طرح متاثر ہوتی رہی ہے۔ املاک فصلوں' مویشیوں کو نقصان پہنچا اور انسانی جانیں بھی ضائع ہوئیں' مشرقی و مغربی دونوں حصوں میں افواج نے سیلاب اور طوفان کے ہاتھوں تباہی سے بڑی حد تک قوم کو بچایا۔ افواج نے سیلاب میں گھرے ہوئے عوام کی مدد کی اور انہیں محفوظ علاقوں میں پہنچایا۔ خوراک' کپڑے اور دیگر ضروریات بہم پہنچائیں۔ بری' بحری اور ہوائی تینوں افواج نے عوام کی بھرپور امداد کی۔ سیلاب' زلزلہ' حادثات' سخت بارشیں' ٹڈی دل اور وبائیں قوم کے لیے جب کبھی چیلنج بنیں تو افواج نے قابل تحسین کام کیے۔

6- تعلیمی سرگرمیاں: تعلیمی شعبہ عمومی طور پر سول انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہے تاہم

فوج بھی اس سلسلے میں قومی خدمات بنا رہی ہے۔ فوج کی نگرانی میں کئی کیڈٹ کالج، اپرنٹس سکولز اور ٹریننگ اکیڈیمیز کام کر رہی ہیں۔ راولپنڈی میں آرمی میڈیکل کالج ہر سال ڈاکٹروں کی کھیپ تیار کر رہا ہے۔ آرمی پبلک سکولز اور کالجز کا ایک ملک گیر سلسلہ فوج نے قائم کیا ہوا ہے۔ عام کالجوں میں بھی فوج کے جوان طلبہ اور طالبات کو این سی سی کی تربیت دے رہے ہیں۔

7- **ترقیاتی سرگرمیاں:** پاک فوج کو بعض ترقیاتی منصوبوں پر بھی کام کرنے کا موقع دیا گیا ہے اور اس نے انتہائی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض نبھائے ہیں۔ فوج نے سول انتظامیہ کے شانہ بشانہ قومی ترقی کے لیے کام کیا ہے۔

1- پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں شاہراہوں کی تعمیر صنعتی، تجارتی اور زرعی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے پاک فوج نے متعدد سڑکوں کی تعمیر کا ذمہ لیا۔ قراقرم ہائی وے کی تعمیر میں پاک فوج کے جوانوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ بعض پس ماندہ علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر کر کے انہیں نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں سے ملا دیا۔ شمالی علاقوں، سرحد اور بلوچستان میں اس ضمن میں بڑا کام ہوا ہے اور فوجی انجینئروں نے ایسے علاقوں میں آمدورفت کی جدید سہولتیں فراہم کی ہیں جو پہنچ سے باہر سمجھی جاتی تھیں۔

2- پاک فوج نے ولی تانگی، سرکھولا اور خان پور میں ڈیم بھی تعمیر کیے ہیں یہ ڈیم آبپاشی کے علاوہ بجلی کی پیداوار کا بھی باعث بنے ہیں۔

3- فوج کی فلاح و بہبود کے لیے متعدد منصوبے بنائے گئے ہیں۔ ان منصوبوں کی تکمیل خود فوج ہی کر رہی ہے۔ راولپنڈی ان سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ ہسپتال سکول صنعتی ادارے اور ویلفیئر شاپس بنائی گئی ہیں تاکہ فوجیوں کو بنیادی سہولتیں حاصل ہو سکیں۔

4- شمالی علاقوں میں عوامی بھلائی کے متعدد منصوبوں کو پاک فوج نے مکمل کیا ہے۔ پلوں کی تعمیر کی ہے اور دشوار گزار علاقوں میں رابطہ سڑکیں بنائی ہیں۔

8- **سمگلنگ کی روک تھام:** پاکستان کی سرحدوں سے پڑوسی ممالک میں اشیا کی سمگلنگ سے ملک کو کثیر سرمایہ کا نقصان ہوتا ہے۔ فوج نے سول انتظامیہ کی مدد کرتے ہوئے کئی بار سمگلنگ کے خلاف مہم چلائی۔ 57-1956ء میں مشرقی حصے سے خوراک بھارت کو سمگل ہو رہی تھی تو ایک بھرپور مشن مکمل کیا گیا۔ آپریشن کلوز ڈور Operation Close-door

کے نام سے بارڈر پر خصوصی کنٹرول کیا گیا۔ پنجاب اور سندھ سے اشیا کی سمگلنگ روکنے کے لیے فوج نے خصوصی منصوبہ بندی کی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فوج کو یہ فریضہ امن کے دنوں میں مستقل بنیادوں پر ہی سونپ دیا جائے۔ یاد رہے کہ عام دنوں میں سرحدوں کی نگرانی کرنے والے رینجرز میں پاک فوج کے افسر ہی قیادت کے فرائض ادا کرتے ہیں۔

نیشنل لاجسٹک سیل (N. L. C.)

National Logestic Cell

یہ ادارہ نیم فوجی انداز میں 1978ء میں قائم کیا گیا اور اس کی تنظیم کو پشاور سے کراچی تک پھیلایا گیا۔ ادارے کا ہیڈکوارٹر راولپنڈی میں ہے اور اسے شمالی و جنوبی دو زونوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کوارٹر ماسٹر جنرل ادارے کا سربراہ ہے۔ پاک فوج کے افسروں کی ایک بڑی تعداد کی خدمات اس ادارے کے سپرد کر دی گئیں۔ این ایل سی سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا ایک قابل اعتماد اور تیز رفتار ذریعہ ہے۔ بیرون ملک سے درآمد کی جانے والی اشیا خصوصاً" گندم، چینی اور دیگر خوردنی اشیا کو کراچی، گوادر اور پسنی سے سارے ملک میں این ایل سی کے ٹرالر لے جاتے ہیں۔ برآمدت بھی اندرون ملک سے بندرگاہوں تک پہنچانے کا کام بھی یہ ادارہ کر رہا ہے۔ 1978ء میں این ایل سی کے پاس 900 گاڑیاں تھیں۔ یہ تعداد 1991ء میں 1800 سے بھی تجاوز کر گئی۔ ادارے کے اڈے تمام بڑے شہروں میں موجود ہیں اور اکثر اڈوں پر کمپیوٹر اور فیکس کا جدید ترین نظام قائم ہے۔ چین افغانستان اور وسطی ایشیائی مسلم ریاستوں سے تجارتی تعلقات بڑھانے اور ان کے لیے سامان کی ترسیل کی سہولتیں مہیا کرنے میں یہ ادارہ بہت مفید ثابت ہو گا۔ این-ایل-سی ملک میں سڑکوں کی تعمیر بھی کر رہی ہے۔ لاہور سے راولپنڈی تک جی ٹی روڈ کو دو طرفہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ادارہ کاشتکاروں کو ٹریکٹر اور دوسری مشینیں بھی کرایے پر فراہم کرتا ہے۔ این ایل سی کے اپنے غلہ ذخیرہ کرنے کے لیے گودام ہیں۔ جن میں 12000 ٹن غلہ رکھنے کا انتظام ہے۔ اس ادارے نے کئی شہروں میں اپنے پٹرول پمپ بھی بنائے ہوئے ہیں۔ این ایل سی کی عمدہ کارکردگی اور نفع بخش سرگرمیاں فوج کے عمدہ کنٹرول کا ہی نتیجہ ہیں۔ جنگ کی صورت میں این ایل سی کو مکمل طور پر فوجی ضرورتوں کے لیے ہی استعمال کیا جائے گا اور یہ ادارہ ہتھیاروں و گولا بارود لے جانے کا تیز رفتار اور قابل اعتماد

ذریعہ بنے گا۔

فرنٹیئرورکس آرگنائزیشن (F.W.O)

ادارے کا ہیڈکوارٹر راولپنڈی میں اور اس کا سربراہ چیف انجینئر ہے۔ فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کرتا ہے۔ یہ قراقرم ہائی وے کی ضروری مرمت بھی کر رہا ہے اور وادی کشمیر میں دفاعی ضرورت کی سڑکیں بھی بنا رہا ہے۔ فوج سے ریٹائرڈ ہونے والے افسروں اور شہیدوں کے خاندانوں کے لیے مکانات کی تعمیر کا کام بھی اسی ادارے کے سپرد ہے۔ متعدد ہاؤسنگ سکیمیں اس کی نگرانی میں تکمیل کے مراحل میں ہیں۔

فوجی فاؤنڈیشن

ریٹائرڈ فوجیوں اور شہیدوں کے اہل خاندان کی فلاح و بہبود کے لیے فوجی فاؤنڈیشن کے نام سے ادارہ بنایا گیا ہے یہ سابقہ فوجیوں کو روزگار کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔ انہیں مختلف ہنر سکھانے کا بندوبست بھی کرتا ہے۔ نیز ان کی اولاد کے لیے تعلیمی سہولتوں اور وظائف کی فراہمی کا انتظام بھی اس کے سپرد ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن نے درج ذیل خدمات انجام دی ہیں۔

1. میڈیکل سنٹر قائم کیے ہیں۔ مصنوعی اعضاء کی فراہمی کا انتظام کیا ہے اور معذور و لاچار سابقہ فوجی ملازمین کی رہائش کے لیے بارکیں اور وارڈز تعمیر کیے ہیں۔ راولپنڈی، کلر کہار ضلع خوشاب، لاچی ضلع کوہاٹ مانسہرہ اور بسال ضلع اٹک میں معیاری ہسپتال بنائے ہیں۔
2. متعدد صنعتی ادارے فوجی فاؤنڈیشن کے ماتحت کام کر رہے ہیں مثلاً" فوجی ٹیکسٹائیل ملز جہلم، لائل پور کاٹن ملز فیصل آباد، فوجی کاٹن ملز حسن ابدال، فاؤنڈیشن گیس راولپنڈی، ماڈرن شوگر ملز سانگلہ ہل، فوجی شوگر ملز ٹنڈو محمد خان، فوجی سیریلز راولپنڈی، خیبر ٹوبیکو کمپنی مردان اور فرٹیلائزر پلانٹ ماچھی گوٹھ ضلع رحیم یار خان۔

فوجی فاؤنڈیشن پاک فوج کی نگرانی میں کام کرنے والا ایک ادارہ ہے جو قومی ترقی کے لیے خدمات انجام دے رہا ہے۔

سوالات

1- پاکستان میں دفاعی افواج کی تنظیم پر روشنی ڈالیے۔
2- افواج پاکستان کے فرائض اور کارکردگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3- پاکستان کی بری افواج کے اہم تربیتی مراکز کا تفصیلی ذکر کریں۔
4- پاکستان ایئر فورس اور پاکستان بحریہ کے تربیتی مراکز کا تفصیلی ذکر کریں۔
5- افواج پاکستان کی امن اور جنگ کے دوران خدمات کا جائزہ لیں۔
6- مندرجہ ذیل نوٹ لکھیں۔
ایف ڈبلیو او - فوجی فاؤنڈیشن - نیشنل لاجسٹک سیل - پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول

باب نہم

قومی یکجہتی

National Integration

مفہوم (Meaning): قوم چھوٹے بڑے متعدد گروہوں کے اشتراک سے بنتی ہے۔ ان گروہوں کی تشکیل مذہب، زبان، نسل، ثقافت اور سماجی رشتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہ سارے گروہ اپنے اپنے مخصوص علاقے میں رہائش رکھتے ہیں اور سیاسی پہلو میں باہم تعاون کرتے ہوئے ایک قوم کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ قوم کے افراد میں معاشی اعتبار سے بھی فرق پایا جاتا ہے۔ قوم کے اندر گروہوں کا وجود رنگا رنگی پیدا کرتا ہے تاہم ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ سارے گروہ اپنی اپنی علیحدہ پہچان رکھتے ہوئے قومی سطح پر باہم تعاون کریں اور سیاسی امور میں یکجہتی سے کام کریں۔ وفاقی نظام حکومت ایک قوم میں شامل مختلف علاقوں کے عوام کو اپنے اپنے انداز میں رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور یوں صوبہ وارانہ بنیادوں پر یہ نظام استوار ہوتا ہے۔ ایک مضبوط قوم اسی صورت میں وجود میں آ سکتی ہے جب مختلف صوبوں، مذاہب، طبقوں، ثقافتوں اور نسلوں کے افراد قومی جذبوں سے معمور ہوں۔ ایثار، تعاون اور رواداری جیسے جذبے قومی یکجہتی پیدا کرتے ہیں۔ خیالات و احساسات میں ہم آہنگی ہو اور ہر فرد دوسرے افراد کے لیے اور ہر گروہ دوسرے گروہوں کے لیے قربانی، خلوص اور اشتراک عمل کا جذبہ رکھتا ہو تو قومی تصویر وجود میں آ جاتی ہے اگر طبقے گروہ یا صوبے اعلیٰ جذبوں سے عاری ہوں تو ان پر مشتمل قوم محفوظ مستقبل کی مالک نہیں بن سکتی۔ قومی استحکام کا دار و مدار قومی یکجہتی پر ہوتا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

کوئی قوم دیگر قوموں کی برادری میں اپنا مقام بنانا چاہتی ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر اتحاد اور یکجہتی پیدا کرے۔ قوم کا فکر و عمل، احساسات و خیالات اور نظریات و تعلیمات میں یکجہتی لازم ہے۔ ان اعلیٰ قدروں کی مالک قوم ہی کو دیگر اقوام کی قیادت کا موقع حاصل ہو سکتا ہے۔ یکجہتی کے لیے کام کرنا قوم کے ہر فرد کا اہم فرض ہے۔

قومی یکجہتی اور پاکستان

(National Integration and Pakistan)

قومی یکجہتی کے حوالے سے پاکستان کو کئی مسائل کا سامنا ہے۔ قومی سطح پر مذہبی' لسانی' علاقائی' ثقافتی' سماجی اور سیاسی گروہ بندیاں موجود ہیں۔ قومی یکجہتی کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے سرکاری غیر سرکاری تنظیمیں سیمینار سمپوزیم منعقد کرواتی ہیں۔ دانشور اپنی اپنی آراء پیش کرتے ہیں۔

قومی یکجہتی ہمارے ٹی وی' ریڈیو' اخبارات اور رسائل کا ایک اہم موضوع ہے۔ ماہرین ان رکاوٹوں کی تلاش کرتے ہیں جو قومی یکجہتی کے فروغ کی راہ میں حائل نظر آتی ہیں۔ پاکستان کے عوام مختلف سیاسی جماعتوں' گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہونے کے باوجود اپنے وطن سے محبت کے بے پایاں جذبات بھی رکھتے ہیں۔

عوام کے دلوں میں موجزن جذبوں نے پاکستان کو وجود دیا۔ یہ نظریاتی مملکت جمہوری عمل کی پیداوار ہے اور اس کے عوام میں یکجہتی پیدا کرنے کی فضا موجود ہے۔ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" کے مصداق عوام کو مناسب راہنمائی میسر آ جائے تو ان کے لیے صحیح سمت کا تعین کرنا مشکل نہیں ہے۔ موجودہ صدی کے پہلے نصف میں برصغیر کے مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں جس منزل تک پہنچنا چاہا پہنچ گئے۔ آج بھی مسلمانان پاکستان میں جذبوں کی کمی نہیں ہے' انہیں یکجا کیا جا سکتا ہے۔ بعض خود غرض عناصر نے لسانی' فرقہ وارانہ اور علاقائی بنیادوں کو ہوا دے کر قومی یکجہتی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ انہوں نے قومی سوچ کی جگہ صوبائی' لسانی اور فرقہ وارانہ سوچوں کو ابھارا ہے۔ ایسی ہی سوچیں مشرقی حصے کی علیحدگی کا باعث بنی تھیں۔ ہمارے مشاہدات ہیں کہ مذہبی' علاقائی اور لسانی امتیازت کئی ممالک میں نفاق اور افتراق کا موجب بنے ہیں۔ افغانستان' ایتھوپیا' سری لنکا اور صومالیہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے برعکس کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایسے ممالک ہیں جہاں قومی یکجہتی کی بڑی عمدہ مثالیں دکھائی دے رہی ہیں۔ لسانی' مذہبی اور نسلی اعتبار سے دونوں ممالک میں رنگا رنگی ملتی ہے لیکن اتحاد کی صورت قابل ستائش ہے۔ دونوں ممالک کی عالمی سطح پر قدر و منزلت بھی قابل دید ہے۔

پاکستان میں طبقہ واریت' صوبہ پرستی' فرقہ بندی اور لسانی امتیازات نے قومی ہم آہنگی اور یکجہتی کے تصور کو دھندلا دیا ہے۔ یہ زہر جب پھیل گیا تو مشرقی حصے کی علیحدگی کا سبب بنا۔

قومی یکجہتی مسائل اور تجاویز

(Problems of National Integration and their Solutions)

1- **ترجیحات کا تعین :** افراد قوم کے علاوہ مختلف مذاہب جماعتوں طبقوں اور علاقوں سے بھی وابستہ ہوئے ہیں- اگر ان میں صحیح شعور ہو تو وہ قومی مفادات کو باقی تمام مفادات پر ترجیح دیتے ہیں- بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں جو سیاسی جماعت' فرقے اور لسانی گروہ کی خاطر قومی نقطہ نظر کو نظرانداز کر دیتے ہیں- ان کی غلط ترجیحات مسائل کو جنم دیتی ہیں- نفرتیں' کدورتیں اور تعصبات پھیل کر پورے ماحول کو پراگندہ کر دیتے ہیں اور قومی سوچ دھندلا جاتی ہے- یکجہتی کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو صحیح ترجیحات کا شعور ہو-

2- **جمہوری اداروں کا احترام :** پاکستان میں جمہوری اداروں کو تسلسل کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا- مارشل لا کے بار بار نفاذ نے جمہوری اداروں کو نقصان پہنچایا جمہوریت اور جمہوری اداروں کا قتل قومی یکجہتی کو ختم کرنے کا سبب بنتا ہے- جمہوری اداروں کا مستقل طور پر کام کرتے رہنا عوام میں خوداعتمادی پیدا کرتا ہے- وہ ملکی امور میں براہ راست یا اپنے نمائندوں کے ذریعے شریک ہوتے ہیں- انہیں اپنے نمائندوں پر تنقید کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے- جمہوری فضا قائم نہ رہے تو گھٹن اور حبس کا احساس ہوتا ہے- غیر جمہوری انداز میں حکومت کرنے والے حکمرانوں نے ہمیشہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا- حکمرانوں نے اپنے سیاسی مقاصد کی خاطر لسانی اور فرقہ وارانہ تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی-

جمہوری اداروں کی نشوونما قومی یکجہتی کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے- اس سے گروہوں اور طبقوں میں باہم اعتماد کی سازگار فضا ابھرتی ہے- پاکستان میں اگر جمہوری ادارے قائم و دائم ہوں تو زیرزمین سرگرمیاں اور تخریبی کارروائیاں نہیں ہوتیں- جمہوری ادارے وفاق کی کامیابی کی بھی ضمانت سمجھے جاتے ہیں-

3- **انتخابات سے گریز :** عوام ووٹ کا استعمال کرتے ہیں تو انہیں اپنی حکومت کی تشکیل کا موقع ملتا ہے- پاکستان میں انتخابات سے گریز کی پالیسی پر طویل عرصے تک عمل ہوتا رہا ہے- لیاقت علی خان سے ایوب خان تک تمام حکمرانوں نے عام انتخابات کے انعقاد کو ٹالتے

رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ 56-1947ء کے پارلیمانی نظام کے تحت عام قومی انتخابات ایک بار بھی نہ کرائے گئے۔ 1958ء میں انتخابی عمل شروع کرنے کا عزم کیا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے جمہوری اداروں کی تخلیق کرتے ایوب خان نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ مژدۂ جمہوریت تو ایوب خان نے بھی سنایا لیکن بالواسطہ انتخابی طریقہ اپنا کر عوامی امنگوں کو صحیح اظہار کا موقع نہیں دیا گیا۔ جمہوریت کے حق میں عوام کی ملک گیر تحریک نے ایوبی آمریت کا تو خاتمہ کر دیا لیکن جمہوریت کی بجائے جنرل یحیٰی خان کی قیادت میں عوام کو ایک اور مارشل لا کا سامنا کرنا پڑا۔ 1977ء میں جنرل ضیاء الحق نے جمہوریت کی بساط لپیٹ دی۔ 90 دن کے اندر عام انتخابات کا وعدہ تو کیا گیا لیکن آٹھ سال تک اس وعدے کی تکمیل نہ ہوئی۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات جنرل ضیاء الحق نے کروائے جس کے نتیجے میں محمد خاں جونیجو وزیراعظم بنے۔ 17 اگست 1988ء میں جنرل ضیاء الحق فضائی حادثے میں جاں بحق ہوئے تو صدر اسحاق خان نے انتخابات کرائے۔ 1990ء، 1993ء اور 1996ء میں مزید انتخابات ہوئے۔ چار انتخابات کا تواتر سے منعقد کرایا جانا جمہوریت کے لیے مفید ثابت ہوا ہے۔ عام انتخابات وقت پر ضرور منعقد ہونے چاہییں۔ ان سے گریز قومی یکجہتی کے لیے نقصان دہ ہے۔

4- نظریاتی بنیادوں سے انحراف: برصغیر کے مسلمانوں نے ایک نظریہ کی بنیاد پر علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ جب تک نظریہ سے وابستگی رہی، برصغیر کے مسلمان ایک مضبوط قوم نظر آتے رہے۔ انہوں نے اپنے سے کہیں زیادہ بڑی ہندو قوم کا مقابلہ کیا اور مملکت پاکستان وجود میں آئی۔ آزادی کے حصول کے کچھ ہی سال بعد اسلامی رشتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے عوام، زبان اور معیشت کے حوالے سے تعصبات کا شکار ہو گئے۔ اپنی اساس سے دور ہٹے اور مسلمانان پاکستان کی قوت کمزور ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ 1971ء میں ملک دو لخت ہو گیا۔ نظریاتی بنیادوں سے انحراف نے قومی بنیادوں کو ہلا دیا۔ حضرت قائداعظمؒ نے سنہرے اصولوں والے ضابطہ حیات کو واحد ذریعہ نجات سمجھنے کا مشورہ دیا تھا لیکن عظیم قانون سے پہلو تہی کی گئی جس کا نتیجہ ہم آہنگی اور یکجہتی کے نقصان کی صورت میں نکلا۔ اگر ہم دوبارہ یکجہتی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی نظریاتی اساس کی طرف لوٹنا ہو گا۔

5- غیر منصفانہ اقتصادی نظام: پاکستان کو فلاحی مملکت بنانا مقصود تھا لیکن مخصوص مفادات کے حامل افراد اور طبقوں نے معاشی انصاف کا خواب ہی بکھیر دیا۔ عام لوگ محرومیوں کا شکار ہوئے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے طبقات کے درمیان وسیع خلیج پیدا

کر دی۔ وسائل پر چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا اور عام لوگ حسرت و یاس کی تصویر بن گئے۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں معاشی ناہمواریوں نے بہت سے مسائل پیدا کر دیے۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ "اسلام محض رسوم و روایات کا نام نہیں' یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے مطابق ہر مسلمان اپنی روزمرہ کی زندگی' اپنے افعال و اعمال کے مطابق گزار سکتا ہے۔ نیز سیاست و معیشت کے میدان میں عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ اسلام رنگ و نسل کا قائل نہیں۔ مساوات' آزادی اور بھائی چارہ اسلام کی بنیادیں ہیں۔

پاکستان میں اسلام کو ووٹوں کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا اس عظیم' قابل عمل اور مکمل ترین نظام کو مکمل طور پر عملاً نافذ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا نظام انسانی مساوات اور معاشی انصاف کے تقاضے احسن طریقے سے پورا نہیں کر سکتا۔ اسلام کو خلوص اور دیانت کے ساتھ نافذ کرنے کی بجائے اسلام کو ایک نعرے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یکجہتی پیدا کرنے والے نظام سے صحیح فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ پاکستان میں معاشی ناانصافیوں کو ختم کر کے بھائی چارے اور اتحاد کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے آزادی' مساوات اور اخوت جیسی اعلیٰ قدروں کے حامل اس نظام کو اس کی حقیقی شکل میں نافذ کیا جائے تو قومی استحکام یقیناً حاصل کیا جا سکتا ہے۔

6- **فرقہ واریت کا زہر:** گزشتہ چند سالوں سے فرقہ واریت نے قوم کو اذیت میں ڈالا ہوا ہے۔ ایک اللہ ایک رسول اور ایک کتاب کے ماننے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ قتل و غارت اور تشدد کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ بعض مذہبی راہنماؤں نے مسلمانوں کو باہم تقسیم کر کے انتشار و نفاق پیدا کر دیا ہے۔ اسلام محبت اور آشتی کا مذہب ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رواداری اور باہمی احترام کا درس دیا ہے۔ آپ نے مسلمان کو مسلمان کی جان لینے سے منع فرمایا ہے۔ قتل کو بدترین افعال میں شمار کیا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ رسالت مآبؐ کی امت سے تعلق رکھنے والے افراد ایک دوسرے کو ختم کر دینے کی سوچ کے حامل ہیں۔ فرقہ واریت نے غلط فہمیوں اور کدورتوں کو جنم دیا ہے۔ یہ سب قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والی باتیں ہیں۔ فرقہ واریت کے ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک دشمن قوتیں اپنے مذموم مقاصد پورے کر رہی ہیں غیر ملکی ایجنٹ شیعہ سنی فساد کراتے ہیں۔ اسلام کے فرزندوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے اور رواداری سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرنا

چاہیے۔ فرقہ واریت کی فضا جیسے ہی بدلے گی قومی یکجہتی کے لیے سازگار حالات پیدا ہونے لگیں گے۔

7- سیاسی جماعتوں کے رویے : جمہوری نظام رکھنے والی اقوام میں یکجہتی پیدا کرنے کے لیے سیاسی جماعتیں بڑا موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ امریکی مثال کو لیں دو جماعتی نظام ہے اور دونوں ملک گیر جماعتیں ہیں۔ ہر دو جماعتوں نے اپنے مثبت رویوں کی بدولت وفاق کو مضبوط اور کامیاب بنا رکھا ہے۔ پاکستان میں کثیر الجماعتی نظام ہے۔ متعدد جماعتیں علاقائی ہے۔ انہیں ملک گیر نہیں کہا جا سکتا۔ بہت کم ایسی جماعتیں ہیں جن کی چاروں صوبوں میں موثر تنظیم موجود ہے۔ جمعیت العلمائے اسلام اور عوامی نیشنل پارٹی کا زیادہ تر سرحد اور بلوچستان میں اثر و رسوخ ہے۔ ایم کیو ایم سندھ کے بڑے شہروں اور بلوچستان نیشنل الائنس صوبہ بلوچستان تک محدود ہے۔

1971ء کے حالات پیدا کرنے میں سیاسی جماعتوں کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔ 1970-71ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ کو مشرقی حصے میں مکمل غلبہ حاصل ہوا لیکن وہ مغربی پاکستان میں ایک بھی نشست حاصل نہ کر سکی۔ یہی صورت حال مغربی پاکستان میں جیتنے والی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی تھی کہ اسے مشرقی حصے میں پذیرائی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ عوامی لیگ صرف مشرقی حصے کے عوام کے مسائل سے واسطہ رکھتی تھی تو پیپلز پارٹی کو مغربی حصے کے عوام کے مفادات عزیز تھے۔ یہ حالات مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کی شکل دینے کا باعث بنے۔ تجربہ یہی ہے کہ قومی یکجہتی اتحاد اور قومی سوچ کے حصول کے لیے ملک گیر جماعتیں ہونی چاہییں جو ملک کے طول و عرض میں رہنے والے تمام باشندوں کی نمائندہ سمجھی جاتی ہوں۔ ایسی جماعتیں علاقائی سوچ اور تعصب کو نظرانداز کر کے قومی سطح کی پالیسیوں کی جماعت کرتی ہیں اور یکجہتی کا عنصر مضبوط ہوتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے لیے جمہوری اصولوں کی پاسداری کرنا بھی لازم ہے۔ اگر سیاسی جماعت انتخاب ہارنے کے بعد اپنی شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور دھاندلی کے الزامات عائد کرنا شروع کر دے تو جمہوری سفر رک جاتا ہے۔ ایسی جماعت جیتنے والی جماعت کو اقتدار کی منتقلی کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیتی ہے۔ اگر اقتدار منتقل ہو جائے تو یہ نئے انتخابات کا مطالبہ شروع کر دیتی ہے۔ یوں حکومتی اور مخالف دونوں سیاسی جماعتیں اقتدار کی رسہ کشی میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور قومی ترقی کے منصوبے مکمل نہیں ہو پاتے۔

8- ابلاغ عامہ کا کردار : ٹی وی، ریڈیو، اخبارات اور جرائد رائے عامہ کی تشکیل کرتے

ہیں۔ ان ذرائع کا مثبت رویہ قوم کو ایک اور مضبوط بناتا ہے۔ اگر وہ منفی رویے اختیار کریں تو عوام کو گمراہ بھی کر سکتے ہیں۔ اخبارات و جرائد محض اپنی سرکولیشن بڑھانے کے لیے عوام کے جذبات سے کھیلنے لگیں نیز علاقائی' لسانی اور فرقہ وارانہ مسائل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے لگیں تو اتحاد و ہم آہنگی کا قائم رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں فرقہ واریت اور صوبہ پرستی کا زہر پھیلانے میں اخباری اطلاعات نے بھی بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ حکومت کو کمزور ثابت کرنے کی فکر میں بعض اخبارات اخلاقی اور فرقہ وارانہ نوعیت کی خبروں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ عوام میں غصہ' مایوسی اور عدم اعتماد پیدا ہونے لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے صحافی حکومت کو تبدیل کروانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن قومی یکجہتی کے اعلیٰ مقاصد کو ضرور تباہ کر دیتے ہیں۔ صحافیوں پر لازم ہے کہ وہ ملکی وقار اور باہمی اعتماد کی ترقی و سلامتی کا خیال ذہن میں رکھتے ہوئے قلم اٹھائیں۔ صحافی کا قلم قوم کے رویوں پر اثر ڈالتا ہے اس لیے قلم کا استعمال مناسب انداز میں ہونا چاہیے۔ ریڈیو' ٹی۔وی' اخبارات اور رسائل وطن دوستی اور اتحاد کے لیے بہتر فضا تیار کر سکتے ہیں وہ عوام کے ذہنوں میں اٹھنے والے منفی شکوک اور شبہات کو قوی بنانے کی بجائے اگر انہیں دور کرنے کی کوشش کریں تو قومی سطح پر عمدہ رائے عامہ کو تیار کیا جا سکتا ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران ڈان' احسان' نوائے وقت اور زمیندار جیسے اخبارات کا کردار تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ ان اخبارات نے نظریہ پاکستان کے فروغ اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے لیے قابل قدر کردار ادا کیا اور تخلیق پاکستان میں معاون ثابت ہوئے۔ ان اخبارات نے مسلمانوں کو فرقہ وارانہ' لسانی اور نسلی امتیازات کو بھلا دینے اور ایک مضبوط قوم بن کر اپنا علیحدہ وطن حاصل کرنے میں زبردست مدد دی۔ آج بھی علاقائی اور لسانی بنیادوں پر پائے جانے والے تعصبات کو ختم کرنے میں اخبارات و رسائل نیز ریڈیو اور ٹی وی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

قومی یکجہتی کے لیے بنیادی عوامل

قومی یکجہتی کا فروغ ہر محب وطن شہری کی خواہش ہے کیونکہ اسی کی بدولت ترقی اور وقار حاصل کیا جا سکتا ہے نیز قوم دیگر اقوام کے درمیان قابل فخر مقام حاصل کر سکتی ہے۔ ہم ذیل میں ان عوامل کا ذکر کرتے ہیں جن سے قومی یکجہتی کی منزل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

1- تعلیم کا فروغ (Role of Education) : تعلیم آدمی کو انسان بناتی ہے۔ اسے

نیکی اور بدی کے فرق سے آشنا کرتی ہے نیز ذہنی وسعتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اچھی تعلیم انسان کو انسان سے محبت، رواداری اور خلوص کے رشتے قائم کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ جہالت بے شمار خرابیوں کی جڑ ہے۔ بے علم لوگ تعصبات کا جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ اندھی تقلید کرتے ہوئے وہ غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر پاتے۔ معاشرے میں اگر تعلیم عام ہو جائے تو تہذیب کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ خود معاشرہ فلاحی صورت اختیار کر لیتا ہے، بہتر معاشرتی قدریں فروغ پاتی ہیں، صحیح تعلیم معاشرے میں انقلاب لے آتی ہے۔ پاکستان میں شرح خواندگی بہت کم ہے۔ دو تہائی سے زیادہ شہری ان پڑھ ہیں۔ اسی لیے پاکستان میں قومی یکجہتی کے حوالے سے مسائل میں کمی نہیں ہو پا رہی۔ تعلیم سے افراد کو مل جل کر رہنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بدولت کینہ پروری، خود غرضی اور مکرو فریب جیسی برائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ انسان اپنے خالق کو سمجھنے لگتا ہے نیز خالق اور مخلوق کے مابین تعلق کی حقیقت بھی اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے ساتھی انسانوں کے دکھوں میں شریک ہوتا ہے اور ان کے ازالے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے شفقت کا درس تعلیم ہی سے ملتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے حصول پر بڑا زور دیا۔ خود اللہ تعالیٰ نے تعلیم کو اولیت دی ہے کیوں کہ اس نے اپنے سب سے برگزیدہ بندے کو پہلی وحی میں ہی "پڑھ" کی تلقین کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان زیور تعلیم سے آراستہ نہیں ہوتا وہ مکمل انسان نہیں بن پاتا۔ تعلیم سے انسان کو اس کے انفرادی و اجتماعی مسائل کا پتہ چلتا ہے نیز وہ اپنی زندگی کے معاشرتی، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور مذہبی پہلوؤں کو بھی بہتر طور پر سمجھتے ہوئے بہتر شکل میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ اجتماعی بہبود ہی میں اس کی اپنی بہتری بھی مضمر ہے۔ یہ نقطہ سمجھ آ جائے تو قومی وحدت اور یکجہتی کے حصول میں ایک بڑی رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔

2۔ منصفانہ معاشی نظام : معاشی پہلو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے۔ بعض ماہرین نے تو معاشیات کو انسانی زندگی پر اثر ڈالنے والا سب سے اہم عنصر تسلیم کیا ہے۔ اگر معاشرے میں دولت کی مناسب تقسیم نہ ہو اور عوام محسوس کریں کہ انہیں معاشی انصاف مہیا نہیں کیا جا رہا تو یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔ معاشی ناہمواریاں انسانوں کو مایوس کر دیتی ہیں اور ان کا اپنے معاشرتی اور سیاسی نظام سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ ریاست اور معاشرے سے افراد کی دلی وابستگی پیدا کرنا مقصود ہو تو عوام کا اعتماد قائم کرنا لازمی ہے۔ انہیں اپنے نظام میں افادیت دکھائی دے تو وہ تعاون کرتے ہیں۔ لوٹ

کھسوٹ اور چھینا جھپٹی کے عالم میں افراد اپنے ہی نظام کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ خود غرضی اور دھوکہ بازی سے افراد کا باہمی اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ اگر دولت کا ارتکاز ہو رہا ہو اور معاشی وسائل پر صرف چند افراد کا قبضہ ہو تو باقی ماندہ آبادی نظام سے تعاون پر آمادہ نہیں ہوتی۔ غربت اور بے روزگاری انسانوں کو جرائم کی وادی میں دھکیلنے کا سبب بنتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دولت کی تقسیم منصفانہ ہو۔ ہر فرد اور خاندان کو اس کا جائز حق ملے۔ استحصال کا خاتمہ ہو اور عوام اپنی ضرورت کے ضمن میں بے چارگی کا شکار نہ ہوں۔ اگر سرمایہ گردش میں رہے اور لوگوں کو ان کی محنت کا مناسب معاوضہ ملتا رہے' ریاست ان کی فلاح کے منصوبے مکمل کرتی رہے اور وہ محرومیوں کا شکار نہ ہوں تو یکجہتی کی راہ ہموار رہتی ہے۔ ریاست کو اہتمام کرنا چاہیے کہ بے روزگاری کا خاتمہ ہو' محتاج اور معذور افراد کی کفالت ہوتی رہے اور ریاست کی جانب سے تعلیم' صحت اور سماجی بہبود جیسے کاموں میں گہری دلچسپی کا اظہار ہو تو مطلوبہ ماحول میسر آ جاتا ہے۔ انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کر کے فلاحی معاشرے کی شکل پیدا کی جا سکتی ہے۔ مطمئن اور آسودہ حال افراد ریاست اور معاشرے سے پورا پورا تعاون کرتے ہیں جس سے ہم آہنگی و قومی وحدت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

3- **انتظامی مشینری (Administration) :** قومی یکجہتی کے لیے ملک میں قائم انتظامی مشینری کا کردار بڑا اہم ہے۔ ذمہ دار' بااصول اور دیانت دار انتظامی عہدیدار عوام کی خدمت کر کے ان کے لیے خوشیوں اور سکون کا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ اگر شہری اپنے معاشرتی ماحول میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں اور ملک بھر میں امن و امان ہو تو وہ نظام سے تعاون پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر جان' مال' عزت اور حقوق کی حفاظت کا صحیح بندوبست نہ ہو تو عوام سے تعاون کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پولیس اور دیگر انتظامی شعبے اگر رشوت' سفارش اور اقربا پروری جیسی برائیوں کا شکار ہو جائیں تو عوام کو انصاف نہیں مل پاتا۔ ظاہر ہے کہ محرومیوں کے شکار عوام سے بھرپور جذبوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ انتظامی مشینری کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے فرائض عمدہ انداز میں پورے کرے۔ منصفانہ انداز میں معاملات کو نپٹائے۔ مظلوم کی مدد کرے اور ظالم کو سزا دے تو قومی جذبوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے قائم نہیں رہتے جہاں انصاف نہ مل رہا ہو۔

پاکستان میں قومی تقاضوں کی تکمیل کے لیے سرکاری افسروں کے کردار کو نئے سانچے میں ڈھالنا ہو گا۔ ہمارے ہاں افسروں نے پس منظر میں رہتے ہوئے حقیقی طاقت اپنے ہاتھ

میں لیے رکھی ہے۔ سکندر مرزا' ملک غلام محمد اور اسحاق خان جیسے بیورو کریٹس اپنے عہدوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاست پر اثر انداز ہوتے رہے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈمنٹ کے بعد وہ براہ راست سیاست میں آ گئے اور ملک کے اعلیٰ ترین سیاسی عہدوں تک جا پہنچے۔ اگر انتظامی مشینری سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے لیے سیاسی کردار کا تعین کر لیں تو سیاسی پر برا اثر پڑتا ہے۔

4- تبادلہ آبادی: مرکزی حکومت بین الصوبائی تبادلہ آبادی کے منصوبے بنائے تو صوبہ پرستی کم ہو سکتی ہے۔ ایک صوبے کے شہری دوسرے صوبوں میں کاروبار ملازمت اور تعلیم کے حصول کے لیے جائیں۔ ممکن ہو تو وہاں مستقل آباد ہو جائیں اگر یہ عمل بڑے پیمانے پر کامیابی سے ہم کنار ہو جائے تو مختلف صوبوں میں بسنے والے خاندانوں کے مفادات مشترک ہو جائیں گے۔ یوں صوبائی عصبیت کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ اس مقصد کے لیے طلبہ کو وظائف دیے جائیں' کاروبار میں رعائتیں مہیا ہوں اور سرکاری ملازموں کو دوسرے صوبوں میں زیادہ مراعات ملیں تو رفتہ رفتہ بین الصوبائی رابطوں کا سلسلہ بڑھتا جائے گا۔ اپنے اپنے صوبوں تک محدود رہنے سے صوبہ پرستی کو ہوا ملتی ہے اور تعصبات بڑھتے ہیں اگر ایک صوبے کے افراد کو دوسرے صوبوں میں اکثر جانے کے مواقع ملتے ہیں تو وہ مشاہدہ کریں گے کہ ہر صوبہ میں غربت بھی ہے اور محرومیاں بھی نیز ہر صوبے میں استحصال کرنے والا طبقہ موجود ہے۔ امریکہ کی مثال ہمارے سامنے ہیں۔ آغاز میں لوگ تعصبات کا شکار تھے لیکن تبادلہ آبادی کے عمل نے علاقائی سوچ پر قومی سوچ کو غالب کر دیا۔

5- سیاست میں قومی یکجہتی (Politics in National Integration): قومی یکجہتی کی ذمہ داری سب سے زیادہ سیاست دانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ ذاتی اغراض اور جماعتی مفادات سے بلند ہو کر فیصلے کریں تو اتحاد و یگانگت کا مقصد پورا کرنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ قومی مسائل پر سیاستدانوں کو اصولی موقف اختیار کرنا چاہیے۔ سیاسی جماعتیں جمہوریت کا جزو لاینفک ہوتی ہیں۔ جمہوری نظام کی کامیابی کا تقاضا ہے کہ سیاستدان مضبوط' فعال اور ملک گیر جماعتیں تشکیل دیں اور اپنے ذاتی فائدے کے لیے جماعت سے وفاداریاں ترک نہ کریں۔ پاکستان میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے بعض ارکان سودا بازی کر کے وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں۔ اس عمل کو ناپسند کرتے ہوئے عوام نے اسے ہارس ٹریڈنگ کا نام دے دیا ہے۔ ایک حلقے کے رائے دہندگان کی اکثریت اپنا نمائندہ چنتے وقت اس کی جماعتی وابستگی کو دیکھتے ہیں۔ منتخب ہونے والے رکن کا فرض ہے کہ وہ عوام کی آراء

کا احترام کرے۔ اگر اپنی جماعت سے اصولی اختلاف پیدا ہو جائے تو بہتر ہے کہ وہ رکن اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو کر دوبارہ عوام کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرے' نیا مینڈیٹ حاصل کرے اور اسمبلی کے اندر پہنچے۔ افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوتا عوام کی مرضی کو نظرانداز کرتے ہوئے ارکان اسمبلی من مانی کر جاتے ہیں جس سے سیاسی نظام میں استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ غیر مستحکم سیاسی ماحول عوامی ذہنوں کو بدظن کر دیتا ہے۔ عوام منفی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ بے کردار سیاست دانوں سے نفرت کا اظہار ریاست و حکومت سے عدم تعاون کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جلوس' مظاہرے اور ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں اور یکجہتی کا عمل مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

پاکستان میں سیاست دانوں کا طرز عمل اس اعتبار سے بھی ہدف تنقید بنایا جاتا ہے کہ وہ انتخابات میں شکست کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کرتے۔ جس جماعت کو ناکامی کا سامنا ہوتا ہے وہ دھاندلی کا شور مچانا شروع کر دیتی ہے۔

حامی رائے دہندگان بھی جذبات کی رو میں بہہ کر برسراقتدار جماعت کے خلاف ایجی ٹیشن میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ قوم گروہوں میں بٹ جاتی ہے اور سیاستدانوں ایک دوسرے پر غداری کا الزام لگانے لگتے ہیں۔ عوام نفسیاتی طور پر الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نفرت اور عناد کی سیاست زور پکڑ لیتی ہے۔ حکومتی جماعت مخالفین کو کچلنے کے لیے منفی حربے استعمال کرتی ہے اس طرح یکجہتی کا خواب دن بدن بکھرتا چلا جاتا ہے۔

پاکستان میں سیاسی رسہ کشی کی وجہ سے 1956ء اور 1962ء کے دساتیر ناکام ہوئے۔ سیاست دانوں کی باہمی مخالفت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 1977ء میں دستور کو معطل کر کے مارشل لا لگا دیا گیا۔ آئے دن کی ان تبدیلیوں اور غیر جمہوری حکومتوں کی آمد کی ذمہ داری بڑی حد تک خود سیاستدانوں پر عائد ہوتی ہے۔ جس جماعت کو اقتدار میں شرکت کا موقع نہیں ملتا ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش میں لگ جاتی ہے کہ کوئی طالع آزما آئے اور جمہوریت کی بساط کو لپیٹ دے۔ "نہ کھیلیں گے اور نہ کھیلنے دیں گے" کی یہ سیاست قومی ہم آہنگی' وحدت فکر اور یکجہتی کو مٹانے کا باعث بنتی ہے۔ لازم ہے کہ سیاست دان اصولی اور مثبت کردار کا مظاہرہ کریں اور یکجہتی کے فروغ میں مددگار بنیں۔

6- رواداری: ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف کرنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف رائے جمہوریت کی جان ہے۔ ہر فرد کو اپنا نقطہ نظر رکھنے اور بیان کرنے کا معاشرتی و سیاسی حق ہے لیکن قومی سلامتی اور یکجہتی کا تقاضا ہے کہ شہری

اظہار رائے کا حق اجتماعی مفاد کے پیش نظر استعمال کریں۔ وہ اگر اپنی آراء کا احترام کروانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ دوسروں کی آرا بھی تحمل سے سنیں۔ اتحاد اور ترقی کے لیے قومی مفادات کا دھیان رکھیں۔ فرد کی طرح تمام گرہوں، جماعتوں، فرقوں اور تنظیموں پر بھی لازم آتا ہے کہ وہ باہم رواداری کا ثبوت دیں۔ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے مقولے پر عمل ہونا چاہیے۔ افراد جماعتی جذباتیت کا شکار نہ ہوں بلکہ مسائل حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھیں۔ مخالفت کا رویہ قومی ترقی کی راہوں کو مسدود کر دیتا ہے۔ حکومتی جماعت ہو یا حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والی جماعتیں ہر ایک کا کردار مثبت ہونا چاہیے۔ اسی طرح یگانگت اور ترقی کی صورت بنتی ہے۔ ریاست میں صحت مند اور جمہوری روایات کا احترام ضروری ہے۔ پاکستان میں سیاستدان ایک دوسرے پر غداری کا لیبل لگانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مخالفوں کو نظریہ پاکستان کا مخالف کہہ کر دبانے کی رسم اچھی نہیں۔ اس سے عوام کے ذہنوں میں شکوک پیدا ہوتے ہیں اور لیڈروں کے مابین بھی نفرت و کدورت کا منفی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو دور اندیشی اور رواداری سے کام لینا چاہیے کیونکہ آج کا حریف کل کا حلیف بن سکتا ہے۔

7- **استحقاق کا احترام:** کسی بھی سیاسی معاشرے میں اگر حقدار کو اس کا حق نہیں ملتا اور غیر مستحق لوگ دوسروں کے حقوق پر قبضہ کر لیتے ہیں تو معاشرے میں بدگمانیاں اور مایوسیاں پھیلتی ہیں۔ پچھلے دروازے سے داخل ہو کر رشوت اور سفارش کے بل بوتے پر کامیابیاں حاصل کرنے والے افراد دوسروں کے لیے بددلی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ میرٹ کا دھیان نہ رکھا جائے تو اچھے بھلے قانون پسند اور وفادار شہریوں میں بغاوت اور معاشرے سے بیگانگی کے جراثیم جنم لے لیتے ہیں۔ ناانصافی خود معاشرے کے لیے بربادی کا سبب بن جاتی ہیں۔ ضروری ہے کہ استحقاق کا احترام کیا جائے۔ معاشرے میں حقدار کو حق ملتا رہے تو متوازن اور منصفانہ ماحول قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں معاون بنتا ہے۔

8- **قوم سے وفاداری:** پاکستان کے عام شہریوں، سیاست دانوں، فن کاروں صحافیوں اور دیگر شعبوں سے متعلق لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام تر وفاداریاں اپنے پیارے وطن کے ساتھ وابستہ رکھیں۔ امریکہ، روس، چین اور عرب ممالک نے پاکستان میں اپنے ہمدرد تلاش کیے ہوئے ہیں۔ ان ممالک کی یہاں اپنی اپنی لابیز ہیں۔ یہاں ہمیں چین نواز، امریکہ نواز اور روس نواز پاکستانی ملتے ہیں جو اپنے اپنے مربی کی خوشنودی کے مطابق سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں حالانکہ ہم سب کو پاکستان نواز ہونا چاہیے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ قومی مفادات کو

پیش نظر رکھے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی غیر ملک کے اشاروں پر عمل پیرا نہ ہو۔ غیر ممالک کا آلہ کار بننا یقیناً غداری کے مترادف ہے اگر اس عمل سے اپنے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

سوالات

1- قومی یکجہتی سے کیا مراد ہے۔ پاکستان میں قومی یکجہتی کے حوالے سے کیا صورتحال ہے؟

2- پاکستان میں قومی یکجہتی کے حوالے سے موجود مسائل کا ذکر کریں اور بہتری کے لیے تجاویز پیش کریں۔

3- قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے بنیادی عوامل کا تفصیلی تذکرہ کریں۔

باب دہم

پاکستان کے خارجہ تعلقات

External Relations of Pakistan

پاکستان کی خارجہ پالیسی (Pakistan's Foreign Policy)

ہر ریاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسری ریاستوں سے تعلقات قائم کرے۔ ان تعلقات کے لیے ریاست اپنی خارجہ پالیسی ترتیب دیتی ہے اور بنیادی اصول طے کرتے وقت اپنے مخصوص حالات اور ضرورتوں کو پیش نظر رکھتی ہے۔ جس طرح ہر فرد دوسرے افراد کی ضرورت محسوس کرتا ہے اسی طرح ہر ریاست بھی دوسری ریاستوں سے روابط قائم کرنے پر مجبور ہے۔ اپنی سیاسی' اقتصادی' دفاعی اور دیگر ضرورتوں کے لیے ریاستیں باہم تعاون کرتی ہیں۔ ہر ریاست اپنی خارجہ پالیسی کا تعین اپنے مخصوص جغرافیائی سیاسی' اقتصادی' نظریاتی اور دیگر عوامل کی روشنی میں کرتی ہے۔ کسی ریاست کی خارجہ پالیسی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ نئے تقاضوں اور ضرورتوں کے پیش نظر حکومت اس میں مناسب تبدیلیاں لاتی رہتی ہے۔ خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں دوسری ریاستوں سے تعلقات کی نوعیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایک برطانوی سفارت کار لارڈ پامرسٹن نے کہا ہے۔ "بین الاقوامی تعلقات میں نہ تو کوئی مستقل دوست ہوتا ہے اور نہ مستقل دشمن بلکہ استقلال صرف قومی مفادات کو ہی حاصل ہوتا ہے۔" ایک ریاست کی خارجہ پالیسی قومی ضرورتوں کے تحت ترتیب دی جاتی ہے اور یہ پالیسی قوم کی ہمہ گیر پالیسی کا جزو ہوتی ہے۔ حکومت میں تبدیلی خارجہ پالیسی سمیت مختلف قومی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اقتدار میں آنے والی ہر حکومت عموماً" خارجہ پالیسی کو اپنے منشور کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ ہر ریاست میں خارجہ پالیسی کے تعین اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ ردو بدل کرنے کا فریضہ وزارت خارجہ نبھاتی ہے اور سربراہ حکومت کی نگرانی میں کام کرتی ہے۔ خارجہ پالیسی کی تشکیل قومی مفادات کی روشنی میں کی جاتی ہے اور بین الاقوامی حالات و تعلقات میں تبدیلیاں بھی کسی ریاست کی خارجہ پالیسی کے مقاصد اور اصولوں کو بدل دیتی ہیں۔

پاکستان جنوبی ایشیا کی ایک اہم مملکت ہے جو نظریاتی بنیادوں پر وجود میں آئی۔ پالیسی

سازوں نے مملکت کی نظریاتی' جغرافیائی' دفاعی اور اقتصادی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے بنیادی اصول ترتیب دیے۔ اگرچہ خارجہ پالیسی میں مختلف حکومتوں نے وقتاً" فوقتاً" اہم تبدیلیاں کرنا ضروری سمجھا لیکن بنیادی مقاصد اور قدروں کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔

درج ذیل مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے خارجہ پالیسی کے خدوخال ترتیب دیے گئے۔

(i) ملکی سالمیت (ii) نظریاتی سرحدوں کی حفاظت (iii) اقتصادی ترقی (iv) قومی وقار کا حصول (v) بین الاقوامی امن کی تلاش (vi) قومی مفادات کا تحفظ

بھارت نے پاکستان کے وجود کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ ہندو راہنماؤں کا خیال تھا کہ کمزور پاکستان قائم نہ رہ سکے گا اس لیے وہ مسلسل اسے کمزور سے کمزور تر کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ پاکستان کو بھارتی عزائم کا پوری طرح علم رہا ہے اس لیے خارجہ پالیسی کا پہلا اور بنیادی مقصد سرحدوں کی حفاظت قرار دیا جاتا رہا۔ دیگر ممالک سے تعلقات اور دفاعی معاہدوں میں شرکت کے تمام فیصلے ملکی سالمیت کے حصول کے پیش نظر ہی کیے جاتے رہے ہیں۔ پاکستان نے سیٹو اور سنٹو جیسے دفاعی معاہدوں میں شریک ہو کر امریکہ کی چھتری تلے پناہ لینے کی کوشش کی۔ آج بھی پاکستان ملکی سالمیت کی خاطر ہر ممکن قدم اٹھا رہا ہے اور تمام ریاستوں کی آزادی و سالمیت کے حق میں آواز بلند کرتا ہے۔

پاکستان کا وجود علاقائی لسانی یا نسلی بنیادوں پر استوار نہیں ہوا۔ اس کی بنیاد مذہب ہے اور مذہب سے وابستہ رہ کر ہی اس ملک کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی تمام حکومتوں نے اسلامی دنیا سے روابط کو مضبوط بنایا اور اپنی نظریاتی اساس کو اہمیت دی۔ پاکستان کی خودمختاری کو برقرار رکھنے کے لیے اقتصادی اعتبار سے مستحکم اور خودکفیل ہونا ضروری ہے۔ اقتصادی ترقی کی ضرورت پاکستان کی خارجہ پالیسی کا اہم نقطہ ہے۔ پاکستان اپنے وسائل کی ترقی کے لیے دوسرے ممالک کے تعاون کا طلب گار رہا ہے۔ زراعت' صنعت' معدنیات اور دیگر شعبوں میں ترقی کے لیے غیر ملکی قرضے لیے گئے ہیں اور بین الاقوامی مالی اداروں کے تعاون سے منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ پاکستان بتدریج خود انحصاری کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اور اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے خارجہ پالیسی کا تعین کیا گیا ہے۔ پاکستانی عوام بین الاقوامی برادری میں اپنی پہچان ایک خود دار اور غیرت مند قوم کی حیثیت میں کرانا چاہتے ہیں۔ قومی خود مختاری کا حصول خارجہ پالیسی کا اہم مقصد ہے۔

خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

(Basic Principles of Foreign Policy)

آزادی کے حصول کے بعد خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ ملکی سالمیت کی خاطر ابتدا میں، دفاعی معاہدات کیے گئے بعد ازاں نئے موڑ آئے۔ بھارت سے جنگوں کے دوران حلیفوں کے رویے نے پاکستان کو خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں لانے پر مجبور کیا۔ پاکستان نے امریکہ پر تمام تر انحصار کرنے کی پالیسی پر نظرثانی کی۔ موجودہ خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول یہ ہیں۔

1- **آزاد اور غیر جانبدار پالیسی :** پاکستان کی خارجہ پالیسی عوامی امنگوں اور قومی وقار کی آئینہ دار ہے۔ اسے آزاد، خودمختار اور غیر جانب دار حیثیت دی گئی ہے۔ آزادی کے کچھ سال بعد پاکستان نے اپنی علاقائی خودمختاری اور قومی آزادی کی خاطر دفاعی معاہدوں میں شرکت کرکے امریکہ سے وابستگی اختیار کی تھی لیکن یہ پالیسی قومی وقار کے لیے موزوں ثابت نہ ہوئی۔ موجودہ خارجہ پالیسی آزاد اور غیر جانبدار ہے۔ اس لیے وقار کا باعث ہے۔

2- **ملکی سالمیت کا تحفظ :** پاکستان کی سالمیت کو بھارت سے ہمیشہ خطرات دامن گیر رہے ہیں اور اسے اپنی حفاظت کے لیے اقدام اٹھانے پڑے ہیں۔ اپنی افواج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرنے اور دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے پاکستان نے دیگر ممالک سے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ امریکہ اور چین سمیت مختلف ممالک سے اسلحہ حاصل کیا گیا ہے۔ ضرورت تھی تو دفاعی معاہدوں میں بھی شمولیت اختیار کی گئی۔ بھارت نے 1974ء میں ایٹمی دھماکہ کیا تو پاکستان نے بھی ایٹمی قوت کے حصول کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ اس ضمن میں پاکستان نے امریکہ سمیت مغربی ممالک کے دباؤ کو قبول نہیں کیا۔

3- **حق خودارادیت کی حمایت :** یہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک بنیادی اصول ہے کہ ہر قوم کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ملے۔ پاکستان نے اس حق کے لیے ہر فورم پر جدوجہد کی ہے۔ پاکستان نے کشمیر، بوسنیا، فلسطین، ویت نام، کمپوچیا اور افغانستان سمیت تمام اقوام کی آزادی کی جدوجہد کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ افغان عوام کے حق خودارادیت کو منوانے کے لیے پاکستان نے سابق سوویت یونین سے بھی ٹکر لی۔

4- **اسلامی اتحاد :** پاکستان نے ہمیشہ اسلامی دنیا سے گہرے تعلقات کے قیام کی کوششیں

جاری رکھی ہیں۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کو کامیاب بنانے میں پاکستان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔اسلامی ممالک کے باہمی اختلافات کو ختم کرانے میں بھی پاکستان کا اہم کردار رہا ہے۔ پاکستان اسلامی سربراہی کانفرنس کے فورم سے کشمیر، فلسطین، ترک قبرص، افغانستان اور وسطی ایشیائی اسلامی ریاستوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتا آرہا ہے۔ پاکستان عالم اسلام کے اتحاد کے لیے کوشاں ہے۔

5- ہمسایہ ممالک سے اچھے تعلقات : پاکستان نے ہر دور میں پر خلوص کوششیں کی ہیں کہ تمام پڑوسی ریاستوں سے اچھے تعلقات استوار کیے جائیں۔ بھارت کے علاوہ تمام پڑوسیوں سے پاکستان کے مثالی تعلقات ہیں۔ ایران، چین، نیپال، افغانستان، سری لنکا اور متحدہ عرب امارات سے بہت سے شعبوں میں تعاون جاری ہے۔ سارک (SAARC) اور ای۔سی۔او (E.C.O) جیسی تنظیموں کی بدولت پاکستان پڑوسی ممالک کے بہت قریب آیا ہے۔ ماضی میں افغانستان سے تعلقات کشیدہ رہے لیکن افغان عوام کی جدوجہد آزادی میں پاکستان کے پر خلوص کردار سے باہمی تعلقات کو ایک نئی جہت ملی ہے۔

6- اقوام متحدہ سے تعاون : پاکستان عالمی امن کے قیام کے لیے اقوام متحدہ سے مکمل تعاون کرتا چلا آ رہا ہے۔ نیز عالمی اداروں کی قراردادوں کا احترام کیا ہے۔ اگر اقوام متحدہ نے پاکستان کو دنیا کے مختلف حصوں میں امن کے قیام کے لیے فوجی دستے بھیجنے کو کہا تو پاکستان نے ہمیشہ بھرپور تعاون کیا ہے۔ اسلحہ کی دوڑ کے خاتمے اور ایٹم سے پاک علاقے قرار دینے کی بین الاقوامی کوششوں کو پاکستان نے ہمیشہ سراہا ہے۔

7- تیسری دنیا سے تعلقات : پاکستان تیسری دنیا کے ممالک سے برادرانہ کوششوں کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی اقوام سے یکجہتی کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ بنڈونگ کانفرنس 1955ء میں منعقد ہوئی۔ اس دور سے پاکستان تیسری دنیا کے اتحاد کا خواہش مند رہا ہے۔ 1972ء کے بعد پاکستان نے تیسری دنیا کے ممالک کی بہبود کے لیے نئے عالمی اقتصادی نظام کی تشکیل پر زور دینا شروع کیا۔

8- بڑے ممالک سے تعلقات میں توازن : موجودہ خارجہ پالیسی میں اس پہلو پر خصوصی توجہ دی گئی کہ بڑے ممالک کے ساتھ تعلقات میں توازن رکھا جائے گا۔ کسی ایک بڑے ملک کے لیے دوسرے بڑے ممالک کو نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔ امریکہ دنیا کی واحد سپرپاور بن کر سامنے آیا تو پاکستان کو اس اصول پر عمل کرنے میں دشواریوں کا سامنا ہے۔

9- کشمیر کی آزادی: کشمیر کو پاکستان کی خارجہ پالیسی میں مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل ہے- کشمیریوں کے حق خودارادیت کے لیے پاکستان ہر ممکن سفارتی' سیاسی' اور اخلاقی کوششوں میں مصروف ہے- کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور کشمیریوں سے پاکستانی عوام کے ثقافتی جغرافیائی اور مذہبی رشتے بڑے مضبوط ہیں- ہر دور میں کشمیر کو خارجہ پالیسی کی تشکیل میں سب سے اہم مقام حاصل رہا ہے-

پاکستان کے پڑوسی ممالک سے تعلقات

(Pakistan's relations with neighbours)

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم اصول پڑوسی ممالک سے اچھے تعلقات کا قیام ہے- ایران' چین' نیپال' سری لنکا اور عرب امارات سے پاکستان کے دوستانہ رشتے بہت مضبوط ہیں- ماضی میں افغانستان سے تناؤ رہا لیکن گزشتہ چند سالوں میں افغانستان سے پاکستان کے برادرانہ رویے نے حالات کو بدل دیا ہے- سارک (SAARC) اور ای-سی-او (E.C.O) جیسی علاقائی تنظیموں کے ذریعے پاکستان کو اپنے پڑوسی ممالک سے قریبی روابط کے قیام میں بڑی مدد ملی ہے- بھارت واحد ملک ہے جس سے تعلقات کی نوعیت خراب رہی ہے اگر بھارت کشمیر کے حق خودارادیت کو تسلیم کر لے تو پورے جنوبی ایشیا میں نیا ماحول جنم لے سکتا ہے- بھارت' چین' ایران اور افغانستان پاکستان کے اہم ہمسایہ ممالک ہیں-

پاک بھارت تعلقات: دونوں ممالک کے تعلقات برصغیر کی تقسیم 1947ء سے کشیدہ چلے آ رہے ہیں- باہمی اعتماد اور دوستی کی فضا کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکی- بھارتی لیڈروں نے پاکستان کے قیام کو بادل نخواستہ قبول کیا تھا اور انہیں توقع تھی کہ دونوں ممالک ایک دن دوبارہ باہم مدغم ہو جائیں گے- یہ نہ ہوا تو بھارتی قیادت نے پاکستان کے خاتمے کے منصوبے بنائے حتیٰ کہ تین بار جنگ بھی مسلط کی گئی- بھارت نے پاکستان کے لیے شروع ہی سے مسائل پیدا کیے تاکہ اسے کمزور کیا جا سکے-

1- ڈیڑھ کروڑ مہاجرین پاکستان میں دھکیل دیے اور اقتصادی صورت خراب کر دی-
2- سرحدی تنازعات کا آغاز کر کے پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کیں-
3- اثاثوں کی تقسیم میں ناانصافی کی گئی فوجی سامان میں بھی حصہ نہ دیا-
4- دریاؤں کا پانی روک کر پاکستان کی زراعت کو تباہ کرنا چاہا-

5- بھارتی افواج نے ریاست ہائے جموں و کشمیر' حیدر آباد دکن اور جونا گڑھ پر قبضہ کیا۔
6- بھارت میں مقیم مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی۔ مسلم کش فسادات ہوتے رہے۔

دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی رہی۔ اس حوالے سے اہم نکات کا احاطہ کرتے ہیں۔

1- **مسئلہ کشمیر:** متعدد تنازعات ہر دو ممالک کے درمیان ابھرے اور تعلقات متاثر ہوتے رہے۔ مسئلہ کشمیر ان میں سب سے اہم ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کی 77 فیصد آبادی مسلمان تھی اور پاکستان میں شامل ہونے کی خواہش مند تھی۔ ڈوگرہ راجہ ہری سنگھ نے عوامی امنگوں کے برعکس بھارتی حکومت سے ساز باز کی اور بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہوگئی۔ پاکستان کے قبائلیوں نے کشمیریوں کا ساتھ دیا۔ قریب تھا کہ حریت پسند کشمیری آزادی حاصل کر لیتے کہ بھارت نے اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر پیش کر دیا۔ اقوام متحدہ نے کشمیر کا فیصلہ رائے شماری کے ذریعے کرائے جانے کے حق میں قراردادیں منظور کر لیں۔ بھارت نے قراردادوں پر عمل کا وعدہ کیا لیکن اس نے وادی کشمیر کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لیا تو وعدے سے انحراف کر گیا۔ اقوام متحدہ نے متعدد کوششیں کیں لیکن بھارت تعاون پر آمادہ نہ ہوا۔ سوویت یونین نے بھارت کا ساتھ دیا اور تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا گیا۔ 1965ء اور 1971ء میں مسئلہ کشمیر کی وجہ سے جنگیں بھی ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

روس' افغان جنگ اور عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا اثر کشمیریوں نے قبول کرتے ہوئے ایک نئے عزم کے ساتھ تحریک آزادی کا آغاز کیا۔ کشمیری حریت پسند اپنے خون سے نئی تاریخ لکھنے کی کوشش میں ہیں۔ پاکستان کی کشمیریوں کو اخلاقی و سیاسی مدد حاصل ہے۔ پاکستان ہر فورم پر کشمیریوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہا ہے۔ جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوتا پاک بھارت تعلقات میں بہتری کا امکان پیدا نہیں ہو سکتا۔

پاک بھارت جنگیں: 1948ء' 1965ء اور 1971ء میں ہر دو ممالک کے درمیان جنگیں ہوئیں۔ 1971ء میں بھارت اپنے عزائم میں کامیاب ہوا اور مشرقی حصہ علیحدہ ہو گیا۔ رن کچھ' بیڑو باڑی یونین اور بعض دوسرے محاذوں پر جھڑپیں ہوئیں۔ سیاچین سمیت بھارت کے ساتھ کئی مقامات پر جھڑپیں معمول بن چکی ہیں۔ پاکستان کو اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن کا سامنا ہے ایک اور جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ پاکستان کو مجبوراً" اپنے بجٹ کا بہت بڑا حصہ دفاعی تیاریوں پر خرچ کرنا پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے اقتصادیات بری

طرح متاثر ہو رہی ہے۔ بھارتی جارحانہ رویوں نے پاکستان کے لیے جو مشکلات پیدا کی ہیں وہ تعلقات کو بد سے بدتر بنا رہی ہیں۔

3- **معاہدہ تاشقند' معاہدہ شملہ :** جنگ 1965ء کے بعد روس کے وزیراعظم کوسیجن کی کوششوں سے صدر پاکستان ایوب خان اور وزیراعظم بھارت شاستری کے درمیان ایک معاہدہ تاشقند کے مقام پر طے پایا۔ خیال تھا کہ معاہدہ بہتر تعلقات کا دروازہ کھولنے میں مدد دے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ 1971ء میں روس ہی کی مدد سے بھارت نے مشرقی حصے کو علیحدہ کرنے کے لیے حملہ کر دیا۔ جنگ بندی کے بعد بھٹو اور اندرا گاندھی کے درمیان مذاکرات ہوئے اور 1972ء میں معاہدہ شملہ پر دستخط ہو گئے۔ دونوں لیڈروں نے جنگ کی بجائے پرامن طریقوں سے تنازعات حل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن معاہدہ شملہ کو نظرانداز کرتے ہوئے بھارت نے 1983ء میں سیاچن گلیشیر کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔

4- **ایٹمی دوڑ :** 1974ء کے بھارتی ایٹمی دھماکے نے پاکستان کے لیے نئے خطرات پیدا کر دیے ۔ پاکستان نے عالمی سطح پر جنوبی ایشیا اور بحرِ ہند کو ایٹم سے پاک علاقہ قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ بھارت نے ایٹمی سرگرمیاں جاری رکھیں تو پاکستان نے بھی ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ خریدنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ بھارت نے اگنی اور پرتھوی میزائیل بنا کر حالات کو مزید سنگین بنا دیا۔ بھارت جنوبی ایشیا کا دیو بننے کی کوشش میں ہے جس سے پاکستان میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔ دونوں ممالک نے 1988ء میں ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا لیکن اس کے باوجود باہمی اعتماد کا فقدان رہا۔

پاکستان نے اپریل 1998ء میں غوری میزائل کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔

5- **سارک :** 1985ء میں جنوبی ایشیا کے سات ممالک نے علاقائی تعاون کے لیے "سارک" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ بھارت اور پاکستان اس تنظیم کے رکن ممالک ہیں۔ تجارتی' ثقافتی اور اقتصادی شعبوں میں تعاون کے لیے کوششیں ہوتی ہیں لیکن پاک بھارت تعلقات میں خرابی تنظیم کے مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

6- **اندرونی معاملات میں مداخلت :** بھارت سندھ میں اپنی خفیہ ایجنسی "را" کے ذریعے افراتفری اور دہشت گردی پھیلانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ کراچی کے پرامن ماحول کو بھارتی ایجنٹوں نے تباہ کیا تو پاکستان نے کراچی میں اپنا قونصل خانہ بند کر دیا۔ حالات مزید خراب ہو رہے ہیں اور تعلقات کی نوعیت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

پاک چین تعلقات

پاک چین دوستی بڑی مضبوط ہے۔ چین نے قابل اعتماد پڑوسی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہر دو ممالک میں کئی شعبوں میں تعاون پایا جاتا ہے۔ عوامی سطح پر بھی دونوں قوموں کے مراسم بڑے گہرے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد چین اور بھارت بہت قریب سمجھے جاتے تھے۔ "ہندی چینی بھائی بھائی" کا نعرہ لگتا رہا۔ پاکستان نے امریکہ کا حلیف بنتے ہوئے سیٹو اور سنٹو میں شرکت کی تو پاک چین تعلقات میں خرابی پیدا ہو گئی۔ 1955ء کی بنڈونگ کانفرنس میں چینی وزیراعظم چواین لائی اور وزیراعظم پاکستان محمد علی بوگرہ کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے مذاکرات ہوئے۔ بھارت اور چین کے مابین ایشیائی قیادت کے سوال پر کشمکش پیدا ہوئی تو پاک چین تعلقات میں بہتری کی صورت ابھری۔ وزیراعظم بوگرہ نے چواین لائی کو یقین دلایا کہ دفاعی معاہدوں میں پاکستان کی شرکت پر چین کو مضطرب نہیں ہونا چاہیے۔ حسین شہید سہروردی وزیراعظم نے چین کا دورہ کیا تو تعلقات میں مزید بہتری پیدا ہوئی۔ چواین لائی بھی پاکستان کے دورے پر آئے تو قرب بڑھا۔ بعد ازاں دونوں ممالک کے سربراہوں کے دورے دوستی کو مضبوط تر بناتے چلے گئے۔

معاہدات:

1. 1963ء میں مال کے بدلے مال کا تجارتی سمجھوتہ طے پایا۔
2. اسی سال سرحدوں کا تعین کرنے کے لیے معاہدہ تحریر ہوا۔
3. 1963ء میں ہی دونوں ممالک کے درمیان فضائی سروس شروع ہوئی۔
4. 1964ء میں فون کا رابطہ قائم ہوا اور بحری تجارت کا معاہدہ طے پایا۔
5. 1964ء میں چین نے 6 کروڑ ڈالر، 1969ء میں ساڑھے چار کروڑ ڈالر اور 1971ء میں 20 کروڑ ڈالر آسان شرائط پر قرض دیے۔
6. 900 کلو میٹر لمبی شاہراہ قراقرم چین کی مدد سے بنائی گئی۔
7. ٹیکسلا کا ہیوی میکینکل کمپلیکس، متعدد تھرمل پاور سٹیشن، کھاد کے کارخانے، کاغذ سازی کے خانے اور دیگر صنعتیں لگانے میں چین نے مالی اور فنی امداد دی۔

سیاسی حمایت:

☆ بھارت کے خلاف جنگوں میں چین نے پاکستان کی سیاسی، اخلاقی، فنی اور دفاعی مدد کی۔

☆ چین نے کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کی ہمیشہ بھرپور حمایت کی۔

☆ پاکستان نے لاؤس، ویت نام، کمپوچیا اور تائیوان کے بارے میں چینی موقف کو تسلیم کیا۔

☆ امریکی مخالفت کے باوجود پاکستان چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی کوشش کرتا رہا۔

☆ چین نے بنگلہ دیش کو اقوام متحدہ کا رکن نہ بننے دیا اور نہ اسے تسلیم کیا جب تک کہ خود پاکستان نے بنگلہ دیش کے وجود کو تسلیم نہ کیا۔

☆ پاکستان نے شمالی کوریا کو تسلیم کیا، سیٹو سے علیحدگی اختیار کی اور روس کے مجوزہ ایشیائی تحفظ کے منصوبے کو مسترد کیا جس سے پاک چین دوستی اور مضبوط ہوئی۔

☆ چین نے افغانستان کے سوال پر پاکستانی موقف کی بھرپور تائید کی۔

ایٹمی تعاون: 1974ء کے بھارتی دھماکے کے بعد پاکستان کو اپنے تحفظ کی فکر دامن گیر ہوئی نیز ملک میں توانائی کے بحران نے پریشان کیا تو چین نے ایٹمی شعبے میں تعاون کا وعدہ کیا۔ 1986ء میں ہر دو ممالک میں ایٹمی سمجھوتہ طے پایا اور چین نے پاکستان کی توانائی کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے عالمی اور فنی امداد فراہم کی۔

پاک چین دوستی ہر امتحان پر پورا اتری ہے اور توقع ہے کہ مثالی تعلقات کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

پاک امریکہ تعلقات

تعلقات کا آغاز: امریکہ سے تعلقات کی ابتدا آزادی کے فوراً بعد ہو گئی جب لیاقت علی خان روس کے دعوت نامے کو نظر انداز کر کے امریکی دورے پر چلے گئے۔ گزشتہ 50 سالوں میں تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔ پاکستان بنا تو حکومت نے دفاعی کمزوریوں اور بھارتی عزائم کے پیش نظر امریکہ سے دفاعی مقاصد کے لیے وابستگی کو ضروری سمجھا۔ جنوبی ایشیا کی اہمیت کے پیش نظر امریکہ بھی اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتا تھا۔ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے امریکہ کو دوستوں کی تلاش تھی۔ دونوں ممالک اپنی اپنی ضرورتوں کے لیے ایک دوسرے کے قریب آئے۔

دفاعی معاہدات: پاکستان نے امریکہ کے زیر اثر قائم ہونے والے بلاک میں شمولیت

اختیار کی- سیٹو اور سنٹو بالترتیب جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی ایشیا کے لیے دو دفاعی معاہدات تیار کیے گئے- اگرچہ ان معاہدوں کی بدولت دفاعی قوت میں بڑا اضافہ ہوا لیکن روس، بعض عرب ممالک اور چین کا رویہ پاکستان کے حق میں نہ رہا- تنازعہ کشمیر پر روس نے ویٹو پاور کا استعمال کر کے پاکستان کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دیں- امریکہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران پاکستان کی توقعات پر پورا نہ اترا تو حکومت پاکستان نے سیٹو اور سنٹو سے علیحدگی کا اعلان کر دیا-

1971ء کے بعد تعلقات: 1971ء تک دونوں ممالک کے تعلقات اور دوستی قائم رہی لیکن حالات میں تبدیلیوں نے فاصلے بڑھا دیے- اس کی وجوہات درج ذیل تھیں-

1- پاک بھارت جنگوں میں امریکی کردار نے پاکستان کو مایوس کیا- امریکہ توقعات پر پورا نہ اترا-
2- پاکستان کو نظرانداز کر کے امریکہ نے بھارت کو اسلحہ کی ترسیل شروع کر دی-
3- پاکستان کو اسلحہ اور پرزوں کی فراہمی پر امریکہ نے پابندی لگا دی-
4- چین اور روس سے پاکستان کے بڑھتے ہوئے تعلقات امریکہ کو گراں گزرے-
5- امریکہ کے نمائندے ہنری کسنجر نے ذوالفقار علی بھٹو کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں کیونکہ پاکستان ایٹمی توانائی کے حصول کے لیے کوشاں تھا- اس کے برعکس بھارت نے 1974ء میں ایٹمی دھماکہ بھی کیا تو امریکہ نے کوئی مخالفانہ اقدام نہ اٹھایا- ایٹمی ٹیکنالوجی پاکستان کی ضرورت ہے- امریکہ نے پاکستان کو اس ٹیکنالوجی سے محروم رکھنے کی پالیسی اختیار کی-
6- 1971ء کے بعد پاکستان نے غیر جانبدار خارجہ پالیسی اختیار کی تو تیسری دنیا کے ممالک نے پاکستان کو گروپ آف 77 کا چیئرمین بنا دیا- امریکی رویہ میں سختی کا یہ بھی ایک سبب تھا-
7- 1974ء میں لاہور میں دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران پاکستان میں اسلامی اتحاد کے لیے پائے جانے والے جوش و خروش سے امریکہ کو فکر لاحق ہوئی- اسلامی بلاک کی تشکیل اور عرب ممالک کی جانب سے تیل کے ہتھیار کا استعمال بھی امریکہ کی ناراضگی کا باعث بنا- بھٹو دور میں پاک امریکی تعلقات کافی حد تک کشیدہ رہے-

امریکہ اور مسئلہ افغانستان: پاکستان امریکہ تعلقات بتدریج خراب ہو رہے تھے کہ

پاکستان کے گردونواح میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کی بدولت دونوں ممالک میں قرب کی صورت پیدا ہوئی۔ امریکی پالیسی سازوں کی نظروں میں پاکستان کی اہمیت بڑھ گئی۔

عراق ایران جنگ، ایران میں انقلاب، خلیجی ریاستوں میں امریکی مفادات، افغانستان میں روس کی افواج کی مداخلت سے امریکہ اور اس کے حلیفوں نے صورت احوال کو بھانپ لیا اور علاقے میں اپنا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکی پالیسیوں کے نفاذ میں پاکستان بہت معاون ثابت ہو سکتا تھا اس لیے بگڑے ہوئے تعلقات کو دوبارہ استوار کیا گیا۔ امریکہ نے تجدید دوستی کرتے ہوئے۔

☆ پاکستان کو ایف 16 اور اواکس طیارے اور جدید ترین سامان حرب دیا۔
☆ افغان مجاہدین کی مدد کے لیے اربوں ڈالر کا سامان جنگ پاکستان بھیجا گیا۔
☆ افغان مجاہدین کی سیاسی، اخلاقی، فوجی اور مالی امداد کا پروگرام بنایا گیا۔
☆ پاکستان کو اگلا مورچہ قرار دے دیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں پاک امریکی تعلقات بہترین شکل اختیار کر گئے۔ بے نظیر بھٹو نے وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا تو خارجہ پالیسی کا یہ تسلسل قائم رکھا گیا۔ امریکہ کا افغان مشن مکمل ہوا تو باہمی تعلقات میں پہلی سی گرماگرمی نہ رہی حالانکہ حکومت پاکستان نے عراق کے خلاف امریکی موقف کی تائید کر دی تھی۔

ایٹمی پروگرام: پاکستان پرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی حاصل کرنے کی تگ ودو کر رہا ہے لیکن امریکہ اس کی راہ میں حائل ہے۔ امریکہ کو خدشہ ہے کہ پاکستان ایٹم بم بنانا چاہتا ہے۔ امریکہ نے اسی لیے فرانس پر دباؤ ڈال کر ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ کرا دیا نیز پاکستان کی فوجی اور معاشی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پاکستان کا موقف ہے کہ وہ ایٹمی شعبے میں کسی ایسی یک طرفہ پابندی کو قبول نہیں کرے گا جس کا اطلاق بھارت پر نہ کیا جا رہا ہو۔ امریکہ بھارت سے ترجیحی سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاک امریکہ تعلقات میں کشیدگی دوبارہ پیدا ہو رہی ہے۔

1994ء میں صدر لغاری نے امریکہ کا دورہ کیا تو امید پیدا ہوئی کہ پاک امریکہ تعلقات میں مثبت تبدیلی آئے گی اور امریکی امداد بحال ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بے نظیر بھٹو کا دورہ امریکہ تعلقات کو بہتر بنانے کی ایک اور کوشش تھا۔ امید ہے امریکہ پاکستان کے موقف کو بہتر طور پر سمجھنے لگے گا۔

پاک روس تعلقات

1990ء میں دنیا کے نقشے سے مٹ جانے سے پہلے روس سپر طاقتوں میں سے ایک تھا۔ روس دنیا میں رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا اور آبادی کے اعتبار سے تیسرا بڑا ملک ہے۔ 1917ء میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد روس نے گرد و نواح کے علاقوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور روس دو سپر پاورز کی صورت میں ابھرے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں دونوں کا ٹکراؤ رہا۔ کوریا، جرمنی، ویت نام، مشرق وسطیٰ اور کیوبا سمیت کئی علاقوں میں دونوں ممالک کے درمیان رسہ کشی جاری رہی۔ جنوبی ایشیا میں بھی روس نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے پالیسی بنائی تو امریکہ اپنے عزائم کے ساتھ اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ پاکستان کا کردار اس سلسلے میں بڑا اہم رہا اور دونوں بڑی قوتوں کی رقابت کے پس منظر میں پاکستان کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔

پاک روس تعلقات کا آغاز: تخلیق پاکستان کے فوراً بعد روس نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو دورے کی دعوت دی۔ امریکہ نے بھی دعوت نامہ بھیج دیا۔ امور خارجہ کے ماہرین نے روس پر امریکہ کی دوستی کو ترجیح دیتے ہوئے وزیراعظم کو دورہ امریکہ کرنے کا مشورہ دیا۔ پاکستان کا امریکہ کی جانب جھکاؤ پاک روس تعلقات کو ناخوشگوار بنانے کا سبب بن گیا۔

تعلقات میں مزید خرابیاں: ابتدا مایوس کن تھی بعدازاں ایسے عوامل کار فرما ہوئے کہ تعلقات مزید بگڑ گئے۔

(i) پاکستان نے دفاعی معاہدات پر دستخط کر کے امریکہ کا ساتھ دیا۔

(ii) سیٹو اور سنٹو کمیونزم کو روکنے کے لیے ترتیب دیے گئے تھے۔

(iii) 1960ء میں V2 طیارے نے پشاور سے اڑ کر سابقہ سوویت یونین پر جاسوسی کی غرض سے پرواز کی جسے روس نے گرا لیا۔

مسئلہ کشمیر اور روس: مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں پیش ہوا تو آغاز میں روس نے پاکستان موقف کے حق میں ووٹ دیا لیکن مندرجہ بالا عوامل کی وجہ سے روس ناراض ہوا تو اس نے سلامتی کونسل میں قراردادوں کو ویٹو کر کے کشمیر کے مسئلے کو الجھا دیا۔ روس پاکستان کے مختلف علاقوں میں علیحدگی پسند قوتوں کی بھی پشت پناہی کرنے لگا۔ پختونستان کے نعروں کو روس ہی نے ہوا دی تھی۔

پاک بھارت جنگیں اور روس: 1965ء کی جنگ میں روس نے کھل کر بھارت کا ساتھ نہ دیا۔ جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند کے ذریعے تنازعات کو پرامن طور پر حل کرنے میں مدد دی۔ جنرل یحییٰ خان کے دور میں پاکستان دوبارہ امریکہ کو ترجیح دینے لگا اور وزیراعظم روس کوسیجن کے دوبار دورہ پاکستان کے باوجود پاکستان نے روس کی دوستی کو نظرانداز کیا نیز پاکستان نے روس کے ایشیائی تحفظ کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کیا تو روس کا طرز عمل کافی سخت ہو گیا نیز چین اور امریکہ سے پاکستان کے بڑھتے ہوئے تعلقات بھی روس کو ناگوار گزرے۔ روس نے 1971ء کی جنگ میں بھارت کی کھل کر حمایت کی۔ روس بھارت دوستی کا معاہدہ 1971ء بھارتی افواج کو مضبوط بنانے کا باعث بنا۔

1971ء کے بعد تعلقات: پاکستان میں بھٹو حکومت کے قیام کے بعد روس سے تعلقات کا نیا باب شروع ہوا۔ دونوں ممالک کے سربراہوں نے دورے کیے۔

(i) روس نے آسان شرائط پر پاکستان کو ترقیاتی مقاصد کے لیے قرضے دیے۔

(ii) پاکستان فوجی معاہدوں سے دستبردار ہو گیا اور دو طرفیت کے اصول پر عمل کرنے لگا۔

(iii) روس نے کراچی کے قریب سٹیل ملز کے عظیم منصوبہ کے لیے وسائل مہیا کیے۔

(iv) روس کی مدد سے کشمور کے راستے کراچی سے پشاور تک شاہراہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔

(v) روس نے ٹیکنالوجی اور سائنس میں ترقی کے لیے پاکستان کو مدد کی پیشکش کی۔

روس کی افغانستان میں مداخلت: 1979ء میں روس نے افغانستان میں براہ راست فوجی مداخلت کی تو افغان عوام نے جہاد شروع کر دیا۔ پاکستان اور امریکہ نے کھل کر مجاہدین کا ساتھ دیا۔ پاک روس تعلقات میں نئے سرے سے بگاڑ پیدا ہو گیا۔ روسی عزائم بے نقاب ہوئے۔ گرم پانیوں تک پہنچنے کا روسی خواب پاکستان کے لیے پریشان کن تھا کیونکہ افغانستان کے بعد پاکستان کو اگلا نشانہ بننا تھا اس لیے پاکستان نے افغانستان میں روسی منصوبوں کو ناکام بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ روس کو جنگ میں شکست ہوئی اور یہ شکست خود اس کے اندر توڑ پھوڑ کا باعث بنی۔

وسط ایشیا میں نئے مسلم ممالک وجود میں آ گئے۔ روس سے پاکستان کے تعلقات مزید

پیچیدہ ہوئے۔

موجودہ صورتحال: روس نئی صورتحال میں پاکستان سے بہتر تعلقات کے قیام کی خواہش کر سکتا ہے لیکن اس میں بھارت روس تعلقات مزاحم ہوں گے۔ روس اپنی خارجہ پالیسی کو نئے حالات کے مطابق ڈھال رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں پاک روس تعلقات اچھی صورت اختیار کر لیں۔

مسلم دنیا اور پاکستان

پاکستان کی تخلیق اسلام کے نام پر ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے اسلام ازم کا جو خواب دیکھا تھا۔ پاکستان اس کی تعبیر بنا۔ پاکستان کے عوام نے عالمی سطح پر اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے دیگر اسلامی ممالک کی طرف دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا۔ قائداعظم نے مسلمانان عالم کے درمیان قریبی رشتوں کے قیام پر زور دیا تھا۔ پاکستان کے دساتیر میں مسلم ممالک سے دوستانہ رابطوں کے قیام کی پالیسی کو بنیادی نقطہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلامی دنیا کے اتحاد کے لیے پاکستان نے خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد پاکستان میں ہوا۔ پاکستان نے مسلم ممالک کے مسائل میں خصوصی دلچسپی لی۔ قبرص، بیت المقدس اور افغانستان سمیت تمام تنازعات میں پاکستان نے مسلم ممالک کے موقف کی حمایت کی۔ مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کرنے کی اسرائیل کی ناپاک کوشش کی مذمت کی۔ اسلامی ممالک کے سربراہوں کی "رباط کانفرنس" بلانے کی تجویز کے حق میں پاکستان نے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ دوسری کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تو پاکستان نے اسلامی اتحاد کے لیے گہری دلچسپی لی۔ بعد ازاں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں بھی پاکستان کا کردار مثبت رہا۔

پاکستان نے تمام ممالک سے رابطے بڑھائے ہیں۔ ماضی میں افغانستان اور مصر سے تعلقات کسی حد تک کشیدہ رہے لیکن موجودہ کیفیت حوصلہ افزا ہے آج کسی بھی مسلم ملک سے کوئی تنازعہ نہیں پایا جاتا۔ سابق سوویت یونین نے امریکہ کے خلاف علیحدہ بلاک بنا رکھا تھا تو عراق، الجزائر، لیبیا اور یمن امریکہ مخالف بلاک میں شامل تھے۔ اب صورت احوال بدل چکی ہے۔ اشیا اور افریقہ کے تمام مسلم ممالک سے پاکستان کے تعلقات بہت عمدہ ہیں اسلامی ممالک نے کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کی حمایت جاری رکھی ہوئی ہے۔ وسطی ایشیائی اسلامی ریاستوں کی آزادی کے بعد اسلامی ممالک میں مزید وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ان ریاستوں سے پاکستان کے رابطے بڑے دوستانہ اور برادرانہ ہیں۔

پاک افغان تعلقات

دونوں ممالک میں گہرے اور قدیم مذہبی ثقافتی اور تاریخی رشتے موجود ہیں۔ برصغیر میں آکر بسنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد درہ خیبر ہی کے راستے افغانستان سے پاکستان کے علاقے میں آئی ان بنیادوں کے باوجود افغانستان نے ہمیشہ بھارت کی شہ پر تنازعات کو جنم دیا۔

تعلقات میں خرابی : افغانستان نے ڈیورنڈ لائن کو مسترد کرتے ہوئے پاکستان کے زیر کنٹرول قبائلی علاقے پر اپنا حق جتا دیا۔ بھارت اور روس نے سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر افغانستان کی پشت پناہی کی حالانکہ 1893ء میں بین الاقوامی معاہدے کے ذریعے برطانوی ہند اور افغانستان کی سرحد ڈیورنڈ لائن کے نام سے متعین کر دی گئی تھی۔ پاکستان کے خلاف پختونستان کا سٹنٹ شروع کر کے افغانستان نے مشکلات پیدا کر دی۔ 1955ء میں پاکستانی سفارت خانے پر حملے کرائے گئے اور جھنڈے کی توہین کی گئی۔ مظاہرے بھی ہوئے اور پاکستانی سفارتی عملے کو واپس بلا لیا گیا۔ ایران، ترکی اور سعودی عرب جیسے دوستوں نے حالات کو سنوارنے کی کوشش کی۔ پاکستان کے صدر اور وزیراعظم نے کابل اور افغان وزیراعظم نے پاکستان کا دورہ کیا۔ کچھ مدت حالات ٹھیک رہے لیکن بھارت اور سوویت یونین کی شہ پا کر افغانستان دوبارہ مسائل پیدا کرنے لگا۔

راہداری کی سہولت : افغانستان کی اپنی کوئی بندرگاہ نہیں اس لیے غیر ممالک سے تجارت میں اسے دشواریوں کا سامنا رہا ہے۔ پاکستان نے خیر سگالی کے طور پر افغانوں کو اپنی سرزمین کے راستے مال لانے اور لے جانے کی سہولت ایک معاہدہ کے ذریعے مہیا کر دی۔ پاکستان نے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوششیں جاری رکھیں لیکن افغان حکومت کو بھارت اور سابق سوویت یونین گمراہ کرتے رہے۔ دونوں ممالک کے درمیان سفارتی سرگرمیاں معطل ہوتی رہیں۔ اور دوست ممالک بار بار بحال کراتے رہے۔ اس مقصد کے لیے ایران کی مدد سے معاہدہ تہران پر دستخط بھی ہوئے اور تعلقات کو معمول پر لایا گیا۔ اسلامی ممالک کی تنظیم نے بھی اس سلسلے میں مثبت کردار ادا کیا۔

روسی مداخلت : 1979ء میں حالات نے پلٹا کھایا۔ روسی افواج افغانستان کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے اس کی حدود میں داخل ہو گئیں۔ ان ہی دنوں ایرانی انقلاب رونما ہوا۔

روسی افواج کی مداخلت کے خلاف افغانستان میں جہاد کا عمل شروع ہو گیا۔ پاکستان نے روس جیسی سپرپاور کے مقابل آنے والے مجاہدین کو اخلاقی' سیاسی اور فوجی امداد مہیا کی۔ پاکستان نے 40 لاکھ افغانوں کو اپنے ہاں پناہ دی۔ پاکستان کے اس رویے سے اپنائیت کا احساس بڑھا۔ افغان مجاہدین کو تاریخی فتح نصیب ہوئی اور افغانستان میں روسی اثر و نفوذ ختم ہو گیا۔ آزادی کے حصول کے بعد افغان کئی گروپوں میں بٹ گئے ہیں جس سے امن بحال نہیں ہو رہا۔ بہرحال پاکستان سے افغانستان کے تعلقات کافی خوشگوار ہو گئے ہیں۔ مستقبل میں جو بھی حکومت تشکیل پائے گی۔ پاکستان سے بہتر تعلقات کی خواہش مند ہو گی۔ دونوں ممالک اب کئی شعبوں میں تعاون کر رہے ہیں۔ ایکو میں افغانستان کی شمولیت کے بعد تعلقات کا ایک نیا باب کھلا ہے۔

پاک ایران اور ترکی تعلقات

ایران اور ترکی کے ساتھ پاکستان کے تاریخی' تہذیبی' مذہبی اور ثقافتی تعلقات کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ عربی اور فارسی نے اردو اور دیگر مقامی زبانوں کو بہت متاثر کیا۔ بڑی تعداد میں ایرانی باشندے وقتاً" فوقتاً" برصغیر آ کر آباد ہوتے رہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے 1919ء میں تحریک خلافت کے ذریعے ترکوں سے ہم آہنگی کا جو مظاہرہ کیا تھا آج بھی دونوں اقوام کے درمیان جذباتی تعلق کا باعث بنا ہوا ہے۔ پاک ایران اور ترکی کے درمیان دوستی مثالی ہے۔ ایران پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو تسلیم کیا۔ 1956ء میں ایک معاہدے کے ذریعے پاک ایران سرحد کا تعین کر کے مستقبل میں خوشگوار رابطہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔

معاہدات : پاکستان' ایران اور ترکی میں درج ذیل معاہدے طے پائے۔

(i) 1951ء میں پاک ترک دوستی کا معاہدہ لکھا گیا جسے 1954ء میں وسیع تر شکل دے کر تجارتی' ثقافتی اور دفاعی شعبوں میں تعاون کا عہد کیا گیا۔

(ii) 1955ء میں ایران بھی ترک پاکستان معاہدہ کا فریق بن گیا۔

(iii) تینوں ممالک کے معاہدہ میں بعدازاں عراق اور برطانیہ بھی شامل ہو گئے اور اسے معاہدہ بغداد کا نام دیا گیا۔ 1958ء میں عراقی انقلاب کے بعد حکومت عراق معاہدہ سے دستبردار ہو گئے تو معاہدہ کو سنٹو کا نام ملا۔ سنٹو کو بھی انقلاب ایران کے بعد ختم کر دیا گیا تاہم پاکستان ایران اور ترکی کے درمیان دفاع سمیت تمام شعبوں میں تعاون کا سلسلہ جاری رہا۔

تعاون کی کوششیں:

(i) تینوں ممالک کے سربراہوں میں باہمی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں' دورے بھی کرتے ہیں اور اہم سیاسی اقتصادی فوجی اور دیگر امور پر مذاکرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہر اہم موقع پر باہمی مشورے روایت بن چکے ہیں۔

(ii) پاکستان نے قبرص کے بارے میں ترکی کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیشہ حمایت کی۔

(iii) ترکی اور ایران نے کشمیر کے تنازعہ کے حوالے سے ہر فورم پر پاکستان کا ساتھ دیا ہے۔ دونوں ممالک بھارتی ظلم اور جبر کی مذمت کرتے ہیں۔

(iv) 1977ء میں تینوں ممالک نے دو طرفہ بنیادوں پر مشترکہ وزارتی کمیشن ترتیب دیے تاکہ صنعت' تجارت' ٹیکنالوجی اور دیگر شعبوں میں تعاون کو بڑھایا جا سکے۔

معاہدہ استنبول: 1964ء میں تینوں ممالک نے استنبول میں ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے علاقائی تعاون برائے ترقی' کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی تنظیم کے تحت کئی شعبوں میں قابل تحسین پیش رفت ہوئی۔ انقلاب ایران کے ساتھ تنظیم کو ختم کر دیا گیا۔ ایران کے داخلی حالات درست ہوئے تو ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ ایکو کے نام سے اس تنظیم میں ایران' ترکی اور پاکستان کے علاوہ وسطی ایشیا کے چھ ممالک اور افغانستان بھی شامل ہے۔

پاک سعودی عرب تعلقات

سعودی عرب سے پاکستانی عوام کا جذباتی لگاؤ ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کا روحانی مرکز ہے۔ توحید کا پیغام یہاں سے ہی دنیا بھر میں پھیلا۔ سعودی عرب سے 1947ء سے ہی پاکستان کے بہت دوستانہ تعلقات قائم ہیں اور ان میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

سربراہوں کے دورے: سعودی عرب کے کئی تاجدار یکے بعد دیگرے پاکستان تشریف لاتے رہے ہیں شاہ فیصل کے دور میں تو تعلقات اپنی معراج کو پہنچ گئے۔ 1966ء میں وہ آئے تو فرمایا "اب جنگ ہو گی تو ہم پاکستان کے شانہ بہ شانہ لڑیں گے' پاکستان پر حملہ سعودی عرب پر حملہ متصور ہو گا"۔ شاہ فیصل سے عقیدت کی وجہ سے پاکستان کے ایک شہر کا نام لائل پور سے بدل کر فیصل آباد رکھ دیا گیا۔ شاہ نے پاکستان کو اسلام آباد کی شاہ فیصل مسجد اور اسلامی مرکز کی تعمیر کے لیے کثیر رقوم عطا کیں۔

مالی امداد: سعودی عرب نے پاکستان کے زرعی، صنعتی اور دیگر ترقیاتی منصوبوں کے لیے قرضے دیے۔

(i) سیمنٹ، کھاد اور کئی دوسری صنعتوں کے قیام میں مدد دی ہے۔
(ii) زکوٰۃ کے لیے سعودی عرب نے 2 ارب روپے پاکستان کو سونپ دیے۔
(iii) ایٹمی توانائی کے منصوبے کی تکمیل کے لیے سعودی عرب نے خطیر رقم دی۔

سیاسی رابطے:

(iv) سعودی عرب نے کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کی ہمیشہ حمایت کی ہے۔
(v) مشرق وسطیٰ اور افغانستان سمیت تمام بین الاقوامی تنازعات پر دونوں ممالک کا ایک سا موقف ہے۔
(vi) دونوں کو باہم قریب آنے میں سعودی عرب نے قابل تحسین کردار ادا کیا۔

دفاعی تعاون:

(vii) سعودی عرب نے پاکستان کی دفاعی افواج کو مضبوط بنانے کے لیے مدد دی۔
(viii) 1965ء اور 1977ء کی جنگوں میں سیاسی، اخلاقی اور سفارتی سطح پر پاکستان کا ساتھ دیا۔
(ix) پاکستان نے سعودی افواج کی تربیت کے لیے ہر ممکن تعاون کیا۔
(x) سعودی عرب کے دفاع کے لیے پاکستان کی افواج سعودی عرب میں مقیم رہیں۔
(xi) عراق کویت تنازعہ کے دوران پاکستان نے سعودیہ کے دفاع کے لیے اپنے تعاون کا مکمل یقین دلایا۔ وہاں اپنے دستے بھی بھیج دیے۔
(xii) 1974ء کی سلامی سربراہی کانفرنس میں شاہ فیصل نے پاکستان کے ساتھ یکجہتی کا عظیم مظاہرہ کیا۔ انہوں نے فرمایا "میں مسلمان ہوں اور میرا پاکستان سے وہی تعلق ہے جو سعودی عرب سے ہے"۔

پاکستان اور تیسری دنیا

Pakistan and Third World

تیسری دنیا سے قریبی رابطوں کا قیام پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم حصہ ہے۔

تیسری دنیا ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ممالک پر مشتمل ہے۔ یہ علاقے ماضی میں یورپی استعمار کا شکار رہے ہیں اس لیے ان کے دکھ درد ملتے جلتے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی نیو ورلڈ آرڈر کے حوالے سے ان علاقوں کو خدشات محسوس ہو رہے ہیں۔ پاکستان تیسری دنیا کے ممالک کے اتحاد اور یک جہتی کا خواہاں ہے۔ اس لیے اتحاد کے لیے جب بھی کوئی تحریک ابھری ہے' پاکستان نے اس کا ساتھ دیا ہے اور اپنا کردار ادا کیا ہے۔

(i) 1955ء میں بنڈونگ کانفرنس منعقد ہوئی تو پاکستان نے تیسری دنیا سے ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا۔ افریشیائی اتحاد کے لیے پاکستان نے چین' مصر' گھانا اور انڈونیشیا کے ساتھ مل کر کام کیا۔

(ii) غیر جانبدار ممالک کی تحریک تیسری دنیا کو اکٹھا کرنے کی کوشش ہے۔ پاکستان اس تحریک کا رکن ہے اور خاصا فعال کردار ادا کرتا چلا آرہا ہے۔

(iii) تیسری دنیا کی اقوام کی جدوجہد آزادی میں پاکستان نے ان کا سیاسی و اخلاقی طور پر بھرپور ساتھ دیا ہے۔ انڈونیشیا' لیبیا' الجزائر' تیونس' مراکش' نائیجریا' یوگنڈا' گھانا' مالی' ویت نام' کوریا اور وسطی ایشیائی ریاستوں سمیت بہت سی افریشیائی اقوام کے حق میں بین الاقوامی اداروں میں آواز بلند کی۔

(iv) گروپ آف 77 تیسری دنیا کے ممالک کی ہی ایک تنظیم بنائی گئی۔ پاکستان نے اس کی تشکیل میں بڑا موثر کردار ادا کیا۔ ساتھی ریاستوں نے پاکستان کی کاوشوں کو دیکھتے ہوئے اسے گروپ کا چیرمین منتخب کر لیا۔ یہ تیسری دنیا کی طرف سے پاکستان کی خدمات کا اعتراف تھا۔

(v) پاکستان نے ہمیشہ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی تنظیموں میں تیسری دنیا کے حقوق کے لیے آواز بلند کی ہے۔ پاکستان چاہتا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک اپنے مسائل حل کرنے کے لیے متحدہ طور پر کوشاں ہوں۔ قائداعظمؒ نے بھی قوم کے نام پیغام میں فرمایا تھا "میں ایشیائی اقوام میں ہم آہنگی' مقصد کی وحدت اور مکمل افہام و تفہیم پر زور دیتا ہوں کیونکہ ایشیائی اتحاد عالمی امن اور خوش حالی کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

پاکستان چاہتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے چھوٹے بڑے تمام ممالک فیضیاب ہوں۔ بیماری' سیلاب اور قحط جیسی آفات کا نشانہ تیسری دنیا کے ممالک ہی بنتے ہیں۔ ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے عالمی سطح پر ہر کوشش کا پاکستان نے بھرپور ساتھ

دیا ہے۔

اقوام متحدہ میں پاکستان کا کردار

Pakistan's Role in United Nations

ستمبر 1947ء میں پاکستان کو اقوام متحدہ کا رکن بنایا گیا۔ ابتدا سے اب تک پاکستان عالمی ادارے سے بھرپور تعاون کر رہا ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ ظفراللہ خان نے عالمی برادری کو یقین دلاتے ہوئے کہا "میں اقوام متحدہ کے ارکان کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان پائیدار امن کی خاطر اپنی تمام تر کوششیں کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اقوام عالم کے درمیان اچھے مراسم استوار ہوں۔" پاکستان کا کردار ہمیشہ مثبت اور اصولوں پر مبنی رہا ہے۔ پاکستان نے قوام متحدہ کے فیصلوں کا ہر صورت میں احترام کیا ہے۔ پاکستان کی اقوام متحدہ کے لیے خدمات کا ہم ذیل میں جائزہ لیتے ہیں۔

1- **امن کے لیے تعاون:** پاکستان نے کشمیر اور افغانستان سمیت تمام بین الاقوامی تنازعات کو پرامن اور مہذب انداز میں حل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کیا ہے۔ بھارت نے جارحانہ اقدام اٹھائے لیکن پاکستان نے 1948ء، 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے حوالے سے اقوام متحدہ کے تمام فیصلے تسلیم کیے۔

2- **تیسری دنیا کا نقیب:** ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ سے تعلق رکھنے والے تیسری دنیا کے ممالک ماضی میں مغربی طاقتوں کی غلامی کا شکار رہے۔ پاکستان نے اپنی آزادی کے حصول کے بعد ہمیشہ ان مظلوم اقوام کے لیے ہر فورم پر اپنا کردار نبھایا ہے۔ پاکستان نے عالمی ضمیر کو پسماندہ قوموں کی آزادی کے لیے جھنجوڑا ہے۔ پاکستان تیسری دنیا کے مفادات کو بچانے کے لیے نئے عالمی اقتصادی نظام کا نعرہ بلند کرتا رہا ہے اور اس نے ہمیشہ مغربی دنیا کی اجارہ داریوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ پاکستان نے انڈونیشیا، لیبیا، الجزائر، تیونس اور اریٹریا سمیت افریشیائی اقوام کی جدوجہد آزادی کے حق میں اقوام متحدہ میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

3- **تخفیف اسلحہ:** پاکستان عالمی ادارے کی طرف سے اسلحہ کی دوڑ کے خلاف سرگرمیوں میں تعاون کی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے۔ پاکستان مطالبہ کرتا آرہا ہے کہ بحر ہند کو

ایٹم سے پاک علاقہ قرار دیا جائے۔ پاکستان تخفیف اسلحہ کی خاطر عالمی سطح پر امن پسند قوموں سے ہر ممکن تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہا ہے۔

4- **پاکستانی ماہرین کی خدمات:** پاکستان سے بہت سارے باصلاحیت ماہرین اقوام متحدہ کے مختلف اداروں اور ایجنسیوں میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔

5- **اقوام متحدہ کے لیے پاکستانی دستے:** پاکستان کے فوجی دستے اقوام متحدہ کی امن فوج میں شامل ہو کر متعدد ممالک میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ انڈونیشیا کانگو' کویت' صومالیہ سمیت پاکستانی افواج نے کئی علاقوں میں اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے قیام امن کے لیے تعاون کیا۔ پاکستانی دستے ہیٹی میں بھی بھیجے گئے۔

6- **نسلی امتیاز کی مخالفت:** پاکستان انسانی مساوات اور بھائی چارے کے فروغ کے لیے کوشاں رہا ہے۔ اقوام متحدہ نے جنوبی افریقہ' رہوڈیشیا اور موزنبیق میں سفید فاموں کے ہاتھوں سیاہ فاموں کے خلاف نسلی امتیاز کی مخالفت کی۔ پاکستان اور دیگر ہم خیال ممالک کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یکے بعد دیگرے تمام علاقوں سے نسلی امتیاز کو مٹا دیا گیا ہے اور سفید و سیاہ فام لوگوں کو مساوی حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔

7- **حق خودارادیت کی حمایت:** پاکستان نے ہمیشہ نو آبادیاتی نظام کی مخالفت کی ہے اور تمام اقوام کو ان کی مرضی کے مطابق رہنے کا حق دلانے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ اقوام متحدہ بھی حق خودارادیت کی حامی ہے اور پاکستان اس اصول کی فتح کے لیے اقوام متحدہ سے تعاون کرتا چلا آرہا ہے۔ کشمیر' فلسطین' اریٹریا' ویت نام' افغانستان اور کمپوچیا سمیت کئی اقوام کے حق خودارادیت کی خاطر پاکستان نے دلیرانہ موقف اختیار کیا۔

8- **اقوام متحدہ کی ایجنسیاں:** اقوام متحدہ قوموں کی معاشی' معاشرتی' ثقافتی اور سائنسی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ ان مقاصد کے لیے عالمی ادارے کئی ایجنسیوں کا رکن ہے۔ پاکستان کو ان ایجنسیوں کی مالیاتی اور فنی معاونت حاصل رہی ہے۔ خود پاکستان نے ان ایجنسیوں سے ہر ممکن تعاون کیا ہے اور اپنے ماہرین کی خدمات مہیا کی ہیں۔ کئی ایجنسیوں کے ذیلی دفاتر پاکستان میں قائم ہیں۔

اسلامی سربراہی کانفرنس

Organization of Islamic Cemmit

جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال نے اسلامی دنیا کے اتحاد کا خواب دیکھا تھا۔ یورپ کی قوم پرستانہ تحریک کے زیر اثر مختلف مسلم ریاستوں میں زبان، نسل اور علاقے کی بنیاد پر قوم پرستی کے رجحانات نے فروغ پایا۔ مغربی ممالک نے بھی اسلامی ریاستوں کو متحد نہ ہونے دیا۔ جنگ عظیم دوم بعد مسلمان مختلف بلاکوں میں منقسم رہے۔ بعض مسلم ممالک میں ملوکیت کا نظام بھی اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا ہے۔

اسلامی کانفرنس کا قیام: دنیا بھر کے مسلمانوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ امت مسلمہ ایک مرکز پر اکٹھی ہو جائے۔ یہ خواب یہودیوں کی چیرہ دستیاں بڑھنے سے شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ فلسطینی مسلمانوں کے حقوق کی خاطر دنیا بھر میں مسلمان مضطرب تو تھے ہی 1969ء میں مسجد اقصیٰ کو یہودیوں نے آگ لگائی تو اس مذموم حرکت کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے مسلمان اکٹھے ہونے پر مجبور ہو گئے۔ مصلحتوں کی شکار مسلم ریاستیں ایک مرکز پر آنے کو تیار ہوئیں۔ عرب وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ تمام مسلم ریاستوں کے سربراہوں کا مشترکہ اجلاس بلایا جائے۔ فیصلے پر عمل کرتے ہوئے رباط میں اجلاس بلا لیا گیا۔ شاہ مراکش کی صدارت میں مسجد اقصیٰ کے سانحے پر غور کرنے کے لیے عظیم اجتماع ہوا تو سربراہوں نے ایک مستقل ادارے کے قیام کا فیصلہ کرلیا اس تنظیم کا نام اسلامی سربراہی کانفرنس رکھا گیا۔ مسلمانوں کو درپیش مسائل پر غور کرنے کے لیے اس تنظیم کے کئی اجلاس منعقد ہو چکے ہیں۔

پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس رباط 1969ء: کانفرنس میں کل 24 ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ شاہ فیصل، شاہ ایران، شاہ حسین، بومدین، قذافی اور یحییٰ خان نے اپنے اپنے ممالک کی نمائندگی کی۔ کانفرنس میں اسرائیل کی مذمت کی گئی۔ مسجد اقصیٰ کو آگ لگانے کی ناپاک جسارت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار قرارداد کی منظوری کی صورت میں کیا گیا۔ ایک اور قرارداد میں 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کے قبضے میں چلے جانے والے علاقوں کو واگزار کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔

دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور 1974ء: کل چالیس ممالک کے نمائندے کانفرنس

میں تشریف لائے۔ میزبانی کے فرائض پاکستان نے انجام دیے۔ یہ مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور تاریخی اجتماع تھا۔ شاہ فیصل' معمر قذافی' حافظ الاسد' یاسر عرفات' مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے شرکت کی۔ عرب لیگ مؤتمر عالم اسلامی اور رابطہ عالم اسلامی کے نمائندوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ کانفرنس اسلامی اخوت کی دیدہ زیب مثال تھی۔ فلسطینیوں کے حقوق' مقبوضہ عرب علاقوں کی بازیابی' اسلامی اتحاد و یکجہتی' تیسری دنیا سے ہم آہنگی اور بیت المقدس کو مسلمانوں کے کنٹرول میں دیے جانے کے حق میں قراردادیں منظور کی گئیں۔

تیسری اسلامی سربراہی کانفرنس مکہ 1981ء : شاہ خالد کی صدارت میں تیسری کانفرنس مکہ میں منعقد ہوئی۔ مصر اور افغانستان کے علاوہ باقی تمام مسلم ممالک اور کئی اسلامی تنظیموں کے وفود کانفرنس میں شریک ہوئے۔ چار دن اجلاس جاری رہا اور آخر میں اعلان پر تمام ارکان نے دستخط کیے۔ فیصلے کیے گئے کہ اقوام متحدہ سے ان کے قیام کے لیے تعاون کیا جائے گا۔ اسلامی ممالک کے باہمی اختلافات کو گفت و شنید اور اسلامی جذبے کے تحت حل کیا جائے گا۔ غیر وابستہ تحریک' نیز تیسری دنیا کے ممالک سے ہم آہنگی کا اظہار ہو گا اور دنیا بھر میں آزادی' انصاف اور رواداری جیسی اعلیٰ قدروں کے فروغ کی مشترکہ کوششیں کی جائیں گی۔

چوتھی اسلامی سربراہی کانفرنس کاسا بلانکا 1984ء : مراکش کے شہر کاسابلانکا میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں 42 ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے علاوہ کئی اسلامی تنظیموں کے نمائندوں کو شرکت کا موقع ملا۔ کانفرنس میں فلسطین' مسلم قبرص اور نمیبیا کے عوام کے حقوق کے لیے قراردادیں منظور کی گئیں۔ اسلامی ممالک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے' سائنس کو ترقی دینے اور اسلامی دنیا کے مسائل کو اجتماعی کوششوں کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا گیا۔ 1979ء میں مصر کو کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے پر دستخط کرنے کی وجہ سے اسلامی سربراہی کانفرنس سے نکال دیا گیا تھا۔ پاکستان کی کوششوں سے اس کی رکنیت بحال ہوئی۔ افغان مجاہدین کی روسی افواج کے خلاف جدوجہد کے حوالے سے غور و فکر کیا گیا اور روسی افواج کی واپسی کا مطالبہ پیش ہوا۔

پانچویں اسلامی سربراہی کانفرنس کویت 1987ء : کل 44 ممالک کے نمائندے پانچویں کانفرنس میں شریک ہوئے۔ صدارت امیر کویت نے کی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری

جنرل اور کئی تنظیموں کے وفود اجلاس میں موجود رہے۔ کانفرنس میں عراق ایران جنگ، مشرق وسطیٰ کے مسائل، روسی افواج کی افغانستان میں موجودگی، فلسطین کی آزادی اور اقتصادی تعاون کے منصوبوں پر غور کیا گیا۔ متعدد قراردادیں بھی منظور ہوئیں۔ اسلامی بین الاقوامی عدالت کے قیام اور طریق کار کے متعلق بنیادی نکات طے پائے۔

چھٹی اسلامی سربراہی کانفرنس ڈاکار 1993ء: یہ کانفرنس ہنگامی طور پر جنوری 1993ء میں سینیگال کے دارالحکومت ڈاکار میں بلائی گئی۔ اجلاس بلائے جانے کی درخواست گیارہ رکن ممالک نے دی تھی۔ بوسنیا میں مسلمانوں پر ہونے والے سفاکانہ قتل عام کی مذمت کرنے اور عالمی سطح پر بوسنیا کے علاوہ کشمیر، فلسطین اور بابری مسجد کی شہادت کے مسئلوں پر بھی بحث ہوئی۔ اجلاس میں پچاس مسلم ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ امت مسلمہ کے اتحاد کی ضرورت پر خصوصی زور دیا گیا۔

ساتویں اسلامی سربراہی کانفرنس کاسابلانکا 1994ء: کاسابلانکا میں دوسری بار کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ شرکاء میں 53 مسلم ممالک کے نمائندے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ دو روزہ کانفرنس میں 50 سے زیادہ قراردادیں منظور کی گئیں۔ اہم قراردادیں کشمیر، بوسنیا، فلسطین، اور عالم اسلام میں اقتصادی روابط کی ترویج سے متعلق تھیں۔ وزیراعظم پاکستان نے خطاب میں آذربائیجان، فلسطین، بوسنیا اور کشمیر میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا تفصیلی ذکر کیا۔ کشمیر کے حوالے سے بتایا کہ 40000 مسلمانوں کو شہید کیا جاچکا ہے اور ہزاروں خواتین کی آبروریزی کی گئی ہے۔ وزیراعظم نے عالمی برادری سے کشمیری مسلمانوں کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی امداد کے لئے کہا۔

آٹھویں اسلامی سربراہی کانفرنس: آٹھویں اسلامی سربراہی کانفرنس دسمبر 1997ء میں ایران کے دارالحکومت تہران میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پچپن (55) اسلامی ممالک کے حکمران یا ان کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس نے عالم اسلام کو درپیش مسائل پر 142 قراردادوں کی منظوری دی۔ کانفرنس کے اختتام پر اعلان تہران جاری کیا گیا۔ جس میں کشمیریوں کی جدوجہد کی مکمل حمایت اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حق خودارادیت دلانے، مسلمان ممالک میں باہمی کشیدگی اور اختلافات مذاکرات کے ذریعے ختم کرانے، اسلامی مشترکہ تجارتی منڈی کے قیام، سلامتی کونسل میں او۔ آئی۔ سی۔ کو نمائندگی دلانے، افغانستان میں خانہ جنگی روکنے اور وسیع البنیاد حکومت کے قیام، مشرق وسطیٰ کو ایٹمی اسلحہ سے پاک علاقہ قرار دینے فلسطین پر اسرائیلی قبضے کی مذمت اور توہین رسالت کو روکنے کے لئے بین الاقوامی دستاویز تیار کرنے پر زور دیا گیا۔

اقتصادی تعاون کی تنظیم

Economic Co-operation Organization

تشکیل: ایکو (E.C.O) ایک علاقائی تنظیم کے روپ میں 1885ء میں تشکیل پائی- ابتدا میں ترکی' ایران اور پاکستان پر مشتمل تھی- نومبر 1992ء میں سات مزید مسلم ریاستوں کو ایکو کی رکنیت مل گئی آج یہ تنظیم درج ذیل دس ریاستوں پر مشتمل ہے- پاکستان' ایران' ترکی' افغانستان' آذربائیجان' ازبکستان' کرغزستان' ترکمانستان' قازقستان اور تاجکستان' وسطی ایشیائی ریاستوں اور افغانستان کی شرکت کے بعد اب یہ ایک وسیع اور مضبوط تنظیم بن گئی ہے-

ترکی اور ایران نے 1947ء میں پاکستان کے وجود کو عالمی برادری میں سب سے پہلے تسلیم کیا- آج تک تینوں ممالک بڑے قریبی اور قابل اعتماد دوست کی حیثیت سے پہچان رکھتے ہیں- ایکو کے قیام سے پہلے پاکستان ایران اور ترکی نے باہم مل کر 1964ء میں معاہدہ استنبول پر دستخط کیے- شاہ ایران' عصمت انونو اور ایوب خان نے معاہدہ کے تحت اقتصادی تعاون کے لیے ایک مستقل ادارے کی بنیاد رکھی- ادارے کا نام آر-سی-ڈی یعنی علاقائی تعاون برائے ترقی رکھا گیا- تینوں ممالک نے دفاعی مقاصد کے لیے سنٹو نامی دفاعی معاہدہ کیا ہوا تھا- اقتصادی تعاون کے لیے آر-سی-ڈی بھی قائم کر دیا- یہ ادارہ ابتدائی سالوں میں کافی حد تک کامیاب ثابت ہوا لیکن بعض بدلے ہوئے حالات کے اثرات کے تحت آر-سی-ڈی فعال نہ رہ سکا- ایرانی انقلاب آیا تو آر-سی-ڈی کو ختم کر دیا گیا- علاقائی صورت رفتہ رفتہ بہتر ہو گئی تو تینوں ممالک نے اقتصادی اور دیگر شعبوں میں تعاون کے لیے نئی تنظیم بنانے کا ارادہ کر لیا یوں 1985ء میں ایکو وجود میں آئی-

ڈھانچہ: ایکو درج ذیل اجزاء پر مشتمل ہے-

1- وزراء کی کونسل' 2- خصوصی ایجنسیاں' 3- تیکنیکی کمیٹیاں' 4- علاقائی منصوبہ بندی کونسل' 5- سیکرٹریٹ

ایکو کے دفتری امور طے کرنے' ریکارڈ رکھنے اور اجلاسوں کا اہتمام کرنے کے لیے سیکرٹریٹ موجود ہے جس کا سربراہ سیکرٹری جنرل کہلاتا ہے- سات تیکنیکی کمیٹیاں ہیں-

1- اقتصادی و تجارتی تعاون کی کمیٹی' 2- مواصلات کمیٹی' 3- نارکوٹکس کمیٹی' 4- صنعتی تعاون کی کمیٹی' 5- توانائی کمیٹی' 6- زرعی تعاون کی کمیٹی' 7- پبلک ورکس کمیٹی

اغراض و مقاصد:

1- تجارتی پابندیوں میں کمی کر کے باہمی تجارت کو ترقی دینا-

2- صنعتی شعبے میں باہم رابطوں کا قیام-

3- مواصلات' سائنس اور دیگر شعبوں میں تعاون-

4- انشورنس کمپنی قائم کر کے صنعتی و تجارتی اداروں کو انشورنس سہولتوں کی فراہمی۔

5- رکن ممالک کے شہریوں کے لیے سیاحت کی سہولتیں مہیا کرنا۔

6- مواصلاتی نظام کو جدید خطوط پر ترقی دینا۔ ریلوے لائنوں اور سڑکوں کی تعمیر کرنا۔

7- ڈاک، تار، فیکس، فون، ٹیلکس اور ٹیلی فیکس کی سہولتوں میں اضافہ کرنا۔

8- تیکنیکی ترقی کے لیے باہمی تعاون کرنا۔

9- نشہ آور اشیا کی غیر قانونی تجارت کو روکنا۔

10- ایکو یوتھ فاؤنڈیشن کا قیام تاکہ ثقافتی وفود کے تبادلوں میں آسانی ہو۔

11- ذرائع ابلاغ کے مابین تعاون اور پروگراموں کا تبادلہ۔

12- معاشی اور معاشرتی تعاون کو فروغ دینا۔

13- ہوائی سفر کے لیے سروس کو بہتر بنانا اور ہوائی راستے سے سامان کی ترسیل کی سہولتیں مہیا کرنا۔

14- ایکو ممالک کی مشترکہ جہاز ران کمپنی کا قیام۔

15- پرائیویٹ سیکٹر کی مدد سے انوسٹمنٹ بنک کا قیام۔

16- ایکو سائنس فاؤنڈیشن کا قیام۔

مشکلات : ایکو کا قیام عمل میں لایا گیا تو رکن ممالک نے اس ادارے سے بہت سی توقعات وابستہ کرلیں۔ خیال تھا کہ دس اسلامی ممالک کا یہ اتحاد مسلمانان عالم کی یک جہتی کی طرف ایک بڑا قدم ثابت ہو گا لیکن بعض مشکلات کی وجہ سے مطلوبہ نتائج بر آمد نہیں ہو رہے حالانکہ رقبے، وسائل اور افرادی قوت کے لحاظ سے رکن ممالک ایک دوسرے کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

1- تنظیم کے پاس بینک، انشورنس اور بارٹر کرنسی کی جدید سہولتیں پوری طرح موجود ہیں۔

2- وسطی ایشیائی ریاستیں مدتوں روس سے منسلک رہی ہیں ایک خطے سے تجارتی روابط دوسرے خطے میں منتقل کرنے میں دشواریوں کا سامنا ہے۔

3- افغانستان، تاجکستان، ازبکستان اور آذربائیجان کی داخلی سیاست اور فوجی صورت حال تعاون کی فضا کو خراب کر رہی ہے۔ راستے بھی محفوظ نہیں ہیں۔

4- سڑکوں، ریلوے اور دیگر ذرائع آمد و رفت ابھی مکمل نہیں ہوئے۔ اشیا کی

ترسیل میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں۔

5- امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر بھی ترقی کی اقتصادی تنظیموں کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔

ایکو کی کارکردگی: ایکو کی سربراہ کانفرنس پہلی بار فروری 1992ء میں استنبول میں منعقد ہوئی دوسری سربراہ کانفرنس تہران میں 1993ء میں بلائی گئی اور مارچ 1995ء میں تیسری کانفرنس اسلام آباد میں طلب کی گئی۔ ایکو کی کارکردگی 89-1985ء میں کسی حد تک سست رہی۔ 91-1990ء میں پیش رفت ہوئی، 1991ء میں مشترکہ سرمایہ کاری بینک کے قیام کا اصولی فیصلہ ہوا نیز ایران، ترکی اور پاکستان نے تجارتی مال پر 10 فیصد ڈیوٹی کمی کے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔

تہران کانفرنس میں وسطی ایشیائی ریاستوں کے سربراہوں نے بھی شرکت کی اور مختلف شعبوں میں تعاون کرنے کا فیصلہ ہوا۔ کانفرنس میں کشمیری عوام بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ اور افغان مسئلے کے سیاسی حل پر زور دیا گیا۔ کانفرنس میں فلسطینیوں کے حقوق کی بحالی اور رکن ممالک کے درمیان اقتصادی رابطوں کو مضبوط بنانے کے لیے مشترکہ اعلامیہ میں خصوصی نکات شامل کیے گئے۔

مئی 1992ء میں سربراہوں کا اجتماع اشک آباد میں ہوا۔ توانائی تجارت معدنیات اور صنعت سے متعلق تعاون کے فیصلے ہوئے۔ اس کانفرنس میں تاجکستان اور ازبکستان کے نمائندے موجود نہیں تھے۔

1993ء میں وزارتی سطح کا ایک نمائندہ اجلاس کوئٹہ میں بلایا گیا۔ نئے ارکان کی شمولیت کے بعد نئے سرے سے منصوبہ بندی کی گئی۔ ضرورت محسوس کی گئی کہ 70 لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی 30 کروڑ کے لگ بھگ آبادی کی ریاستوں کی ایک مشترکہ اقتصادی منڈی بنائی جائے۔ تجویز پر غور کرنے کے لیے تیکنیکی کمیٹیاں بنا دی گئیں۔

جولائی 1993ء میں ہی وزرا کی سطح کا ایک اور اجلاس استنبول میں ہوا۔ اجلاس میں ایکو کے طویل المعیادی منصوبوں کی منظوری دی گئی۔

مارچ 1995ء میں اسلام آباد میں تمام رکن ممالک کے سربراہ اکٹھے ہوئے۔ وزیراعظم پاکستان سمیت سربراہوں نے اجلاس کو کامیاب قرار دیا۔ یہ کہا گیا کہ جو کچھ کام ہوا ہے اسے فروغ پذیر علاقائی تعاون کے لیے ٹھوس بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اجلاس میں رکن ممالک کے سربراہوں نے دس سمجھوتوں اور مفاہمت کی یادداشتوں پر اتفاق کیا۔ سمجھوتوں کا

تعلق شپنگ، فضائی رابطوں، تجارت، بنکاری، ٹرانزٹ ٹریڈ اور دوسرے شعبوں سے ہے۔

مستقبل: قریباً" تیس کروڑ آبادی کے دس رکن ممالک دنیا کے ایک اہم ریجن میں واقع ہیں۔ رکن ممالک گہرے ثقافتی، تاریخی اور مذہبی رشتوں میں منسلک ہیں۔ یہ ممالک زمینی اور فضائی راستوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ وسطی ایشیائی ریاستوں میں بعض کو تعلیم، صنعتی ترقی، زرعی پیداوار اور دفاعی صنعتوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ پٹرولیم کی تلاش اور اس کی مصنوعات کی تیاری میں ایران کا اپنا ایک مقام ہے۔ پاکستان نے ایٹمی ٹیکنالوجی میں دسترس حاصل کر لی ہے۔ ترکی کو دفاع کے معاملات میں برتری حاصل ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ایکو ممالک کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں۔ ضرورت انہیں یکجا کرنے اور ٹھوس منصوبہ بندی کے ذریعے ان سے فائدے اٹھانے کی ہے۔ اب تک ایکو ممالک تنظیم کا ڈھانچہ تشکیل دینے میں مصروف رہے ہیں۔ اعلیٰ تر مقاصد کے بارے میں سوچ ہے لیکن یہ ابھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکے۔ ایکو سے عوام کی توقعات بہت ہیں۔ بنیادی تقاضا رکن ممالک میں امن کا قیام ہے۔ افغانستان اور تاجکستان کی خانہ جنگی کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ وسطی ایشیا کی ریاستیں گرم پانیوں تک رسائی حاصل کر سکیں اور تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ ہو۔

ایکو تجارتی اور سیاسی ہی نہیں دفاعی تعاون کے لیے بھی ایک سنگ میل ثابت ہو سکتی ہے۔ ایکو کے ممالک کو قبرص، کشمیر اور نگورنو کاراباخ جیسے تنازعات کا سامنا ہے۔ سربراہوں کے اجلاس میں توقع ظاہر کی گئی ہے کہ 2000ء تک ایک مشترکہ منڈی قائم ہو جائے گی۔ اگر یہ دس ممالک فعال انداز میں تعاون کو آگے بڑھاتے ہیں تو عالم اسلام کا مرکز عرب ممالک سے وسطی ایشیا کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ یہ علاقے یورپ اور ایشیا کے سنگم پر واقع ہیں۔ اشتراک عمل سے تنظیم میں اقتصادی، سیاسی، دفاعی، سائنسی، تیکنیکی اور دیگر شعبوں میں ہمہ گیر ترقی کا باعث بننے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

سوالات

1- پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول بیان کریں؟
2- پاک بھارت تعلقات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں؟
3- پاک چین تعلقات پر تفصیلی نوٹ لکھیں؟
4- پاک امریکہ تعلقات کے پس منظر اور مختلف پہلوؤں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
5- پاک روس تعلقات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
6- افغانستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کا پس منظر اور مختلف پہلوؤں میں تعلقات کی وضاحت کریں؟
7- مسلم دنیا کو پاکستان کی خارجہ میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ مسلم ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کا مجموعی طور پر جائزہ لیں؟
8- سعودی عرب اور پاکستان کے تعلقات کے نمایاں پہلوؤں کی وضاحت کریں؟
9- ترکی اور ایران کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کے اہم پہلوؤں کی وضاحت کریں؟
10- تیسری دنیا میں پاکستان کے کردار کا تفصیلی جائزہ لیں؟
11- اسلامی سربراہ کانفرنس (O.I.C) کی تشکیل اہمیت اور مقاصد کا جائزہ لیں؟
12- اقوام متحدہ اور پاکستان کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیں؟
13- اقتصادی تعاون کی تنظیم (E.C.O) کی تشکیل اہمیت اور مقاصد بیان لیں؟

باب اول

تحریک پاکستان

(ا) درست پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(i) سر سید احمد خاں پیدا ہوئے۔

1816ء میں - 1817ء میں - 1818ء میں

(ii) انگریزوں نے 1857ء کی جنگ آزادی کی ساری ذمہ داری ڈال دی۔

ہندوؤں پر - مسلمانوں پر - سکھوں پر

(iii) سر سید احمد خاں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا۔

1858ء میں - 1859ء میں 1860ء میں

(iv) سر سید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔

1884ء میں - 1886ء میں - 1888ء میں

(v) اردو ہندی تنازعہ شروع ہوا۔

1863ء میں - 1865ء میں - 1867ء میں

(vi) تقسیم بنگال عمل میں آیا۔

1905ء میں - 1906ء میں - 1907ء میں

(vii) آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی۔

1904ء میں - 1906ء میں - 1908ء میں

(viii) سانحہ جلیانوالہ باغ پیش آیا۔

1917ء میں - 1918ء میں - 1919ء میں

(ix) قائداعظم نے اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے۔

1927ء میں - 1928ء میں - 1929ء میں

(x) تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا۔

3 جون 1947ء میں - 14 اگست 1947ء میں - یکم جولائی 1948ء میں

(ب) مختصر جواب دیں۔

(i) سر سید احمد خاں کا انتقال کب ہوا؟

(ii) برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو قانونی کونسل میں نمائندگی کب دی؟
(iii) علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ کب دیا گیا؟
(iv) تقسیم بنگال کو کب منسوخ کیا گیا؟
(v) انڈین نیشنل کانگریس کو کب اور کس نے قائم کیا؟
(vi) منٹو مارلے اصلاحات کب پیش کی گئیں؟
(vii) لکھنؤ پیکٹ کب اور کس کے درمیان ہوا؟
(viii) تحریک خلافت کب شروع ہوئی؟
(ix) رولٹ ایکٹ کا نفاذ کب ہوا؟
(x) مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ کب ہوا؟
(xi) 1927ء میں کون سا کمیشن ہندوستان آیا؟
(xii) نہرو رپورٹ کب پیش کی گئی؟
(xiii) قائداعظم نے اپنے مشہور چودہ نکات کب پیش کیے؟
(xiv) گول میز کانفرنس کب اور کہاں منعقد ہوئیں؟
(xv) علامہ اقبال نے اپنا مشہور خطبہ الہ آباد کب پیش کیا؟
(xvi) کانگریسی وزارتیں کب قائم ہوئیں؟
(xvii) قائداعظم کی اپیل پر یوم نجات کب منایا گیا؟
(xviii) 23 مارچ 1940ء میں مسلم لیگ نے کون سی قرارداد منظور کی؟
(xix) "اب یا کبھی نہیں" رسالہ کب اور کس نے لکھا؟
(xx) سر سٹیفرڈ کرپس مشن کب ہندوستان آیا؟
(xxi) کابینہ مشن پلان کو ہندوستان کب بھیجا گیا؟
(xxii) تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کب کیا گیا؟
(xxiii) سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کب کیا گیا؟
(xxiv) 1960ء میں کس معاہدے کے تحت نہری پانی کا مسئلہ حل ہوا؟
(xxv) خطبات احمدیہ' اسباب بغاوت ہند' تبین الکلام' رسالہ تہذیب الاخلاق' علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ' احکام طعام اہل کتاب' تاریخ سرکشی بجنور اور آثار الصنادید کس مرد مجاہد کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں؟

باب دوم

پاکستان کی سرزمین اور لوگ

(ا) درست پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(i) پاکستان کا رقبہ ہے۔

795095 مربع کلومیٹر - 685075 مربع کلومیٹر - 796096 کلومیٹر

(ii) پاکستان بنیادی طور پر ملک ہے۔

صنعتی - زرعی - اقتصادی

(iii) پاکستان کی آبادی میں سالانہ اضافہ ہو رہا ہے۔

3 فیصد - 5 فیصد - 7 فیصد

(iv) عیدالفطر کا تہوار منایا جاتا ہے۔

یکم شعبان - یکم رمضان - یکم شوال کو

(v) 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں شرح خواندگی تھی۔

قریباً" 24 فیصد - قریباً" 26 فیصد - قریباً" 28 فیصد

(vi) پاکستان کی آبادی کی بڑی تعداد مشتمل ہے۔

مردوں پر - عورتوں پر - بچوں پر

(vii) 1961ء میں پاکستان کی آبادی تھی۔

قریباً" 2 کروڑ - قریباً" 4 کروڑ - قریباً" 6 کروڑ

(viii) پاکستان میں سب سے بڑا پیشہ ہے۔

تجارت - صنعت - زراعت

(ix) پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔

انگریزی - عربی - اردو

(x) پاکستان کے جنوب میں ہے۔

بھارت - افغانستان - بحیرہ عرب

(ب) مختصر جواب دیں۔

(i) پاکستان میں کاشت کی جانے والی اہم فصلوں کے نام لکھیں۔

(ii) پاکستان میں کس قسم کی آب و ہوا ہے؟

(iii) پاکستان میں کوئلہ اور نمک کے ذخائر کہاں واقع ہیں؟

(iv) اہم مذہبی تہواروں کے نام لکھیں۔

(v) پاکستان کا قومی لباس کون سا ہے؟

(vi) پاکستان میں آخری مردم شماری کب ہوئی؟

(vii) 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کی آبادی کتنی تھی؟

(viii) پاکستان کی آبادی میں کس تناسب سے اضافہ ہو رہا ہے؟

(ix) پاکستان کی سرزمین کس قسم کی ہے؟

(x) خاندانی منصوبہ بندی سے کیا مراد ہے؟

باب سوم

آئینی ارتقاء 1947ء تا 1973ء

(ا) درست پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(i) پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔

5 اگست 1947 - 11 اگست 1947ء - 14 اگست 1947

(ii) قرارداد مقاصد اسمبلی میں پیش ہوئی۔

12 مارچ 1949ء - 15 مارچ 1949ء - 18 مارچ 1949ء

(iii) لیاقت علی خاں کو شہید کر دیا گیا۔

11 ستمبر 1951ء - 12 اکتوبر 1951ء - 16 اکتوبر 1951ء

(iv) گورنر جنرل غلام محمد نے پہلی دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔

25 مارچ 1953ء - 24 اکتوبر 1954ء - 23 مارچ 1956ء

(v) ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا۔

1953ء - 1954ء - 1955ء

(vi) پاکستان میں پہلا آئین نافذ ہوا۔

23 مارچ 1956ء - 14 اکتوبر 1958ء - 14 اگست 1962ء

(vii) 1956 کے آئین کے تحت پاکستان کی سرکاری زبان تھی۔

اردو - بنگالی - اردو اور بنگالی دونوں

(viii) جنرل ایوب خاں نے ملک میں مارشل لا نافذ کیا۔

8 اکتوبر 1958ء - 17 فروری 1960ء - یکم مارچ 1962ء

(ix) جنرل یحییٰ نے اقتدار سنبھالا۔

1968ء - 1969ء - 1970ء

(x) پاکستان موجودہ آئین نافذ ہوا۔

23 مارچ 1956ء - یکم مارچ 1962ء - 14 اگست 1947ء

(ب) مختصر جواب دیں۔

(i) جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کا نام کیا ہے؟

(ii) پہلی دستور ساز اسمبلی کے سپیکر کون تھے؟

(iii) پہلی دستور ساز اسمبلی کے ممبران کی تعداد کتنی تھی؟

(iv) خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو کب برطرف کیا گیا؟

(v) دوسری دستور ساز اسمبلی کب بنی؟

(vi) 1956ء کا آئین کتنی دفعات پر مشتمل تھا؟

(vii) ایوب خاں نے ملک کا اقتدار کب سنبھالا؟

(viii) 1962ء کا آئین کب اور کس نے ختم کیا؟

(ix) 1965ء کی پاک بھارت جنگ کس مہینے میں شروع ہوئی؟

(x) ملک میں پہلے عام انتخابات کب منعقد ہوئے؟

باب چہارم

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین 1973ء

(ا) درست پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(i) پاکستان میں نظام مصطفیٰ کی تحریک کب چلائی گئی؟

1975ء - 1977ء - 1979ء

(ii) 1973ء کے آئین کو صدر جنرل ضیاء الحق (مرحوم) نے معطل کیا۔

17 اگست 1976ء - 7 جولائی 1977ء - 25 دسمبر 1978ء

(iii) 1973ء کے آئین کے تحت ملک کا دارالحکومت ہے۔

کراچی - لاہور - اسلام آباد

(iv) 1973ء کا آئین کتنی دفعات پر مشتمل ہے۔

290 - 285 - 280

(v) اب قومی اسمبلی کے ممبران کی تعداد ہے۔

237 - 217 - 207

(vi) ملک کی سب سے بڑی عدالت کون سی ہے۔

الیکشن کمیشن - ہائی کورٹ - سپریم کورٹ

(vii) صدر بننے کے لئے عمر کتنی ہونی چاہیے۔

35 سال - 45 سال - 55 سال

(viii) صدر کے عہدہ کی مدت کتنی ہے؟

5 سال - 6 سال - 7 سال

(ix) سینٹ کے ارکان کی تعداد ہے۔

87 - 77 - 67

(x) وفاقی کابینہ کا قائد ہوتا ہے۔

سپیکر - صدر - وزیراعظم

(ب) مختصر جواب دیں۔

(i) 1973ء کے آئین کے تحت مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کتنے ایوانوں پر مشتمل ہے؟

(ii) قومی اسمبلی کو کتنی مدت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے؟

(iii) قومی اسمبلی میں پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، اسلام آباد اور قبائلی علاقہ جات کی کتنی مسلم سیٹیں ہیں؟

(iv) قومی اسمبلی میں غیر مسلموں کی نشستوں کی تعداد لکھیں۔

(v) قومی اسمبلی کی رکنیت کے لیے عمر کی حد کیا ہے؟

(vi) صوبوں میں گورنروں کا تقرر آئین کے کس آرٹیکل کے تحت ہوتا ہے؟

(vii) ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف کس عدالت میں اپیل کی جا سکتی ہے؟

(viii) اعلیٰ عدالتی کونسل کے ارکان کو کون نامزد کرتا ہے؟

(ix) اسلامی نظریاتی کونسل کے تین فرائض بیان کریں۔

(x) الیکشن کمیشن کے سربراہ کو کیا کہتے ہیں؟

باب پنجم

اصلاحات 1972ء

(ا) صحیح اور غلط میں تمیز کریں۔

1- پاکستان کی 50 فیصد آبادی براہ راست اور بالواسط زراعت سے تعلق رکھتی ہے۔

2- ایوبی دور میں 500 ایکٹر نہری زمین کی حد مقرر کی گئی۔

3- بھٹو کے دور کی اصلاحات میں 150 ایکٹر نہری زمین کی حد مقرر کی گئی۔

4- 1976ء میں مزارعین میں 20 لاکھ ایکٹر زمین تقسیم کی گئی۔

(ب)خالی جگہیں پر کریں۔

1- 1972ء میں 60 فیصد صنعتی اثاثے .... خاندانوں کے ہاتھوں میں تھے۔

2- بھٹو نے زرعی اصلاحات .... میں متعارف کرائیں۔

3- 1977ء میں زرعی ملکیت کی حد .... ایکٹر نہری اور .... ایکٹر بارانی مقرر کی گئی۔

4- بھٹو دور میں .... لاکھ ایکٹر سرکاری زمین بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کی گئی۔

(ج) درج ذیل کے مختصر جوابات دیں۔

1- عشر کا نفاذ کب عمل میں آیا؟

2- زکوٰۃ اور عشر میں کیا فرق ہے؟

3- عشر کی فیصد شرح کیا مقرر ہے؟

4- 1972ء سے 1977ء تک قائم ہونے والی لیبر یونینوں کی تعداد کیا تھی؟

(د) خالی جگہیں پر کریں۔

1- پاکستان میں تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینے کا فیصلہ .... دور میں ہوا۔

2- پاکستان میں سرکاری سطح پر قائم ہونے والی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعداد .... ہے۔

3- علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا مرکز .... میں بنایا گیا۔

4- 1972ء میں قومی تحویل میں لیے جانے والی صنعتوں کی تعداد .... تھی۔

باب ششم

معاشرتی خدمات اور ادارے

(ا) خالی جگہیں پر کریں۔

☆ شعبہ صحت پر پاکستان میں صرف...... فیصد سالانہ خرچ کیا جاتا ہے۔

☆ صدر ایوب خان نے...... میں طبی کمیشن قائم کیا۔

☆ پاکستان ہی نہیں دنیا بھر میں ایک مہلک بیماری...... پر کنٹرول پا لیا گیا ہے۔

☆ سماجی بہبود کی قومی کونسل...... میں بنائی گئی۔

(ب) مختصر جواب دیں۔

☆ پاکستان میں میڈیکل کالجوں کی کل تعداد لکھیں۔

☆ ملتان میں قائم میڈیکل کالج کا نام کیا ہے؟

☆ خیبر میڈیکل کالج کس شہر میں قائم ہے۔

☆ لاہور شہر میں کتنے میڈیکل کالج قائم ہیں۔

☆ پانچ اہم بیماریوں کے نام لکھیں۔

☆ تین اہم رضاکارانہ اداکاروں کے نام لکھیے جو صحت عامہ کی بہتری کے لیے پاکستان میں کام کر رہے ہیں۔

(ج) خالی جگہیں پر کریں۔

☆ ولیج ایڈ پروگرام سنہ...... میں ترتیب دیا گیا۔

☆ پانچ نکاتی پروگرام کا آغاز...... کے دور حکومت میں ہوا۔

☆ پیپلز ورکس پروگرام کو...... کے دور حکومت میں شروع کیا گیا۔

☆ ایمپلائز سوشل سکیورٹی اسکیم کا نفاذ...... میں عمل میں لایا گیا۔

(د) خالی جگہیں پر کریں۔

☆ پاکستان میں خواندگی کی شرح...... فیصد ہے۔

☆ یونیسف (Unicef) کے قیام کا بنیاد مقصد...... کی فلاح ہے۔

☆ پاکستان میں شعبہ تعلیم پر کل قومی آمدن کا...... فیصد خرچ کیا جا رہا ہے۔

☆ علم حاصل کرنا ہر...... پر فرض ہے۔

☆ عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ...... ہے۔

باب ہفتم

پولیس نظم و ضبط اور ادارے

(ا) خالی جگہیں پر کریں۔

☆ برصغیر میں پہلا ایس پی کلکتہ میں .... میں مقرر کیا گیا۔

☆ پنجاب پر انگریزوں کا کنٹرول .... میں قائم ہوا۔

☆ پاکستان میں پولیس نظام .... کے ایکٹ کی رو سے قائم ہے۔

☆ ضلعی سطح پر پولیس کا اعلیٰ افسر .... کہلاتا ہے۔

☆ ضلع کی انتظامی مشینری کا سربراہ .... ہے۔

(ب) مختصر جواب دیں۔

☆ جنرل یحییٰ کے دور میں پولیس کمیشن بٹھایا گیا۔ کمیشن کا سربراہ کون تھا؟

☆ ذوالفقار علی بھٹو نے 1973ء میں کس کی سربراہی میں اصلاح احوال کے لیے کمیٹی ترتیب دی تھی۔

☆ کرائمز کنٹرول کمیٹیاں کس سال میں بنائی گئیں۔

☆ پولیس کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے 1985ء میں ایک کمیٹی کس کی سربراہی میں قائم کی گئی؟

ج) مختصر جواب دیں۔

☆ پولیس کے درج ذیل عہدوں کو ترتیب سے لکھیں۔

☆ اے ایس آئی، ڈی آئی جی، ہیڈ کانسٹیبل، اے آئی جی، انسپکٹر، ڈی ایس پی

☆ ایس ایچ او سے کیا بنتا ہے۔

☆ صوبے میں پولیس کے سربراہ کا عہدہ کیا ہے۔

☆ اے ایس پی (اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس) کا چناؤ کون سا ادارہ کرتا ہے۔

☆ پولیس ٹریننگ کالج کہاں واقع ہے؟

(د) خالی جگہیں پر کریں۔

☆ پنجاب میں تاحال .... جیلیں قائم ہیں۔

☆ نو عمر مجرموں کے لیے علیحدہ جیل .... میں بنائی گئی ہے۔

☆ نیا جیل مینوئیل .... میں تیار کیا گیا۔

☆ صوبائی سطح پر محکمہ جیل خانہ جات کا افسر اعلیٰ .... کہلاتا ہے۔

باب ہشتم

قومی دفاع اور اس کے ادارے

مختصر جواب دیں۔

1- کیڈٹ کالج پاکستان کے کن شہروں میں کام کر رہے ہیں؟

2- بری فوج کے سربراہ کا عہدہ کیا کہلاتا ہے؟

3- این سی سی سے کیا بنتا ہے؟

4- درج ذیل عہدوں کو ترتیب سے لکھیں۔

میجر - کرنل - کیپٹن - بریگیڈیر - لیفٹننٹ - لیفٹننٹ کرنل

5- انفنٹری سکول پاکستان کے کس شہر میں قائم ہے۔

6- کاکول (ایبٹ آباد) میں واقع فوج کا اہم تربیتی ادارہ کون سا ہے؟

7- سٹاف کالج برائے بری افواج کہاں کام کر رہا ہے۔

8- نیشنل ڈیفنس کالج کس شہر میں موجود ہے؟

9 پاکستان کی فضائی افواج میں درج ذیل عہدوں کی ترتیب کیا ہے؟

فلائنگ آفیسر، سکوارڈرن لیڈر، پائیلیٹ آفیسر، ونگ کمانڈر، ایئر وائس مارشل، گروپ کیپٹن

10- پاکستان فضائیہ میں کمیشن حاصل کرنے والے افسروں کی تربیتی اکادمی کہاں واقع ہے؟

11- پاکستان بحریہ میں کمیشن حاصل کرنے والے افسروں کی تربیتی اکادمی کہاں واقع ہے؟

12- پاکستان بحریہ کے درج ذیل عہدوں کو ترتیب سے لکھیں۔

کمانڈر، وائس ایڈمرل، کموڈور، کیپٹن، لیفٹننٹ کمانڈر، سب لیفٹننٹ

13- پاکستان بحریہ کے تین اہم تربیتی اداروں کے نام لکھیں۔

14- این ایل سی سے کیا بنتا ہے؟

15- پاکستان کی فضائیہ کا ہیڈکوارٹر کس شہر میں واقع ہے؟

16- پاکستان کی بری افواج کا ہیڈکوارٹر کہاں بنایا گیا ہے؟

باب نہم

قومی یکجہتی

(ا) خالی جگہیں پر کریں۔

☆ فرد قائم ربطہ ملت سے ہے.......

☆ جمہوریت کا فروغ قومی یکجہتی کے لیے ضروری.......

☆ جمہوری اداروں کی نشو و نما.......کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے۔

☆ پاکستانی قوم اپنی نظریاتی اساس سے دور ہٹی تو پاکستان.......میں دو ٹکڑے ہو گیا۔

☆ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم قومی یکجہتی کے لیے.......ثابت ہوئی۔

☆ لسانی اور فرقہ وارانہ تنظیمیں.......کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

(ب) مختصر جواب دیں۔

1- پاکستان میں عام انتخابات آخری بار کب ہوئے؟

2- پاکستان میں 1956ء کے دستور کو کب توڑا گیا؟

3- پورے پاکستان میں مارشل لا کا نفاذ پہلی بار کب ہوا؟

4- قومی یکجہتی کی راہ میں چار اہم رکاوٹوں کے نام لکھیں۔

5- سابقہ مشرقی پاکستان میں لسانی بنیادوں پر پہلی تحریک کب شروع ہوئی؟

6- متحدہ پاکستان کے وزرائے اعظم میں سے تین کے نام لکھیں جن کا تعلق سابقہ مشرقی پاکستان سے تھا۔

7- مولوی تمیز الدین کون تھے؟

8- کیا دوسری دستور ساز اسمبلی کو 1954ء میں عوام نے براہ راست منتخب کیا تھا؟

9- وحدت مغربی پاکستان کس سال عمل میں لائی گئی؟

10- چار ایسے ممالک کے نام لکھیں جہاں قومی یکجہتی کا فقدان نظر آ رہا ہے۔

باب دہم

پاکستان کے خارجہ تعلقات

(ا) خالی جگہیں پر کریں

1- بھارت کی خفیہ ایجنسی ...... دہشت گردی پھیلانے میں مصروف رہی ہے-

2- بنڈونگ کانفرنس ...... میں منعقد ہوئی-

3- شاہراہ قراقرم ...... کلومیٹر لمبی ہے-

4- مصر براعظم ...... میں واقع ہے-

5- سابق سوویت یونین نے ...... میں اپنی افواج افغانستان میں داخل کر دیں-

6- معاہدہ تاشقند طے پایا تو سابق سوویت یونین کا وزیراعظم ...... تھا-

(ب) مختصر جواب دیں-

1- پاکستان کے ہمسایہ ممالک کے نام لکھیں؟

2- معاہدہ تاشقند کس سال طے پایا؟

3- شملہ معاہدہ کس سال طے پایا؟

4- بھارت نے ایٹمی دھماکہ کب کیا؟

5- بنڈونگ کانفرنس 1955ء میں پاکستان کی نمائندگی کس وزیراعظم نے کی؟

6- چین کی مدد سے ہیوی مکینیکل کمپلیکس کس جگہ تعمیر کیا گیا ہے؟

7- سئٹو کے رکن ممالک کے نام لکھیں؟

8- سوویت یونین کس سال ٹکڑے ٹکڑے ہوا؟

9- V2 طیارہ کس سال سوویت یونین پر پرواز کے دوران گرا لیا گیا-

10- براعظم افریقہ کے چار مسلم ممالک کے نام لکھیں-

11- وسطی ایشیائی آزاد مسلم ریاستوں کے نام لکھیں-

12- عراق نے معاہدہ بغداد سے کس سال میں علیحدگی اختیار کی-

13- معاہدہ بغداد کے خاتمہ کے بعد اس کی جگہ کون سا نیا معاہدہ تحریر کیا گیا؟

14- معاہدہ استنبول کس سال طے پایا؟

15- اسلامی سربراہی کانفرنس کے کل کتنے اجلاس منعقد ہو چکے ہیں؟

16- تاحال اسلامی سربراہی کانفرنس کب اور کہاں منعقد کی گئی؟

17- اقوام متحدہ کی تین ایجنسیوں کے نام لکھیں۔

18- یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو کب آگ لگائی؟

19- اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں کتنے ممالک کے نمائندے شریک ہوئے؟

(ج) صحیح اور غلط میں تمیز کریں۔

1- پاکستان کو اقوام متحدہ کے بانی ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ صحیح/غلط

2- مراکش کا دارالحکومت ہے۔ قاہرہ/رباط

3- تیسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔ لاہور/مکہ/رباط

4- مصراور اسرائیل کے مابین کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ طے پایا۔ صحیح/غلط

5- اقتصادی تعاون کی تنظیم کے رکن ممالک کی تعداد۔ 10/7/3

6- 1947ء میں ریاست جموں و کشمیر کی مسلم آبادی۔ 70 فیصد/77 فیصد

7- معاہدہ تاشقند پر بھارت کی جانب سے دستخط کرنے والی شخصیت۔

اندرا گاندھی/ساشتری

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور

منظور کردہ : وفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد

بحیثیت واحد نصابی کتاب برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز

فرمانِ قائدِ اعظم

آپ کی توجہ صرف حصولِ علم کے لیے وقف رہے، صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم، طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

(نوجوانوں سے خطاب)

سیریل نمبر

253

تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد	قیمت
جون 1998	اول	دوم	3000	24-30